پیش گوئیاں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

PREDICTIONS پیش گوئیاں
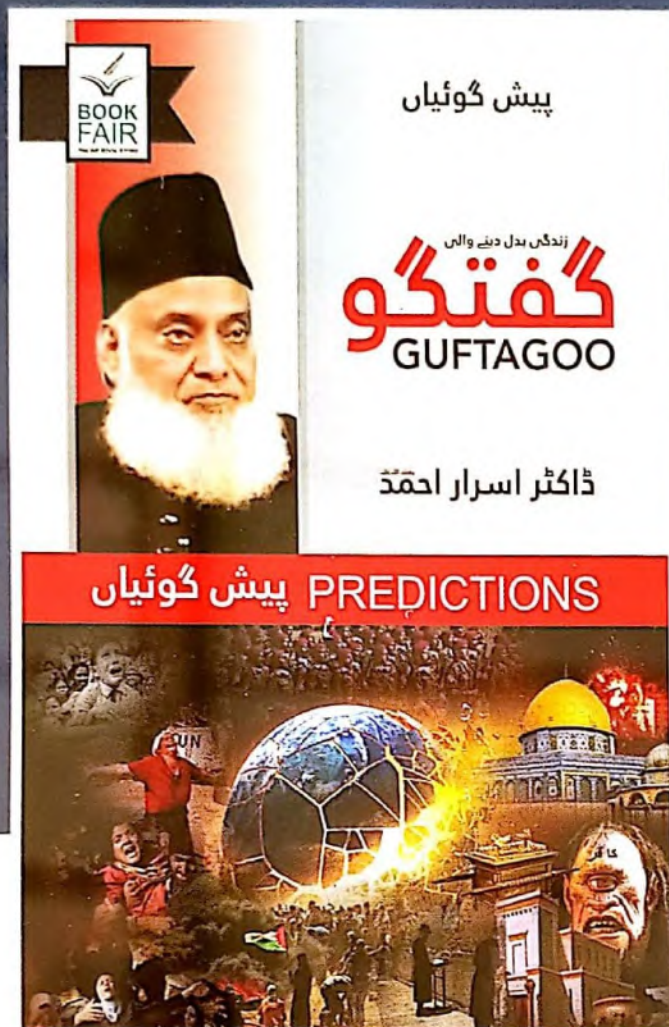
پیش گوئیاں

زندگی بدل دینے والی

گفتگو

GUFTAGOO

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

PREDICTIONS پیش گوئیاں

پیش گوئیاں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر: سید حذیفہ ... ہاشمی

اہتمام: معاذ ہاشمی

نام کتاب: گفتگو GUFTAGOO - پیش گوئیاں
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آرٹ ڈائریکٹر: خواجہ افضل کمال

ڈیزائن اینڈ لے آؤٹ: آرٹ ورکس انٹرنیشنل

سن اشاعت: 2021ء

قیمت: 995/- روپے
ڈالر 25$
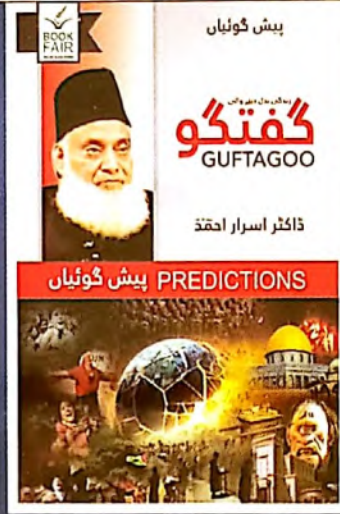
ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید، احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً، غلطی کرنے کا تصور نہیں کرسکتا۔ سہواً جو اغلاط ہو گئی ہوں ان کی تصحیح واصلاح کا انتہائی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہی ہے۔ اگر اس اہتمام کے باوجود بھی کسی غلطی پر آپ مطلع ہوں تو اسی گزارش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں فوری مطلع فرمائیں۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے اور آپ تَعاوَنُوْعَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے مصداق بن جائیں۔ والسلام

مفتی عاصم زبیر ہاشمی
محکمہ جیل خانہ جات حکومت پنجاب

حافظ خالد محمود خضر
مکتبہ خدام القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور

ہمارا ماضی

ہمارا مستقبل

PREDICTIONS
پیش گوئیاں

PREDICTIONS
پیش گوئیاں

PREDICTIONS
پیش گوئیاں

PREDICTIONS
پیش گوئیاں

حُسنِ ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

انسان جتنی دلچسپی اپنے ماضی اور اپنے حال میں رکھتا ہے، اس سے کہیں زیادہ دلچسپی اپنے مستقبل میں رکھتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ آئندہ وقت ہمارے لئے کیا لانے والا ہے۔ اس کوشش میں ہم کبھی نجومیوں کے پاس جاتے ہیں، کبھی علم الاعداد کے ماہرین سے رابطہ کرتے ہیں، کبھی رمل اور جفر کی بساط بچھاتے ہیں اور کبھی دست شناسوں کے سامنے ہاتھ دراز کر دیتے ہیں۔ ان سب کوششوں کے نتیجے میں ہمارے علم میں صرف اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ مستقبل کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہم کیا، کوئی کچھ نہیں جانتا۔ صرف خدائے بزرگ و برتر کو معلوم ہے کہ کیا ہو چکا ہے، کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہونے والا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے اس علم میں سوائے اپنے خاص بندوں کے کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اپنی منشاء کے مطابق، وہ یہ اسرار اپنے خاص بندوں، خاص کر اپنے نبیوں اور رسولوں پر کھول دیتا ہے۔ ان کی بدولت ہمیں آنے والے وقت کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور اس علم کا سب سے بڑا حصہ ہمارے رسولِ اکرم، سرورِ کائنات، خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو عطا کیا گیا۔

رسولِ پاک ﷺ نے ہمیں آنے والے واقعات کے بارے میں محض اشارے ہی نہیں دیئے بلکہ بعض واقعات صریح انداز میں بیان کر دیئے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے زمانے کے آنے والے واقعات کی خبر بھی دی، اور اس وقت کی خبریں بھی دیں جو ابھی آنے والا ہے، اور جیسا انہوں نے کہا تھا، دنیا نے ویسا ہی ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا اور آئندہ ضرور بالضرور دیکھ لے گی۔

انہوں نے بتا دیا تھا کہ رومی ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے اور ایرانیوں کی سلطنت اس طرح ختم ہو گی کہ اس کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اسی زمانے میں لوگوں نے ایسا ہوتا دیکھ لیا۔ آپ ﷺ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کی خبر دے دی، اور لوگوں نے ایسا ہوتا دیکھ لیا۔ آپ نے کسریٰ کے کنگن سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں پہنائے جانے کی خبر دی اور لوگوں نے ایسا ہوتا دیکھ لیا۔ پھر آپ نے ہزاروں سال بعد کے زمانے کی خبریں دیں، ان میں سے بہت سوں کا ظہور بعینہٖ اسی انداز میں ہو چکا ہے، اور بقیہ کا ظہور ہو کر رہے گا کیونکہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے حق کے سوا کبھی اور کچھ نہیں نکلا۔

ہمارا ماضی کیا ہے، ہم جانتے ہیں۔ ہمارا حال کیا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، اس کے حوالے سے ہمیں احادیث نبوی ﷺ میں بہت کچھ بتا دیا گیا، اور بہت کچھ ایسا ہے جو اللہ کے خاص بندے اللہ کے دیئے ہوئے نور کی روشنی سے دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا شمار بھی اللہ کے ایسے خاص بندوں میں کیا جا سکتا ہے۔ گو انہوں نے کبھی مستقبل بینی کا دعویٰ نہیں کیا مگر اللہ نے انہیں فراست کا نور بخشا تھا، قرآن کا علم بخشا تھا اور علم حدیث پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے ان اوصاف کی بدولت انہوں نے امت مسلمہ اور ملک خداداد پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مختلف مواقع پر بہت سی باتیں کہیں، اور قرآن وحدیث سے استنباط کرتے ہوئے بہت سے نتائج اخذ کئے۔ اس مجموعے میں ہم نے اس حوالے سے ان کی گفتگو کو ایک جگہ محفوظ کر دیا ہے۔

ایک ڈاکٹر جب کسی مرض کی تشخیص کرتا ہے تو پہلے مریض کی ''طبی تاریخ'' بھی دیکھتا ہے، پھر اس کے حال کو ملاحظہ کرتا ہے، اور پھر یہ رائے دیتا ہے کہ آگے چل کر یہ مرض کیا صورت اختیار کر سکتا ہے، اور اس کے بد اثرات سے بچنے کے لئے مریض کو کون سی ادویہ لینا ہوں گی، اور کس کس پرہیز پر کار بند رہنا ہوگا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب رحمہ اللہ بھی محض قرآن وحدیث میں دی گئی پیش گوئیاں بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں مریض یعنی امت مسلمہ کا ماضی بھی بیان کرتے ہیں، ان کے حال پر بھی نگاہ دوڑاتے ہیں، ان کے مستقبل کا پتہ بھی دیتے ہیں اور ایک اچھے طبیب کی طرح اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔

ہماری اس کاوش کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے رشحاتِ فکر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا اور قرآن و حدیث کے نور کو عام کرنے کے کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ اس میں ہم کس قدر کامیاب رہے، اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ اگر اس کوشش میں ہم سے کہیں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو از راہِ کرم اس کی نشاندہی فرما کر شکریہ اور اصلاح کا موقع دیں۔

والسلام

حذیفہ ہاشمی

0312-0432258

ہمارا حال

22 جنوری 1993ء کو نیو جرسی سٹیٹ کے صنعتی شہر ٹرینٹن میں خطابِ جمعہ کے لیے ذہن تانا بانا بُنے میں مصروف تھا کہ اچانک بجلی کوندنے کے سے انداز میں یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ ہم سورۃ البقرہ کی آیت 61 میں وارد شدہ الفاظ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (اُن پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی' اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!) کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں اس لیے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں' لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اِس وقت اِن الفاظِ قرآنی کے مصداقِ کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! (واضح رہے کہ ذرا سی تقدیم و تاخیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیت 112 میں بھی وارد ہوا ہے)۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس امر پر مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کی عملی تفسیر یہود ہیں اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ کے مصداق نصاریٰ ہیں' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ مؤخر الذکر یعنی عیسائیوں کا گمراہ ہونا یقیناً اب بھی صدفی صد درست ہے' لیکن ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کی عملی تفسیر تو اس وقت یہود نہیں' مسلمان ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ یہودی اِس وقت پوری دنیا میں کل چودہ ملین یعنی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ ہیں' جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں تقریباً سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اِس وقت کرۂ ارضی کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے' اس لیے کہ وہ علامہ اقبال کے قول ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' کے مصداق وقت کی ''واحد سپریم پاور'' یعنی ریاست ہائے امریکہ کی سیاست' معیشت اور ثقافت' سب پر پوری طرح قابض اور قابو یافتہ ہیں' اور امریکہ کا صدر ہو یا سینٹ' اور کانگریس ہو یا پینٹا گون' سب ان کے اثر و رسوخ اور بالخصوص ذرائع ابلاغ پر ان کے کنٹرول کے آگے بے بس ہیں۔ دوسری طرف سونے چاندی کی بجائے کاغذی کرنسی کے رواج اور بینک انشورنس اور اسٹاک ایکسچینج کے شیطانی جال پر تسلط کے ذریعے اِس وقت دنیا کی دولت کے بڑے حصے پر یہود کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان میں سے بیسیوں افراد ایسے موجود ہیں جو کئی کئی بلین ڈالر کا ایک ایک چیک جاری کر سکتے ہیں تو دوسری جانب عالمی اقتصادیات کا لیور یا ہینڈل ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مالی بحران پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ (سوویت یونین کا یہ حشر تو سامنے کی بات ہے ہی' جیسے ہی صیہونیوں نے محسوس کیا کہ امریکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے' وہ آنا فانا

یہی معاملہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں' اور غالباً وہ وقت اب زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم!)

یہود کا یہ سیاسی اور معاشی اثر و نفوذ تو ذرا پس پردہ اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے' لیکن اُمت مسلمہ سے تقابل کے اعتبار سے یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہی ہے کہ عالم اسلام' خصوصاً عالم عرب کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بالفعل پیوست ہے۔ (واضح رہے کہ دریائے اردن کے مغربی کنارے' گولان کی سطح مرتفع اور غزہ کی پٹی سے قطع نظر' جس پر 1967ء کی جنگ میں اسرائیل قابض ہوا' 1948ء میں جو ابتدائی اسرائیل وجود میں آیا تھا اس کی صورت واقعتاً بالکل خنجر کی سی ہے!) اس پر مستزاد یہ کہ دیکھنے والی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ''وسیع تر اسرائیل'' بھی بالقوہ وجود میں آ چکا ہے' اس لیے کہ دنیائے اسلام بالخصوص عالم عرب میں کوئی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو اِس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو سکے! (یہ بالکل دوسری بات ہے کہ صہیونیوں کی اپنی حکمت عملی ابھی اپنے آخری اقدام کے ضمن میں قدرے تاخیر کی متقاضی ہو!)

اس کے بالکل برعکس صورت حال مسلمانوں کی ہے کہ تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی'' کے مصداق بین الاقوامی سطح پر ان کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ سارے عالمی معاملات G-7 یا زیادہ سے زیادہ G-15 طے کرتے ہیں' اور بین الاقوامی مسائل میں سارے اقدامات کا فیصلہ یو این او اور اس کی سیکیورٹی کونسل کے پردے میں صرف امریکہ اور اس کے چند حواری (بالخصوص انگلستان اور فرانس) کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی شان و شوکت کی حامل حکومتوں کے جملہ معاملات بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں' ہماری داخلی اور خارجی حکمت عملی کہیں اور بنتی ہے' یہاں تک کہ ملکی بجٹ اور ٹیکسوں کے ضمن میں ''ہدایات'' باہر سے آتی ہیں۔ مزید برآں ہمارے وسائل پر بالفعل اغیار کا قبضہ ہے اور ہمارے دولت مند ترین ملکوں کی تمام تر دولت بھی اصلاً غیروں کے دست اختیار میں ہے کہ اگر ذرا ان کی مرضی کے خلاف ادنیٰ جنبش بھی کریں تو چشم زدن میں ان کی کل دولت اور سرمایہ ''منجمد'' کر کے گویا صفر بنا کر رکھ دیں۔ الغرض ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمد و ابوداؤد عن ثوبانؓ) میں کھینچا تھا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔''

ان ''لطیف'' حقائق پر مستزاد یہ تلخ واقعات تو نگاہوں کے عین سامنے موجود ہیں کہ مغرب ہو یا مشرق' اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ چنانچہ مشرق میں بھارت اور کشمیر اور مغرب میں بوسنیا ہرزیگووینا تو بالفعل ''ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو'' کا نقشہ پیش کر رہے ہیں' باقی عالمِ اسلام بھی یا تو افغانستان اور تاجکستان کی طرح خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا ہے یا سورۃ النحل کی آیت 112 میں

واردشدہ الفاظ ﴿لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ کے مطابق بھوک اور خوف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے اور جہاں بظاہر ان دونوں میں سے کوئی صورت موجود نہیں ہے بلکہ دولت کی ریل پیل اور عمارتوں کی شان وشوکت یورپ ہی نہیں امریکہ کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے وہاں بھی ''ذلت و مسکنت'' کی یہ صورت بتمام وکمال موجود ہے کہ بین الاقوامی سطح پر نہ عزت ہے نہ وقار اور خود داخلی سطح پر بھی حقیقی آزادی حاصل ہے نہ واقعی اختیار۔ چنانچہ ایک جانب ''ذلت'' کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کے اخبارات وجرائد میں ان دولت مند ترین مسلمانوں کا تذکرہ بالعموم تمسخر اور استہزاء کے ساتھ ہوتا ہے تو دوسری جانب ''مسکنت'' اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بھارت میں بابری مسجد کے گرائے جانے پر پچاس سے زائد نام نہاد مسلمان حکومتوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بھارت کی حکومت سے یہ ہی کہہ سکتی کہ اگر مسجد فی الفور دوبارہ تعمیر نہ کی گئی تو ہم سفارتی یا اس سے بھی کم تر درجہ میں تجارتی تعلقات منقطع کرلیں گے۔ گویا عزت و وقار کے ساتھ ساتھ غیرتِ ملی کا جنازہ بھی نکل چکا ہے اور سوا ارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے'' کا نقشہ پیش کر رہی ہے' تو سوچئے کہ الفاظِ قرآنی ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ یعنی ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کردی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے'' کے مصداق اس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں یا یہود؟

آگے بڑھنے سے قبل اس خیال کے تحت کہ مبادا مایوسی اور بددلی کے سائے زیادہ گہرے ہو جائیں' اور مبادا کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کے بیان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے' یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال مستقل نہیں عارضی ہے' اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور اُمتوں کے عروج و زوال کے جو اصول اور عذابِ الٰہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربِ قیامت کے جو حالات و واقعات اور یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں' ان کے مطابق یہود پر بہت جلد ''عذابِ استیصال'' یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا عذاب نازل ہوگا (اس اصطلاح کی وضاحت بعد میں ہوگی)' اور وہ ''عظیم تر اسرائیل'' (The Greater Israel) جس کے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں' اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی ان کا عظیم تر اجتماعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا۔ گویا موجودہ نیو ورلڈ آرڈر' جو درحقیقت جیو ورلڈ آرڈر (یعنی یہودیوں کی بالادستی کا عالمی نظام) ہے' بالآخر اسلام کے ''جسٹ ورلڈ آرڈر'' (Just World Order) یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کے عدل و قسط پر مبنی عالمی نظام میں تبدیل ہو کر رہے گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت اُن تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

لہٰذا ہم الصادق والمصدوق ﷺ کے فرمودات پر یقین کی بنا پر ایک جانب موجودہ عالمی نظام کے سربراہوں' یعنی یہود اور نصاریٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ:

اور بھی دَورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

اور دوسری جانب معروضی حالات کے مطالعے اور مشاہدے کے باعث جب اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا محسوس ہو اور مایوسی کے سائے زیادہ گہرے ہونے لگیں تو:

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

اور:

نہ ہو نومید' نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں!

کے مصداق ''دامانِ خیالِ یار'' کی طرح دامن امید پر اپنی گرفت از سر نو مضبوط کر سکتے ہیں، لیکن علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیعَاد دار!

اس آخری اُمید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بنا پر لازم ہے کہ ہم اُن سوالات

کے جواب قرآن کے فلسفہ وحکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اِس وقت:

''ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!''

کے مصداقِ کامل ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اس کا کیا سبب ہے کہ:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

اس لیے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہم خواہ اَفعال و اَعمال اور اَخلاق و کردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں' بہر حال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سیّد المرسلین ﷺ کے اُمتی ہیں اور ''توحید کی امانت'' کے حامل اور ع ''ہر کہ عشق مصطفیٰ ﷺ سامانِ اوست'' کے کسی نہ کسی درجے میں مدعی ہیں' جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوامِ عالم کھلم کھلا کافر و مشرک اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی صاف منکر و مخالف ہیں' اور قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ ''اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

ان سوالات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں سنجیدگی سے غور اِن اسباب کی بنا پر لازمی ہے کہ:

(1) جیسے قرآنِ مجید میں بار بار نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا کہ ''لوگو! جس بات کی تمہیں خبر دی جارہی ہے یا جس عذاب کی وعید سنائی جارہی ہے' مَیں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا ابھی کچھ دور ہے''۔ (جیسے مثلاً سورۃ الانبیاء کی آیت 109 میں اور سورۃ الجن کی آیت 25 میں) اسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ عذابِ استیصال کے ذریعے یہود کے خاتمے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کا ''انقلابِ عظیم'' قریب آ چکا ہے یا ابھی کچھ دیر تک موجودہ صورت ہی برقرار رہے گی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا'' کے مصداق ابھی موجودہ صورتِ حال مزید گمبھیر ہوگی اور اُمت مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے مزید اور شدید تر کوڑے برسیں گے' لہٰذا ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفۂ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے' تا کہ سورۃ الشوریٰ کی آیت 30 ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ ''اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے' اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تو درگزر بھی کرتا رہتا ہے!'' کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات و کیفیات ع ''اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!'' کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بد اعمالی کا نتیجہ ہیں، تا کہ نہ ہم ﴿الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ (الفتح : 6) یعنی اللہ سے بدظنی کرنے والوں کے زمرے میں شامل ہوں' نہ ہمارے دلوں میں اللہ سے کوئی شکوہ شکایت پیدا ہو' بلکہ اپنی خطاؤں کے اعتراف کے ساتھ حقیقی پشیمانی اور خشوع و خضوع اور

تضرع و اخبات کی کیفیات پیدا ہوں جو توبہ کی لازمی شرائط ہیں!

(2) جیسے ہر جسمانی عارضے کے صحیح علاج کے لیے مرض کی صحیح تشخیص لازمی ہے‘ اسی طرح ضروری ہے کہ امت کی موجودہ زبوں حالی کے اصل اسباب کا صحیح تعین کیا جائے‘ تاکہ ہماری قوتیں اور توانائیاں اور وقت کی قیمتی متاع سطحی قسم کی تدابیر میں ضائع نہ ہو جائیں‘ بلکہ ہم صورتِ حال کی سنگینی کے صحیح ادراک اور امت کے مزمن اور پیچیدہ امراض کے گہرے اسباب و عوامل کا صحیح شعور حاصل کر کے ان کے مداوا اور معالجہ کے لیے صحیح اور مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں‘ اور اس تلخ حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ اس وقت ہم بحیثیت اُمت عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہیں‘ اس سے رستگاری کے حصول اور اللہ کے عفو و مغفرت کے دامن میں آنے کے لیے صحیح طریق کار پر عمل پیرا ہو سکیں۔

قرآن کا قانونِ عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اِذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے اُن اٹل قوانین اور قواعد و ضوابط یعنی قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس ''سُنّت'' کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت 62 میں کہ:

﴿وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۝﴾

''اور تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سُنّت میں کوئی تبدیلی!''

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ فاطر کی آیت 43 اور سورۃ الفتح کی آیت 23 میں بھی وارد ہوا ہے۔ لہٰذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اُس کی اٹل اور مستقل سُنّت کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانونِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں‘ اس لیے کہ اسی پر اصلاحِ احوال کی صحیح اور مؤثر تدابیر کے فہم و شعور کا انحصار اور دارومدار ہے۔

قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا ''قانونِ عذاب'' بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر اِن سب کو جمع اور مرتب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(1) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالعذاب نہیں دارالامتحان ہے‘ اور جزا و سزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیاتِ انسانی میں سے جو علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

اتنی طویل ہے کہ دِنوں، مہینوں اور سالوں کیا صدیوں میں بھی نہیں ناپی جا سکتی، موت کا ایک وقفہ ڈال کر:

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!

جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ "حیاتِ دُنیوی" کی صورت میں علیحدہ کر لیا گیا ہے، اس کی اصل غرض و غایت آزمائش اور امتحان و ابتلاء ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت 2 میں کہ:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾

"اس نے بنائی موت اور زندگی تا کہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا۔"

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ:

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا، جہاں اگرچہ اس غرض کے لیے تو قوموں اور اُمتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہو گی کہ اُن کی جانب مبعوث کیے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حُجت قائم کر سکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا، اب اپنے طرزِ عمل کے لیے تم خود جوابدہ ہو، تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہو گا۔ جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت 95 میں کہ:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝﴾

"اور ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہو گا فرداً فرداً (یعنی اکیلا اکیلا)۔"

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دُنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں، عذاب یا سزا کے طور پر نہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء، جو بعض احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لیے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنا دے، تا کہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدۂ کلیہ ختم نہیں ہوتا۔

(2) البتہ اس قاعدۂ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بداعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے

دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور قوموں اور اُمتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے' یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت 25 میں کہ:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

''اور ڈرو اُس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہوگا' اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی اُمید دلائی ہے' یعنی یہ کہ کسی قوم یا اُمت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں' بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں' جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

﴿اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ (آیت 165)

''ہم نے بچالیا اُن لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے۔''

(3) قوموں اور اُمتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعی بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھ کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود اُن کی قوموں نے بحیثیت مجموعی اُن کی دعوت کو ردّ کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو اُن پر ''عذابِ استیصال'' نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور ان معدودے چند لوگوں کو بچا کر جو ان پر ایمان لائے' باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی' یعنی انہیں نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قومِ نوح علیہ السلام' قومِ صالح علیہ السلام' قومِ لوط علیہ السلام' قومِ شعیب علیہ السلام اور آلِ فرعون پر نازل ہوئے' جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھود: 68 اور 95) ''وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!'' کہیں فرمایا گیا کہ: ﴿لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف: 25) ''ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا''۔ یعنی ان کے

مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ (الانعام:45)
''پس ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی''۔

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمامِ حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (15)
''اور ہم عذاب بھیجنے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں۔''

اور سورۃ القصص کی آیت 59 میں بھی یہی قاعدۂ کلیہ بیان ہوا کہ:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا﴾
''اور آپ کے رب کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے جب تک ان کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے۔''

اس عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سُنّت بھی قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا' تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ اسی سُنّتِ الٰہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدہ کی آیت 21 میں:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝﴾
''اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل' شاید کہ یہ رجوع کر لیں۔''

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات 41 تا 45 اور سورۃ الاعراف کی آیات 94 تا 96 میں!

(4) قوموں اور اُمتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذابِ الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی اُمتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذاب استیصال سے اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قوموں یا اُمتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا' لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان اُمت اس نوع کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان کیا جائے تو وہ اس جہنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ کا مصداق ہو جاتا ہے' یعنی ''نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے نہ اسے موت آتی ہے۔'' اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ع

''زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا!''

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحب کتاب و شریعت رسول کی اُمت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعوے دار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرزِ عمل اور رویہ اس کے دعویٰ کے برعکس ہو اور وہ اپنے انفرادی اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار اور اپنی اجتماعی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتابِ الٰہی کی تعلیمات اور شریعت خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابل معافی ہے' اس لیے کہ اپنے اس طرزِ عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان اُمت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (اُمتِ وسط) اور رابطے کا ذریعہ بنے' الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے' اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف کی آیات 2 اور 3 میں فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرزِ عمل کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اُترو' اللہ کے غضب کو بہت بھڑکانے والا ہے!''

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا اُمتوں کا ایک وصفِ مشترک' جسے قسمت کی ظریفی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے' بلکہ ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذابِ الٰہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے' گویا صورت یہ بن جاتی ہے کہ اِدھر دُرّے پر دُرّہ پڑتا جاتا ہے اور اُدھر غرہ پر غرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدہ کی آیت 18 میں نقل ہوا ہے کہ:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾

''ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں' اور اُس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے۔''

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ﴾

''(اے نبی ﷺ)! ان سے کہیے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ بلکہ (اپنے اس زعم کے برعکس) تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ

نے پیدا فرمائے!"

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (البقرۃ:80)

"ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے۔"

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا:

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:80)

"(اے نبی ﷺ! ان سے پوچھیے) کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے (جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے) کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب (غلط باتیں) منسوب کر رہے ہو؟"

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدۂ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ "جن کے رُتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!" کے مطابق کسی اُمت کو جس قدر بلند درجۂ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرزِ عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود ہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے' یعنی ان پر عذابِ الٰہی کی شدت کے بیان کے لیے جو الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت 61 میں وارد ہوئے ہیں کہ:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط﴾

"ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیت مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

﴿يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (البقرۃ:47)

"اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات و احسانات کو جو میں نے تم پر کیے' اور مَیں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی۔"

پھر یہی معاملہ کسی مسلمان اُمت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے' اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے۔

(5) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی اُمت ہونے کی مدعی

ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اُس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دُنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 20 ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ﴾ اور سورۃ الاحقاف کی آیت 20 ﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ کے مطابق اللہ کی عطا اور جود و سخا کے دسترخوان سے کھا پی سکتے ہیں' اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے' پھر جوان ہوتا ہے' پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے' ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی اَدوار سے گزر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اُخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فردِ نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔

(سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اُس کے عذاب وثواب اور جزا وسزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دُنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 20 ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۤءِ وَهٰٓؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَاۤءِ رَبِّكَ﴾ اور سورۃ الاحقاف کی آیت 20 ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ کے مطابق اللہ کی عطا اور جود وسخا کے دسترخوان سے کھا پی سکتے ہیں' اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے' پھر جوان ہوتا ہے' پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے' ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی اَدوار سے گزر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اُخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فردِ نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات وعقائد اور اخلاق واعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔

(سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

موجودہ عالمی حالات کی تین اہم سطحیں

موضوع کے حوالے سے ہمیں سب سے پہلے یہ معین کرنا ہے کہ موجودہ عالمی حالات کیا ہیں! کوئی بھی شخص جب عالمی حالات کے بارے میں سوچتا ہے، کچھ غور کرتا ہے اور مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ نہ کچھ نقشہ ضرور بنتا ہے کہ آج کل عالمی سطح پر کیا حالات ہیں۔ اس حوالے سے جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اسے میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میرے نزدیک اس کی تین سطحیں ہیں۔

پہلی سطح: امریکہ سول سپریم پاور آف ارتھ

پہلی سطح جو سب سے نمایاں ہے اور اکثر لوگوں کے علم میں بھی ہے، اس کے بارے میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم موضوع کے اعتبار سے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا یک قطبی عالم (Unipolar World) بن چکی ہے اور یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کو اِس وقت روئے ارضی کی واحد سپریم طاقت (Sole Supreme Power on Earth) کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی حربی طاقت کا کوئی اندازہ ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ہر موقع پر ایک نیا ہتھیار نکال کر لاتا ہے۔ اس کے ہاں ریسرچ مسلسل جاری ہے۔ افغانستان میں جب روسیوں کے خلاف جہاد ہو رہا تھا تو دنیا نے سٹنگر میزائل پہلی مرتبہ دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا، اس سے پہلے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دنیا میں ایسا میزائل بھی ہے جو سیدھے رخ پر جانے کے بجائے اپنے ہدف کا پیچھا کرتا ہے۔ پھر جب پہلی خلیجی جنگ ہوئی تو پیٹریاٹ (Patriot) میزائل آ گیا۔ اس سے پہلے اس کا کوئی تصور نہیں تھا کہ کسی حملہ آور میزائل کو فضا میں ہی تہس نہس کرنے والا میزائل ایجاد ہو چکا ہے۔ عراق کا سکڈ میزائل ہو یا کوئی اور میزائل جو ایٹمی ہتھیار لے کر آ رہا ہو، اسے یہ پیٹریاٹ میزائل فضا ہی میں تہس نہس کر سکتا ہے۔ پھر افغان امریکہ جنگ کے اندر بہت سی نئی نئی چیزیں سامنے آئیں۔ اب لیزر گائیڈڈ بم وجود میں آ گئے ہیں جو تیس پینتیس ہزار فٹ کی بلندی سے بھی ٹھیک نشانے پر جا کر لگتے ہیں۔ اس سے پہلے تو بمباری کے لیے بمبار جہاز کو نیچے آنا پڑتا تھا، اور ظاہر بات ہے جب جہاز نیچے آتا تھا تو اس کا امکان بہر حال موجود تھا کہ وہ اینٹی ایئر کرافٹ گن کا نشانہ بن جائے، جبکہ اب اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو یہ تقریباً پینتیس ہزار فٹ کی بلندی سے لیزر گائیڈڈ بم پھینک دیتا ہے اور وہ لیزر شعاعوں کی رہنمائی میں سیدھے نشانے پر جا کر لگتے ہیں۔ بہر حال یہ تو صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ اس کی حربی قوت کا کوئی اندازہ ممکن نہیں ہے۔

پھر اس میں تکبر اس درجے بڑھ چکا ہے کہ عدل و انصاف کے مسلّمہ اصولوں کی اسے نہ کوئی فکر ہے نہ لحاظ۔ اسے اب اپنے بہترین اتحادیوں کی رائے کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔ عراق کی جنگ کے خلاف امریکہ اور

یورپ کے اندر وسیع ترین سطح پر مظاہرے ہوئے لیکن اس نے انہیں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ یو این او ساتھ چلنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو اس کو بھی دھکا دیا کہ بیٹھے رہو' ہم سب کچھ تنہا کرنے پر قادر ہیں۔ اس نے نئے نئے اصول بنائے ہیں۔ مثلاً pre-emptive strike کا اصول بنایا ہے کہ اگر ہمیں کسی ملک کی طرف سے ذرا سا بھی اندیشہ ہو گیا کہ وہ ہمارے لیے مستقبل میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تو ہمیں حق حاصل ہے کہ اس پر حملہ کریں' ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی ملک کی طرف سے کوئی اقدام ہو اور پھر ہم حملہ کریں۔ امریکہ اپنی حربی قوت کے اعتبار سے ایک مست ہاتھی کے مانند ہے جس کا مقابلہ کرنے کی حیثیت کسی میں نہیں ہے' نہ یورپ میں' نہ جاپان میں۔ عالم اسلام کا تو ذکر ہی کیا ہے! اگرچہ اس کے ردّعمل کے طور پر دنیا کی دوسرے درجہ کی قوتیں علاقائی بنیادوں پر اتحاد قائم کر رہی ہیں کہ امریکہ کی قطعی بالادستی کو بیلنس کیا جا سکے، تاہم یہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں!

دوسری سطح: اللہ کی بغاوت پر مبنی عالمی نظام

دوسری حقیقت جو رفتہ رفتہ کئی صدیوں میں پروان چڑھ کر سامنے آئی ہے وہ ایک ''اجتماعی نظام'' ہے جس نے اِس وقت پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس اجتماعی نظام کی تین سطحیں ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ جیسے کسی شخص کو جب ملیریا بخار چڑھتا ہے تو اسے سردی اتنی لگتی ہے کہ وہ ایک لحاف کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا لحاف اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہے۔ تو اِس وقت درحقیقت تین لحاف ہیں جو دنیا نے اوڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو زمین کے نزدیک ترین ہے' یا یوں کہئے کہ جو پہلا لحاف ہے وہ ہے ''معاشرتی نظام''، اس کے اوپر ہے ''معاشی نظام'' اور سب سے اوپر ہے ''سیاسی نظام''۔

(i) سیاسی نظام

اب ان تینوں نظاموں کا جائزہ لیجیے۔ سب سے پہلے ''سیاسی نظام'' کو لیتے ہیں! پچھلی دو تین صدیوں کے اندر جو نظام پروان چڑھا' جو یورپ سے شروع ہوا اور پوری دنیا میں پھیل گیا اور آج پوری دنیا کے اندر اس کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور accepted fact کی ہے وہ ہے ''سیکولرازم''۔ اور سیکولرازم کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اجتماعی معاملات میں کسی مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں' مذہب صرف انفرادی معاملے کا نام ہے اور اس میں ہر انسان آزاد ہے۔ لیکن مذہب صرف تین چیزوں پر مشتمل ہے' کوئی چوتھی چیز اس میں شامل نہیں ہے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: (i) عقائد (Dogmas): سیکولرازم کی رو سے چاہے کوئی ایک خدا کو مانے' سو کو مانے یا کسی کو بھی نہ مانے' اسے آزادی حاصل ہے۔ (ii) عبادات کے معاملے میں بھی ہر شخص آزاد ہے' چاہے وہ ایک غیر مرئی (unseen) خدا کی عبادت کرے' یا پتھر کے بتوں کی پرستش کرے۔ وہ پیپل کے درخت کی پرستش کرے' سانپ کی پرستش کرے' سورج' چاند اور ستاروں کی پوجا کرے' یا انسان کے اعضائے تناسل کی پوجا

کرے' اسے کھلی آزادی ہے۔ اور جو بھی modes of worship اختیار کرنا چاہے اس کی اسے آزادی ہے۔
(iii) مذہب کا تیسرا حصہ سماجی رسومات (Social Customs) ہوتی ہیں۔ سیکولرازم میں اس کی بھی آزادی ہے کہ یہ رسومات اپنے مذہب کے مطابق ادا کرو۔ نکاح کے لیے چاہے ایجاب و قبول کی صورت اختیار کرو چاہے مندر میں جا کر پھیرے لگاؤ۔ اپنے مُردے کو چاہے دفن کرو اور چاہے نذرِ آتش کر دو۔ البتہ سیاسی نظام میں، قانون سازی کے عمل میں کسی مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ گویا انسان کی اجتماعی زندگی سے خدا کو نکال دیا گیا ہے کہ تم مسجد مندر سینیگاگ چرچ، جہاں چاہو رہو لیکن ہماری پارلیمنٹ اور ہمارے کاروباری اداروں سے تمہارا کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے سماجی نظام سے بھی تمہارا کوئی سروکار نہیں، یہ ہم خود بنائیں گے، ہمیں اس کا اختیار حاصل ہے، ہم خود حاکم ہیں، ہم عوامی حاکمیت کے اصول پر قانون سازی کریں گے، ہم انتخابات کرائیں گے، ان کے نتیجے میں جو بھی پارلیمنٹ کانگریس وغیرہ ہوگی وہ اکثریت کے ساتھ قانون بنائے گی۔ وہ چاہے شراب پینے کی اجازت دے چاہے اس پر پابندی لگا دے، اس کا اختیار ہے۔ لیکن یہ پابندی اس وجہ سے نہیں ہوگی کہ کسی مذہب میں اس پر پابندی ہے۔ وہ ہم جنسوں کی شادیوں کی اجازت دے تو اسے اختیار ہے، مرد کی مرد سے شادی اور عورت کی عورت سے شادی کے لئے وہ قانون بنا سکتے ہیں۔

گویا پورے سیاسی' اجتماعی نظام سے خدا کو بے دخل کر دیا گیا ہے کہ اس معاملے میں کسی آسمانی ہدایت کا کوئی سروکار نہیں' کسی خدائی قانون کا کوئی اعتبار نہیں' بس اس کی تلاوت کر لی جائے' اپنی اپنی مقدس کتابیں پڑھ لی جائیں' سکھ گروگرنتھ پڑھ لیں' مسلمان قرآن پڑھتے رہیں' ہندو وید' رامائن اور بھگوت گیتا پڑھتے رہیں۔ وہ بس اپنے مندروں کے اندر محدود رہیں۔ مسلمان اپنی مساجد کے اندر ماہِ رمضان میں تراویح کے دوران پورا قرآن پڑھ لیں' کوئی اعتراض نہیں' اس کا ان کو اختیار ہے' لیکن قرآن کی شریعت واجب التنفیذ نہیں ہوگی! تو یہ نظام ہے جو آج پوری دنیا کو پورے طور سے اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔

(ii) معاشی نظام

اس سے نیچے آیئے تو دوسرا لحاف موجود ہے اور وہ ہے معاشی نظام۔ اس وقت پوری دنیا میں معاشی نظام interest-based capitalism یعنی سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر قائم ہے' جس میں اصل طاقت' اصل حق سرمائے کو حاصل ہے' لیبر کو نہیں۔ اور سرمایہ از خود بھی بغیر کسی محنت کے کمائی کر سکتا ہے۔ جیسے آپ بینک میں روپیہ رکھ دیں اور سود لیتے رہیں' اس میں آپ کی محنت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ آپ خواہ ڈاکہ ڈال کر' غبن کر کے یا کسی اور طریقے سے ایک دفعہ بینک میں قدرے بھاری سی رقم رکھ دیں تو آپ کو ہر مہینے سود ملتا رہے گا اور آپ کھاتے رہیں' آپ کو محنت کی ضرورت نہیں' کسی بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں۔ پھر اس کی ایک اور چھوٹی بہن آئی اور وہ ہے جوا (speculation)' جبکہ ایک تیسری بہن آئی انشورنس کے نام سے۔ انشورنس بھی اصل میں

سرمایہ داری نظام کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ بالفرض آپ نے کارخانہ لگایا ہے' چاہے ماچس فیکٹری ہی کیوں نہ لگائی ہو' آپ کا اس میں دس کروڑ روپیہ لگ گیا ہے۔ اب اس ماچس فیکٹری کو زمینی و آسمانی آفات سے نقصان پہنچ سکتا ہے' مثلاً آگ لگ سکتی ہے یا سیلاب بہا کر لے جا سکتا ہے' تو اس صورت میں سرمایہ دار کا نقصان بھی ماچس کا صارف (consumer) ہی ادا کرے گا۔ یعنی مالکان اس فیکٹری کا بیمہ کرائیں گے اور انشورنس کے لیے انہیں ہر مہینے یا ہر سال جو رقم ادا کرنی پڑے گی وہ اسے اپنی ماچس کی لاگت میں ڈال دیں گے۔ لہٰذا صارف اس ماچس کی لاگت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کارخانے میں لگے ہوئے سرمائے کے مستقبل کی حفاظت بھی کر رہا ہے۔ تو یہ تین چیزیں مل کر ایک معاشی نظام بناتی ہیں۔

اس معاشی نظام کے خلاف کمیونزم کی شکل میں ایک بغاوت ہوئی تھی۔ کمیونزم میں سود ختم ہو گیا تھا' کیونکہ اس میں انفرادی ملکیت کا تصور ہی نہیں تھا۔ کمیونزم میں ہر چیز قوم کی ملکیت تھی۔ آپ کام کریں اور اجرت لیں' آپ کا کھانے کا بندوبست حکومت کے ذمہ ہے۔ لیکن اس سے آگے آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ کوئی جماعت بنائیں' کوئی ایجی ٹیشن کریں' اپنی اجرت بڑھانے کے لیے کوئی جدوجہد کریں' کچھ بھی نہیں۔ اس نظام میں چونکہ غیر فطری انتہا پسندی تھی اس لیے یہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکا۔ اب اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ صرف یہی ایک نظام تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کر رہا تھا۔ پچھلی صدی کے وسط میں یہ سیلاب کی طرح بڑھ رہا تھا اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام اپنے گھر کے اندر کانپ رہا تھا۔ یہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور آدھے سے زیادہ یورپ اس کے قبضے میں آ گیا تھا' یہاں تک کہ یہ سینٹرل امریکہ میں پہنچ گیا تھا۔ کیوبا میں تو آج تک موجود ہے۔ پھر سوویت یونین کے علاوہ چین میں پہنچ گیا تھا' ہندوستان میں پہنچ گیا تھا' بنگال اور کیرالہ میں اس کی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ سوویت یونین خلا کی تسخیر (conquest of the space) میں امریکہ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ لہٰذا امریکہ کانپ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں امریکہ نے کروڑوں کی تعداد میں مذہبی کتابیں شائع کیں۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ خدا کے لیے قرآن پڑھو' دیکھو یہ کمیونزم تمہاری کتاب کے خلاف ہے۔ محمد مارمیڈوک پکتھال نے "The Glorious Quran" کے نام سے قرآن مجید کا جو ترجمہ بہت پہلے کیا تھا' انہوں نے اس کے لاکھوں نسخے شائع کر کے مفت تقسیم کیے۔ ہندوؤں کو ترغیب دی گئی کہ بھگوت گیتا پڑھو' اپنشد پڑھو۔ مجھے اسی وقت اپنشد اور گیتا وغیرہ کے انگریزی ترجمے ملے تھے جن کا میں نے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا اس سے یہی مقصود تھا کہ یہ مذاہب کمیونزم کے راستے میں رکاوٹ بنیں۔ پھر اس کے لیے NATO' SEATO اور CENTO جیسے ادارے بنا دیے گئے تھے' تا کہ کمیونزم کا سیلاب کسی طریقے سے رک جائے' کیونکہ یہ ان کی معیشت کے لیے تباہ کن تھا۔

امریکہ اور روس کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی' اس کا مذہب سے سروکار ہی نہیں تھا۔ سوویت یونین نے

راہنما بھی عیسائی تھے اور مغربی یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی عیسائی تھے۔ مذہبی اختلاف تو کوئی تھا ہی نہیں۔ بس اتنا ہی اختلاف تھا جتنا مسلمانوں کے مختلف مسلکوں میں ہوتا ہے کہ کچھ کیتھولک ہیں' کچھ پروٹسٹنٹس ہیں' کچھ Orthodox Eastern ہیں' کچھ Orthodox Russian ہیں اور کچھ Orthodox Greek ہیں۔لیکن تھے تو وہ سب کرسچین ہی' سب کے سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے' سب کے سب بائبل پڑھتے تھے۔تو مذہب کی کوئی جنگ نہیں تھی۔ پوری نصف صدی تک جو سرد جنگ چلی ہے وہ ان دو معاشی نظاموں کے مابین تھی اور بالآخر چیلنج کرنے والا نظام بیٹھ گیا اور ختم ہو گیا۔اس کے بٹھانے میں مسلمان کا خون استعمال ہوا۔افغانستان میں جہاد کے نام پر صرف افغانوں نے نہیں بلکہ دور دراز کے ممالک سے آنے والے جانبازوں نے اپنا خون دیا' جانیں دیں' جبکہ امریکہ نے صرف پیسہ خرچ کیا' سٹنگر میزائل دیے' بڑی بڑی گاڑیاں دیں' ارب ہا ارب ڈالر دیے۔اور چونکہ وہ سب پاکستان کے ذریعے سے جارہا تھا تو ہمارے جرنیلوں کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔ ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیسز وہ اپنے گھر بھی لے جاتے تھے۔آج ان کے بیٹوں کی جو انڈسٹریز ہیں' وہ کہاں سے آ گئیں؟ یہ جرنیل تو کبھی سائیکل پر چلا کرتے تھے' ان کے پاس کار تک نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے' یہ دوسرا لحاف ہے۔ پوری دنیا میں سود کی بنیاد پر بینکنگ سسٹم رائج ہے۔

(iii) معاشرتی نظام

اب نیچے آیئے! تیسرا لحاف ہے سماجی نظام' یہ ابھی پوری طرح نوعِ انسانی پر حاوی نہیں ہوا' البتہ مغرب میں حاوی ہو چکا ہے۔ اس کا اصول ہے آزاد جنس پرستی اور مرد و زن کی مکمل مساوات۔ یعنی آپ جس طرح چاہیں اپنی جنسی خواہش کو پورا کریں' بس دونوں طرف سے رضا مندی ہونی چاہیے' جبر نہیں ہونا چاہیے۔ زنا بالجبر قانون کی خلاف ورزی شمار ہوتا ہے' لیکن زنا بالرضا سرے سے کوئی جرم نہیں۔ اس کے نتیجے میں فیملی سسٹم برباد ہو گیا' اولاد کو بھی والدین بلوغت کی قانونی عمر کے بعد گھر سے نکال دیتے ہیں' چاہے لڑکا ہو یا لڑکی' کہ خود جا کر کماؤ اور کھاؤ' ہم پر اگر کچھ ذمہ داری تھی تو بس ایک خاص عمر تک تھی۔ ظاہر بات ہے پھر اولاد کو بھی ماں باپ کی کیا فکر ہو گی؟ چنانچہ بڑھاپے میں ماں باپ کو Old Homes میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہاں پر کھانا پینا ملتا رہے گا' البتہ ہمیں دیکھنا نصیب نہیں ہو گا' زیادہ سے زیادہ کوشش کریں گے کہ کرسمس میں آ کر آپ کو اپنی شکل دکھا دیں' لیکن اکثر و بیشتر والدین کرسمس کے موقع پر بھی ترستے رہ جاتے ہیں اور انہیں اپنی شکل دکھانے کے لیے کوئی نہیں آتا۔ یہ ہے سماجی نظام' جس میں پردے کا سوال ہی کیا' شرم کا سوال ہی کیا' عزت و عصمت کا سوال ہی کیا! یہ سماجی نظام آج کم از کم آدھی انسانیت پر تو مسلط ہو چکا ہے۔ البتہ ابھی کچھ افریقہ اور زیادہ تر ایشیا میں یہ نظام کسی درجے میں سابقہ حالت میں برقرار ہے' اگرچہ ہر ملک کا ایلیٹ (Elite) طبقہ اس نظام کو اختیار کر

چکا ہے۔ یعنی اوپر کا طبقہ بے پردگی، فحاشی، عریانی، آزاد جنس پرستی اختیار کر چکا ہے۔ زیادہ تر طلاقیں اسی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جتنی شادیاں ہوتی ہیں ان میں اکثر جلد از جلد تحلیل ہو جاتی ہیں، طلاقیں ہو جاتی ہیں، خاندانی نظام چلتا ہی نہیں۔ یہ ہے تیسرا نظام۔

البتہ مشرقی ممالک میں ابھی شرم وحیا کا کچھ عنصر جو باقی ہے اور خاندانی نظام کسی حد تک برقرار ہے تو مغرب کی طرف سے ایک زبردست تحریک چل رہی ہے کہ اس کو بھی ختم کر دیا جائے، یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں، ان میں بھی لبرل ازم اور روشن خیالی آ جائے کہ اگر میری بیوی زنا کر رہی ہے تو کیا ہے! اس کی مرضی ہے۔ میری بیٹی آوارہ ہو گئی ہے تو مجھے کیا! وہ اپنے مستقبل کو خود خراب کر رہی ہے، اسے شادی کے لیے مرد نہیں مل سکے گا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ لبرل ازم ہے، روشن خیالی ہے، یہ عورتوں کی آزادی ہے۔ یہ کیا کہ خاندانی نظام میں بیوی، شوہر کے تابع ہو؟ وہ دونوں برابر ہیں! اور جب دونوں برابر ہیں تو ''مَیں بھی رانی تُو بھی رانی، کون بھرے گا پانی'' کے مصداق شادی کا بندھن، خاندانی بندشیں اور اخلاقی جواز کا معاملہ سب کچھ بے معنی ہے۔ چنانچہ آپ کے علم میں ہو گا کہ 1994ء میں قاہرہ میں بہبودِ آبادی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کا ایجنڈا یہی عورت کی آزادی تھا۔ پھر 1995ء میں بیجنگ کانفرنس ہوئی۔ ان کانفرنسوں کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا اور افریقہ میں اگر خاندانی نظام کا کچھ تقدس باقی ہے، کوئی شرم وحیا اور عفت وعصمت کے تصورات باقی ہیں، خاندانی نظام کا کوئی سٹرکچر باقی ہے تو اس کو ہدف بنا کر ختم کیا جائے۔

اس کے بعد جون 2000ء میں بیجنگ پلس فائیو کانفرنس یونائیٹڈ نیشنز کی جنرل اسمبلی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی اور اس میں جو فیصلے ہوئے ان میں پہلے نمبر پر یہ ہے کہ prostitution (طوائفانہ زندگی) کو بھی ایک قابلِ احترام پیشہ مانا جائے گا۔ اس کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک مزدور بھی تو کمائی کے لیے اپنی قوتِ بازو کو استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ کسی چلا رہا ہے، اینٹیں ڈھو رہا ہے تو آخر اپنے بازوؤں کی قوت استعمال کر رہا ہے، اسی طرح ایک عورت بھی کمائی کے لیے اپنے جسم کا ایک عضو استعمال کرتی ہے تو فرق کیا ہوا؟ دوسرے نمبر پر ہم جنس پرستی ہے، یعنی gays اور lesbians کے ہم جنسی تعلق کو بھی خلافِ فطرت نہیں، بلکہ ایک normal orientation سمجھا جائے۔ ان کے نقطہ نظر سے یہ تو مزاج کی بات ہے، کوئی اپنے مزاج کے اعتبار سے مخالف جنس سے اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کرتا ہے اور کوئی اپنے ہم جنس سے شہوانی خواہش پوری کر لیتا ہے تو ان میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ پھر یہ کہ عورت اور مرد بالکل برابر ہیں، ان کو وراثت میں برابر حصہ ملے گا، عورت کو بھی طلاق کا برابر حق حاصل ہو گا کہ وہ جب چاہے مرد کو طلاق دے دے، خلع کا کوئی تصور نہیں کہ عورت کسی بالاتر ادارے کے ذریعے سے ہی خلع حاصل کرے۔ ضروری نہیں کہ وہ پنچایت وغیرہ کو قائل کرے کہ ان اسباب کی بنا پر اب وہ اس شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتی، بلکہ وہ جب چاہے مرد کو طلاق دے دے۔ پھر

یہ کہ گھریلو ذمہ داریوں اور تولیدی خدمات پر وہ اپنے شوہر سے اجرت طلب کر سکتی ہے' کیونکہ وہ ایک طرح سے اُس کی مزدور ہے۔ وہ گھر میں رہ کر کام کر رہی ہے تو اس کو اس کی مزدوری کا صلہ ملنا چاہیے۔ اگر وہ حمل کی تکلیف گوارا کرے اور بچے کی ولادت کا دکھ اور تکلیف برداشت کرے تو اس پر بھی وہ اجرت لے سکتی ہے۔ شوہر کو اس کی بھی قیمت اور مزدوری دینی پڑے گی۔ تو یہ ہے وہ ایجنڈا جس کو سامنے لایا جا رہا ہے اور اس کو بہت خوبصورت نام دیا گیا ہے ''Social Engineering'' کہ ہمیں سماجی نظام کی ایک نئی تعمیر کرنی ہے۔ جیسے کسی بوسیدہ عمارت کو گرا دیا جائے تو ظاہر بات ہے کہ اب ماہرین تعمیرات چاہئیں جو نئی بلڈنگ کا نقشہ بنائیں' پھر کنٹریکٹر چاہئیں جو اس کی تعمیر نو کریں۔ تو یہ سوشل انجینئرنگ کا پروگرام ہے جو پوری دنیا کے نمایاں ترین اور اہم ترین ادارے یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن (UNO) کی جنرل اسمبلی نے پاس کیا ہے اور اس پر دستخط کرنے والے ممالک میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی شامل ہے۔ چنانچہ اس ایجنڈے کی طرف پاکستان سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سطح پر عورتوں کو 33 فیصد نمائندگی دی جا رہی ہے۔ یونین کونسل ہو' لوکل باڈیز ہوں' صوبائی اسمبلیاں ہوں' ڈسٹرکٹ بورڈز ہوں' سٹی گورنمنٹس ہوں' نیشنل پارلیمنٹ ہو یا سینٹ ہو' ہر جگہ عورتوں کو 33 فیصد نمائندگی دی جاتی ہے۔ اس طرح اس دوڑ میں ہم سب سے آگے نکل گئے ہیں' جبکہ پوری دنیا میں کسی سیکولر جمہوریت میں بھی ایسا نہیں ہے۔ بھارت دنیا میں سیکولر جمہوریت کا معجزہ قرار پاتا ہے' کیونکہ وہاں کے رہنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے اور پھر وہ ملٹی نیشنل' ملٹی ایتھنک اور ملٹی لنگوسٹک ملک ہے۔ ہم تو گن بھی نہیں سکتے جتنی زبانیں وہاں ہیں۔ ہر صوبے' ہر سٹیٹ کی اپنی زبان ہے' لیکن وہاں سیاسی نظام جمہوریت کے تحت چل رہا ہے۔ مارشل لاء کا آج تک سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ سال کے لیے ایمرجنسی عائد کی گئی تھی اور ایمرجنسی بھی دستوری ہوتی ہے' وہ ماورائے دستور نہیں ہوتی کہ کوئی جرنیل آیا اور اُس نے دستور کو اٹھا کر پھینکا' اپنا پی سی او بنایا اور ججوں تک سے اس کا حلف لے لیا۔ بھارت جیسے ملک میں ایسا آج تک نہیں ہوا ہے' اس لیے جمہوریت کا جو سب سے اونچا لحاف ہے بھارت کو اس کا معجزہ مانا جاتا ہے۔ لیکن وہاں بھی کہیں عورتوں کی نمائندگی اس معنی میں نہیں ہے۔ ہاں عورتیں الیکشن لڑ سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہی نظام تھا۔ چنانچہ بیگم عابدہ حسین الیکشن لڑتی تھیں' کیونکہ وہ زمیندار ہے' جاگیردار ہے۔ اسی طرح بے نظیر بھٹو الیکشن لڑ کر آتی تھیں' لیکن عورتوں کے لیے علیحدہ سیٹیں نہیں تھیں۔ اور پھر اس وقت یونائیٹڈ نیشنز اور باہر کی حکومتیں NGOs کو پیسے دے رہی ہیں اور NGOs اس ملک میں نیا نظامِ تعلیم لا رہی ہیں' جس میں زیادہ توجہ عورتوں پر ہے تاکہ ان کے اندر یہ شعور پیدا ہو کہ ہم محکوم ہو کر کیوں رہیں!

تو یہ تیسرا معاملہ ہے جو مغرب میں تو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے' یہاں تک کہ تین سال پہلے بل کلنٹن نے اپنے ایک سالانہ خطاب میں کہا تھا: ''عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی''۔ اُس نے

حرام زادہ کے لیے bastard کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ کہا تھا: ''born without any wedlock'' یعنی بغیر اس کے کہ عورت اور مرد کے مابین شادی کا بندھن ہو' اولاد ہو رہی ہے۔ اسی کو ہم حرامی کہتے ہیں۔ خود یہودی اسی معنی میں (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو bastard کہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا یوسف نجار سے شادی کے لیے رشتہ تو ہو چکا تھا لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی' اس سے پہلے وہ جنسی تعلق قائم کر بیٹھے جس سے یسوع مسیح کی پیدائش ہوئی۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' نقلِ کفر کفر نباشد!

اب ان تینوں کو جوڑیے۔ اس وقت صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اڑھائی لحاف تو پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکے ہیں' تیسرا لحاف ابھی تک پورے طور پر مغرب میں تو implement ہو چکا ہے' لیکن اب سپریم پاور امریکہ کی پوری طاقت استعمال ہو رہی ہے کہ یہ نظام پوری دنیا میں آ جائے۔ وہ کہتے ہیں ہم ایشیا کو modernize کرنا چاہتے ہیں' یعنی وہاں سیکولر سیاست گہری ہو جائے۔ عرب میں شریعت کی بنیاد پر کچھ قوانین نافذ ہیں' ایران نے شریعت کی بنیاد پر کچھ قوانین نافذ کیے ہوئے ہیں تو یہ تو سیکولرازم کی نفی ہو گئی' لہٰذا ان سب کو ختم کیا جائے۔ افغانستان میں مذہب کی بنیاد پر ایک قانونی ڈھانچہ کھڑا ہو رہا تھا تو ہم نے اسے جڑ سے اکھاڑ دیا' اور ''Nip the evil in the bud'' کا معاملہ کیا۔ اب باقی ساری قوتیں پوری دنیا میں بھی اسی نظام کو لانے پر صرف ہوں گی۔

ان تین لحافوں کا میں اب ایک نتیجہ نکال رہا ہوں۔ نوٹ کیجیے کہ مذہب کے خلاف اتنی بڑی بغاوت آج تک نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے زیادہ سے زیادہ گمراہی کیا تھی! تصور یہ تھا کہ ایک بڑا خدا تو ہے' اس میں تو کوئی شک ہے ہی نہیں' البتہ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خدا بھی ہیں جو اس کے معاون ہیں' اس کے پیارے اور لاڈلے ہیں' اس کے بیٹے یا بیٹیاں ہیں' لہٰذا ان کی شفاعت (intercession) سے ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کی مورتیاں بنا کر پوجو' ان کی ڈنڈوت کرو' عزت کرو' چڑھاوے چڑھاؤ تاکہ یہ بڑے خدا کے ہاں ہمارے شفیع ہو جائیں۔ قرآن مجید میں مشرکوں کا قول نقل ہوا ہے:

﴿هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ﴾ (یونس:18) ''وہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے''۔ تو خدا کا انکار کہیں نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہے یورپ میں دو ہی تہذیبیں تھیں جو 'تہذیب' کے نام پر ابھری ہیں' ایک یونانی تہذیب اور دوسری رومی تہذیب۔ اور دونوں میں God (جو بڑی "G" سے لکھا جاتا تھا) ایک ہی تھا' جس کی تین صفات یہ تھیں کہ وہ omnipotent' omniscient اور omnipresent ہے۔ یعنی وہ ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ ہے' ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ہے' اور ﴿هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ 'وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو'۔ اسی طرح انڈیا میں 'مہادیو' ایک ہے' البتہ دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں۔ لیکن وہ مہادیو کے ہم پلہ تو نہیں سمجھے جاتے۔ رومی اور یونانی تہذیب کے gods and goddesses بھی اس بڑے God کے ہم پلہ

نہیں تھے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ﴿لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ﴾ ''کوئی بھی اس کا ہم پلہ اور مد مقابل نہیں ہے''۔
عرب میں ''اللہ'' ایک ہی تھا' البتہ آلِهَة بہت سے تھے۔ لیکن آج دنیا میں جو یہ بغاوت ہوئی ہے کہ خدا کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا ہے کہ جاؤ مسجد' سینیگاگ' چرچ وغیرہ میں رہو' لوگ وہاں آ کر تمہاری پوجا کریں گے' اس کے علاوہ نہ ہمارے گھر میں تمہارا عمل دخل ہوگا' نہ ہماری مارکیٹوں اور بینک میں کہیں تم داخل ہو سکتے ہو' نہ ہماری سیاست اور ریاست میں' نہ پارلیمنٹ میں' نہ سینٹ میں اور نہ ہماری عدالت میں۔ اس پر قرآن مجید کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ ''بحر و بر میں فساد رونما ہو گیا ہے''۔ ویسے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس نظام کے آنے کے بعد ہی پچھلی صدی میں دنیا میں دو عظیم ترین عالمی جنگیں ہوئیں جن میں کروڑوں انسان قتل ہوئے۔ یہ ''پہلی عالمی جنگ'' اور ''دوسری عالمی جنگ'' کے نام سے جانی جاتی ہیں' لیکن اس سے قطع نظر فساد سے درحقیقت مراد ہے اللہ کے خلاف بغاوت۔ جیسے کہ قرآن مجید میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے:

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ (البقرۃ:11)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔''

اصل میں منافقین کا موقف یہ تھا کہ بھئی قریش سے کیوں جنگ مول لے رہے ہو؟ تمہاری مت ماری گئی ہے' ایک دیو کے ساتھ ٹکرانا چاہتے ہو؟ صلح وصفائی سے کام لو۔ دشمن کو مارنا بھی ہے تو گڑ دے کر مارو! وہ جنگ کے خلاف تھے' کیونکہ اس میں جان جانے کا اندیشہ ہے' نیز مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل کو فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم کچھ اور ہے اور یہ کچھ اور کہہ رہے ہیں' اپنی ڈفلی بجا رہے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف تم بات کرو گے تو یہ فساد ہے۔ آج پوری دنیا اس فساد کی گرفت میں ہے۔ اور یہ فساد کیوں برپا ہوا ہے؟ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے: ﴿بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ﴾ ''لوگوں کے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کی وجہ سے''۔ انسان نے خود یہ نظام بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے کہ تم خود مختار ہو' جو کرو گے تم خود بھگتو گے اور تمہاری آنے والی نسلیں بھگتیں گی۔ عذابِ الٰہی آئے گا تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسے گا' البتہ ہماری طرف سے تمہیں آزادی ہے' ہم زبردستی تمہیں روکیں گے نہیں کہ اس راستے پر مت جاؤ۔ اس لیے کہ زبردستی ہو تو پھر جزا اور سزا کا ہے کی؟ انسان کو تو اختیار دیا گیا ہے کہ ﴿اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا﴾ (الدھر:3) ''چاہے تو وہ شکرگزار رہے اور چاہے تو کفر کرے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ﴾ (الکھف:29) ''پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے''۔ ہم نے تمہیں اپنی پسند و ناپسند کا اختیار دیا ہے۔ تو یہ درحقیقت تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں

کے نتیجے میں ہوا۔ آگے فرمایا: ﴿لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ ''تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزہ چکھائے ان کے کچھ اعمال کا''۔ سارے اعمال کا مزہ تو وہ آخرت میں چکھائے گا' جہنم میں لوگ موت مانگیں گے کہ کاش موت آ جائے لیکن موت نہیں آئے گی ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ (الاعلیٰ: 13) ''پھر اس (جہنم) میں نہ وہ مرے گا نہ جیئے گا''۔ تو اصل اور پوری سزا تو تمہیں وہاں ملے گی' البتہ تمہارے کرتوتوں کی کچھ سزا ہم یہیں دے دیں گے۔ اور اس سزا کی بھی ایک حکمت ہے۔ فرمایا: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''شاید کہ یہ لوٹ آئیں''۔ شاید کہ ٹھوکر کھا کر سنبھل جائیں۔ شاید کہ عذابِ الٰہی کے جھنجوڑنے سے یہ جاگ جائیں۔

میری گفتگو کا اب تک کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو ہمارا Globe ہے اس پر تین لحاف چڑھے ہوئے ہیں۔ شرم و حیا اور عفت و عصمت تار تار ہے۔ سود' جوا اور انشورنس کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے اور سیکولر نظامِ حکومت ہے۔ اور اس کی چوٹی پر امریکہ بیٹھا ہوا ہے۔ بائبل میں یوحنا کا ایک مکاشفہ درج ہے کہ ''... میں نے قرمزی رنگ کے حیوان پر جو کفر کے ناموں سے لپا ہوا تھا اور جس کے سات سر اور دس سینگ تھے' ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ عورت ارغوانی اور قرمزی لباس پہنے ہوئے اور سونے اور جواہر اور موتیوں سے آراستہ تھی اور ایک سونے کا پیالہ مکروہات یعنی اس کی حرام کاری کی ناپاکیوں سے بھرا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا...'' وہ آبرو باختہ عورت امریکہ ہے جو آج کفر کے ناموں سے لپے ہوئے دیوہیکل حیوان کی پیٹھ پر سوار ہے۔ وہاں کی اکثریت کہتی ہے:. We are living together but we are not married.

یعنی ہم ساتھ رہ رہے ہیں' بچے ہو رہے ہیں' لیکن ہمارے درمیان شادی کا بندھن نہیں۔ اسی بنیاد پر تو کلنٹن نے کہا تھا ''عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی''۔ یوحنا کی انجیل کے آخری باب مکاشفہ (Revelations) کے باب 17 میں یہ مکاشفہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے اور وہاں اس آبرو باختہ عورت کے لیے کسبی (harlot) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس تشبیہ سے اصل مراد یہ ہے کہ اسرائیل وہ harlot ہے جو آج عیسائی دنیا کی پیٹھ پر سوار ہے' لیکن مَیں یہاں وہ تشبیہ امریکہ کے لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جو اِن تین لحافوں میں لپٹے ہوئے اس کرۂ ارض پر سوار ہے۔

تیسری سطح: مذہبی تصادم

اب تیسری سطح پر آیئے۔ یہ ذرا مخفی سطح ہے' کیونکہ آج دنیا میں مذہب سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور یہ معاملہ خالصتاً مذہبی ہے۔ اس لیے عام طور پر تو لوگ اس کے بارے میں گفتگو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ یہ کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک مذہبی چپقلش بھی صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس مذہبی چپقلش میں سب سے فعال یہودی ہیں' جو اپنی کئی صدیوں کی جدّوجہد اور محنت کے نتیجے میں عیسائی دنیا کو فتح کر چکے ہیں۔ لیکن سب عیسائی ایک جیسے نہیں ہیں۔ رومن کیتھولک نے بھی اگرچہ ہتھیار ڈال دیے ہیں لیکن ان کے دلوں میں یہودیوں

کی محبت نہیں ہے۔ آج بھی فرانس کے اندر Anti-semitism پھر سر اٹھا رہا ہے اور فرانسیسی حکومت بڑی تشویش میں ہے۔ عیسائیوں کے دلوں میں یہودیوں کے خلاف غصہ اور نفرت ہے کہ انہوں نے ہمارے خدا کے بیٹے کو سولی چڑھایا تھا' لیکن مجموعی طور پر وہ ہتھیار پھینک چکے ہیں۔ ان کا پوپ یہودیوں کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سولی دیے جانے کے الزام سے بری کر چکا ہے۔

اب ان یہودیوں کا پروگرام کیا ہے؟ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''ہم خدا کے برگزیدہ و چنیدہ بندے ہیں'' (We are the chosen people of the Lord) پورے انسان صرف ہم ہیں۔ باقی انسانوں کو وہ Gentiles یا Goyims کہتے ہیں کہ یہ انسان نہیں ہیں' انسان نما حیوان ہیں' اور حیوانوں کا استحصال کرنا انسانوں کا حق ہے۔ آپ گھوڑے کو تانگے کے اندر جوت دیتے ہیں' یہ آپ کا حق ہے۔ آپ بیلوں کو ہل کے اندر جوت دیتے ہیں' یہ آپ کا حق ہے۔ آپ بکری' گائے' بیل' اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں' یہ آپ کا حق ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ ہمارا حق ہے کہ ان Gentiles اور Goyims کو جس طرح چاہیں لوٹیں' جس طرح چاہیں ان سے خدمت لیں اور جس طرح چاہیں ان کا خون چوسیں۔ یہ ان کے تالمود میں ہے جو ان کی فقہ کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ Gentiles کو دھوکہ دینا' ان کو لوٹ لینا' ان کا مال چوری کرنا' ان کو قتل کرنا' ان کا خون چوسنا' ان کا استحصال کرنا یہودیوں کا حق ہے۔ یہ ہے تالمود کی تعلیم۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران:75) ''وہ کہتے ہیں کہ ان اُمِّیّٖن (غیر یہودیوں) کے بارے میں ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا''۔ وہ کہتے ہیں یہ اُمِّیّٖن (Gentiles) ہیں' جن کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے' کتاب تو ہمارے پاس ہے یعنی تورات' کیونکہ وہ قرآن اور انجیل کو تو مانتے نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اُمِّیّٖن کے بارے میں ہم پر کوئی پرسش نہیں ہے' ہم جو چاہیں ان کے ساتھ کریں۔ لہٰذا وہ دنیا پر ایسا غلبہ چاہتے ہیں کہ انسانیت کو حیوانیت کی سطح پر لے جائیں۔ چنانچہ ان کا بینکنگ سسٹم کے ذریعے جو معاشی پروگرام ہے' یعنی ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' TRIPS کا معاہدہ وغیرہ' اس سے ان کے پیش نظر یہ ہے کہ پوری دنیا مزدوروں میں تبدیل ہو جائے' وہ بس کام کریں اور جو کچھ ان کی یافت ہو وہ بینک کے سود کی شکل میں ہم کھینچ لیں۔ ہمیں پوری دنیا پر حکومت نہیں کرنی' اگر ہم دنیا میں براہِ راست حکومت کریں گے تو دنیا میں بغاوت ہوگی' محکوم ہمارے خلاف بغاوتیں کریں گے' ہم انہیں قتل کریں گے تو وہ بھی ہمیں قتل کریں گے! (آج یہودی فلسطینیوں کو قتل کر رہے ہیں تو فلسطینی بھی خودکش حملے کر کے کبھی بیس کبھی پندرہ یہودی مار دیتے ہیں) تو اس کی کیا ضرورت ہے؟ حکومت کرنے کا اصل مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ ٹیکس لینا' ریونیو اکٹھا کرنا اور بس۔ وہ ٹیکس اور ریونیو ہم اپنے بینکنگ کے نظام کے تحت لے لیں گے۔ ساری دنیا کا کاروبار بڑی بڑی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ذریعے ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ کبھی گلی گلی سوڈا واٹر (aerated water) بنانے کی مشینیں لگی ہوتی تھیں۔ کسی کے پاس تھوڑا سا پیسہ ہوتا تھا تو وہ سوڈا واٹر کی بوتلیں بنا کر بیچا کرتا تھا' جبکہ اب آپ صرف ڈسٹری بیوٹر ہو سکتے ہیں۔ آپ سیون اپ' پیپسی اور کوکا کولا کے ڈسٹری بیوٹر ہو سکتے ہیں' خود تیار نہیں کر سکتے۔ پہلے کیا ہوتا تھا کہ غریب آدمی جھونپڑی کے اندر ڈھابہ کھول کر بیٹھا ہوا ہے' ایک چولہا جلا کر اس کے اوپر کچھ پکا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اب وہ سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ اب فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ اب تو دبئی میں سیون سٹار ہوٹل بن گیا ہے جہاں کئی ہزار ڈالر ایک رات کا کرایہ ہے۔ اب تو پوری دنیا کے اندر ملٹی نیشنلز کا تسلط ہے۔ Pearl Continentals ہیں' شیرٹن کی chain ہے' ہالی ڈے ان کی chain ہے۔ یہ تو یہودیوں کا ایک پروگرام ہے کہ پوری دنیا کا معاشی استحصال کرنا ہے۔ اور اس میں اصول یہ ہے کہ جیسے آپ گھوڑے کو تانگے میں جوت کر شام کو کچھ کمائی کرتے ہیں تو تھوڑا سا چارا' کچھ دال چنے گھوڑے کو بھی ڈالتے ہیں تاکہ وہ اگلے روز جوتے جانے کے قابل ہو جائے' یعنی کچھ نہ کچھ subsistence level اس کو بھی دینا پڑے گا۔ لہٰذا یہودیوں کا اصول ہے کہ تم محنت مزدوری کرو' تمہیں اجرت مل جائے گی' لیکن اس کی ملائی ہم کھینچ لیں گے۔ تو یہودیوں کا ایک پروگرام یہ ہے' جسے ان کی طرف سے گلوبلائزیشن کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس گلوبلائزیشن کے خلاف اگر دنیا میں کہیں ردِّعمل ہے تو یورپ اور امریکہ میں ہے' ہمیں تو پتا بھی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں آگاہی ہی نہیں ہے' ہماری ''جان کاری'' ہی نہیں ہے' ہمیں کیا پتا کہ نوعِ انسانی کی قسمت کے بارے میں کیا فیصلے ہو رہے ہیں۔ یہ گلوبلائزیشن کے لیے کبھی سی ایٹل (Seattle) میں جمع ہوتے ہیں تو کبھی ڈیووس (Davos) میں اور کبھی واشنگٹن میں۔ اور ہر مقام پر اس گلوبلائزیشن کے خلاف نہایت عظیم مظاہرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ؎

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی!

ان کا دوسرا پروگرام عظیم تر اسرائیل کا قیام ہے کہ ہمیں عرب دنیا کے عین درمیان میں ایک بڑی مملکت ضرور بنانی ہے۔ یہ گریٹر اسرائیل ان تمام علاقوں پر مشتمل ہوگا جہاں کبھی یہودی قومی طور پر آباد رہے ہیں۔ ویسے تو وہ اپنے دورِ انتشار (Diaspora) میں پوری دنیا میں رہے ہیں' لیکن گریٹر اسرائیل میں وہ فلسطین' شام' ترکی کا مشرقی اور جنوبی حصہ' مصر کا جوشن جو دریائے نیل کا زرخیز ڈیلٹا ہے اور عراق کے علاوہ سعودی عرب کا شمالی حصہ' جس میں خیبر ہے جہاں یہودیوں کے قلعے تھے اور مدینہ منورہ جہاں ان کے تین قبیلے آباد تھے' ان علاقوں کو شامل کرنا چاہتے ہیں اور اس کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ چنانچہ عراق کو امریکہ نے فتح کیا تو شیرون نے کہا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔

تیسری چیز جو اُن کے پیشِ نظر ہے وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو گرا کر تیسرا معبدِ سلیمانی (Third

(Temple of Solomon) تعمیر کرنا ہے۔ پہلا ٹیمپل حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا۔ ہم تو اسے مسجد کہیں گے' وہ ٹمپل کہتے ہیں۔ یہ ایک ہزار سال قبل مسیح میں بنا تھا' لیکن 587 قبل مسیح میں عراق کے بادشاہ بخت نصر نے' جس کے ہاتھوں یہودیوں کی تباہی ہوئی' اس ٹمپل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ (اسی لیے اسرائیل کو سب سے زیادہ خطرہ عراق سے تھا کہ پہلے بھی ہماری تباہی ایک عراقی بادشاہ کے ہاتھوں ہوئی تھی) پھر اسے ڈیڑھ سو برس کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی کے چالیس برس بعد رومیوں کے جنرل ٹائٹس (تیطس) رومی نے اسے بھی گرا دیا اور 70 عیسوی سے آج تک وہ گرا پڑا ہے۔ اسے تقریباً دو ہزار برس ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب ہمیں اسے دوبارہ بنانا ہے۔ اس کی جگہ پر مسجد اقصیٰ بنا دی گئی تھی اور اس پتھر پر جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شبِ معراج میں آسمانی سفر شروع ہوا تھا اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک گنبد بنا دیا تھا۔ آپ بی بی سی وغیرہ پر دیکھتے ہیں کہ یروشلم سے کوئی نمائندہ بات کر رہا ہو تو پس منظر میں بہت بڑا سنہری گنبد ہوتا ہے۔ یہ قُبّة الصّخرہ (Dome of the Rock) ہے۔ تو وہ کہتے ہیں ان دونوں کو ہم گرائیں گے اور اپنا تیسرا معبد تعمیر کریں گے۔

معبد کی تعمیر کے بعد وہ یہاں دو کام کریں گے۔ ایک یہ کہ جانوروں کی قربانی کا دوبارہ آغاز ہو گا۔ یہودیوں کے ہاں سب سے بڑی عبادت قربانی ہے' نماز کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی قربانی کی تھی' اور قربانی کے جانور ہیکل سلیمانی میں قربان گاہ پر قربان کیے جاتے تھے۔ ہیکل سلیمانی کے انہدام کے بعد سے وہ قربانی موقوف ہے۔ تو تیسرے معبد کی تعمیر کے بعد اس میں وہ قربانی دوبارہ شروع ہو گی۔ دوسرے یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر جما دیا جائے گا اور وہاں ان کے "میسایاح" (Messiah) (حضرت مسیح علیہ السلام نہیں) کی تاج پوشی ہو گی جس کے وہ منتظر ہیں' جس کی تورات کے اندر پیشین گوئیاں ہیں۔ درحقیقت ان پیشین گوئیوں کے مصداق حضرت مسیح علیہ السلام تھے' لیکن جب وہ آئے تو ان کو یہودیوں نے مانا نہیں' بلکہ نعوذ باللہ bastard قرار دیا' کافر و مرتد قرار دیا اور اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ لہٰذا ان کے بقول ان کے میسایاحِ منتظر کی سیٹ خالی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق جب وہ میسایاح آئے گا تو وہ اس تخت داؤد پر بیٹھ کر پوری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ اس ضمن میں انہیں عیسائیوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے' اس لیے کہ انہیں وہ اپنی گرفت میں لا چکے ہیں' اب انہیں مخالفت صرف مسلمانوں کی طرف سے نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت دنیا کے اندر مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہودی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کہیں سیاسی قوت حاصل نہ ہونے پائے۔ یہ ہے یہودیوں کا پروگرام۔

اب آیئے عیسائیوں کی طرف۔ عیسائیوں میں سب ایک جیسے نہیں ہیں' جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَيْسُوْا سَوَاءً "وہ سب کے سب برابر نہیں ہیں"۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد!
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!!

ان میں ایک پروٹسٹنٹ فرقہ ہے' جس کا امام پہلے برطانیہ تھا اب امریکہ ہے' اور یہ ایک نسل ہے جس کو White Anglo-Saxson Protestants یعنی WASP کہتے ہیں۔ یہ سب یہود کے پشت پناہ اور مددگار ہیں' بلکہ اس وقت یہ مذہبی یہودیوں سے بھی زیادہ اسرائیل کے حمایتی ہیں۔ آج سے کوئی چھ سال پہلے یہ بات ہمیں ایک یہودی پروفیسر نے تنظیم اسلامی آف نارتھ امریکہ کے ہوسٹن میں منعقدہ کنونشن میں بتائی تھی۔ اس نے ایک حیران کن بات یہ بھی کہی تھی کہ:

Islam is the ideal religion for whole of mankind except Jews.

گویا اس نے عیسائیت' ہندومت' ہر چیز کی نفی کی' سوائے یہودیت کے۔ دوسری بات اُس نے یہ کہی کہ اسرائیل کی پشت پناہی ہم نہیں' بلکہ یہاں کے عیسائی کرتے ہیں۔ اسرائیل کی ساری معیشت کا دارومدار امریکہ ہی پر ہے۔ پانچ ارب ڈالر تو انہیں ہر سال مل جاتے ہیں۔ باقی اگر کوئی کام امریکہ کہتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ڈالر لاؤ! موجودہ بش کے باپ سے انہوں نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے لیے دس ارب ڈالر مانگے تھے۔ اس نے ایک شرط لگا دی کہ تم فلسطینیوں کے ساتھ امن مذاکرات شروع کرو' تب میں دوں گا۔ یہودی ناراض ہو گئے' انہوں نے پیچ و تاب کھائے' لیکن اس وقت یہ شرط ماننی پڑی۔ لیکن اس کی سزا اسے یہ دی کہ اگلے الیکشن میں وہ زیرو ہو گیا۔ اس سے دس ارب ڈالر بھی لے لیے اور اس سے اپنی شرط نہ ماننے کا بدلہ بھی چکا لیا۔ تو عیسائیوں میں ایک تو یہ پروٹسٹنٹ ہیں' خاص طور پر Baptists اور اخص الخواص کی حیثیت سے Evengelists جن کی امریکہ کے اندر اکثریت ہے اور وہ اسرائیل کی حمایت کر رہے ہیں۔ وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ (آرمیگاڈان) جلد از جلد ہونی چاہیے' اس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل وجود میں آنا چاہیے' تھرڈ ٹمپل تعمیر ہونا چاہیے' جہاں تختِ داؤد علیہ السلام لاکر رکھا جائے۔ تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے اور اس تخت پر بیٹھ کر پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔ یعنی پروگرام وہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنے میسایاح کے منتظر ہیں اور یہ اپنے حضرت مسیح علیہ السلام کے۔ یہودیوں کے خیال میں ان کا میسایاح آئے گا اور تخت داؤد علیہ السلام پر وہی بیٹھے گا' جبکہ ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور وہ تخت داؤد علیہ السلام پر بیٹھیں گے۔

اس تخت داؤد کا پس منظر بھی سمجھ لیجئے۔ حال ہی میں مجھے اس کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ ایک پتھر تھا جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کی تاج پوشی (coronation) ہوئی تھی۔ پھر اسی پتھر پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاج پوشی ہوئی۔ وہ پتھر اُن کے ہاں چلا آ رہا تھا۔ 70 عیسوی میں جب رومی جنرل ٹائٹس نے ہیکل سلیمانی تباہ

کیا تو وہ اس پتھر کو روم لے گیا۔ روم سے وہ پتھر آئرلینڈ چلا گیا جو بہت بڑی کیتھولک آبادی ہے۔ (آج بھی آئرلینڈ میں کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کے اندر جنگ ہو رہی ہے۔) وہاں سے وہ پتھر چودہویں صدی عیسوی میں انگلینڈ آیا تو اسے تخت کی صورت دے دی گئی۔ یعنی تخت کی سیٹ اسی پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ یہ تخت اب انگلینڈ کی پارلیمنٹ کی عمارت سے ملحقہ چرچ ''ویسٹ منسٹر ایبے'' میں رکھا ہے اور اسی پر بٹھا کر انگریز حکمرانوں کی تاج پوشی کی جاتی ہے۔ یہ روایت ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ تو اُن کا خیال ہے کہ اس معبد میں وہ تخت بھی ہم لا کر رکھ دیں گے اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے تو اس تخت پر تشریف فرما ہوں گے۔

اب یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ جا رہی ہیں۔ تھوڑا سا اختلاف اگر ہے تو یورپ کی سب سے بڑی طاقت میں ہے۔ سینٹرل یورپ کی اصل قوتیں فرانس اور جرمنی ہیں' باقی چھوٹے چھوٹے ملک ہیں۔ انگلینڈ تو ویسے بھی اصل یورپ سے علیحدہ ایک جزیرہ ہے اور وہ اس وقت ہر اعتبار سے امریکہ کا ضمیمہ ہے۔ تو یہ جو اختلاف ہے کہ جرمنی اور فرانس ایک طرف ہیں اور یہ عراق کی جنگ سے علیحدہ رہے' یہ اختلاف صرف سیاسی نہیں ہے' یہ صرف اپنے آپ کو عالمی سطح پر منوانے کا مقابلہ نہیں ہے' بلکہ یہ اختلاف مذہبی بھی ہے' وہ کیتھولکس ہیں یہ پروٹسٹنٹس ہیں اور پروٹسٹنٹس کیتھولکس کو کافر (Infidels) اور پوپ کو شیطان کہتے ہیں۔ The Philadelphia Trumpet کے نام سے ان کا ایک ماہنامہ رسالہ فلاڈلفیا (امریکہ) سے نکلتا ہے، کچھ عرصہ سے مَیں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اصل میں یورپ جو اِس وقت ایک ہو رہا ہے یہ معاملہ سیاسی نہیں مذہبی ہے اور اس میں اصل متحرک طاقت پوپ کی ہے۔ اور موجودہ پوپ واقعتاً ایسا ثابت ہوا ہے جس نے پوری دنیا میں move کیا ہے۔ اس سے پہلے پوپ اپنے گھر ویٹی کن میں بیٹھا رہتا تھا' باہر نہیں نکلتا تھا' جبکہ یہ پوپ شدید ترین بڑھاپے کے باوجود دنیا بھر کے سفر کر رہا ہے۔ یہ مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) کا دنیا میں دوبارہ احیاء کرنا چاہتا ہے' جو پورے یورپ' شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے بہت سے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اور یورپ کی یہ قوتیں چاہتی ہیں کہ فلسطین کو فتح کریں' یعنی اسرائیل بھی ختم کریں اور فلسطینی سٹیٹ بھی ختم کریں اور وہاں پر ایک رومن کیتھولک حکومت قائم کریں۔

''نیوز ویک'' میں فلسطین کے بارے میں ایک بڑا پیارا جملہ میری نظر سے گزرا تھا:

"Too small a geography but too big a history."

اس سے پانچ ہزار سال کی تاریخ وابستہ ہے۔ یہی حضرت ابراہیم' اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کا مسکن تھا۔ چنانچہ یہودیوں کا بھی مقدس ترین مقام یہی ہے۔ پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے' یہیں یہودیوں کے بقول سولی چڑھے۔ یہیں انہوں نے گلیلی اور مختلف علاقوں میں تبلیغ کی' یہیں وہ کوہِ زیتون ہے جس پر آپ علیہ السلام نے اپنا تاریخی وعظ Sermon of the Mount کہا۔ لہٰذا یہ عیسائیوں کا بھی بہت محترم مقام

ہے۔ مسلمانوں کا بھی یہ مقدس مقام ہے اور وہ اسے تیسرا حرم کہتے ہیں۔ پہلا حرم مکی ہے' دوسرا حرم مدنی ہے اور تیسرا ''الحرم الشریف'' مسجد اقصیٰ ہے۔ یہیں سے حضرت محمد ﷺ کا آسمان کی طرف معراج شروع ہوا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ واقعتاً بہت چھوٹا سا خطہ ہے' اس کا رقبہ محض ہماری سابقہ ریاست بہاولپور کے برابر ہوگا' لیکن تاریخ اور مذاہب کے اتصال (confluence) کے اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا یہودیوں' پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولک عیسائیوں کے اپنے اپنے نقشے اور منصوبے ہیں۔ عیسائیوں نے انڈونیشیا کے جزیرے تیمور کو تقسیم کرا کر وہاں ایک رومن کیتھولک حکومت قائم کی ہے۔ نائیجیریا میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو شدید ترین فسادات ہوئے ہیں وہاں بھی عیسائیوں کا اصل مقصد ایک رومن کیتھولک حکومت قائم کرنا ہے۔ ماہنامہ ''فلاڈلفیا ٹرمپٹ'' میں ایک عنوان قائم ہوا ہے: ''The Last Crusade''۔ پروٹسٹنٹس کا یہ الزام ہے کہ آخری صلیبی جنگ اب ہونے والی ہے۔ اب ساری یورپی قوتیں جمع ہو کر حملہ کریں گی اور فلسطین میں عیسائی حکومت قائم ہو جائے گی۔ آپ نوٹ کیجیے پہلی صلیبی جنگیں دوسرے ملینیم کے آغاز میں شروع ہوئی تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک ہزار سال بعد پہلا ملینیم ختم ہو گیا اور دوسرا ملینیم 1001ء سے شروع ہو گیا۔ دوسرے ملینیم کے شروع میں صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا اور 1099ء میں انہوں نے بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ اب 2001ء سے تیسرا ملینیم شروع ہوا ہے اور یہ آخری کروسیڈ ہوگا کہ یورپ کی رومن کیتھولک قوتیں فلسطین پر حملہ آور ہوں گی اور یہاں ایک رومن کیتھولک حکومت قائم کرنا چاہیں گی۔

اس ضمن میں ایک بات مزید نوٹ کر لیں کہ رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کا آپس میں خواہ کتنا ہی مذہبی اختلاف ہو' اور فرانس اور جرمنی کا سیاسی اور عسکری اعتبار سے امریکہ سے کتنا ہی اختلاف ہو' ایک چیز پر وہ متفق ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے پورے فلسطین کو مسلمانوں سے آزاد کرانا ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے دماغ میں جو یہ خناس پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارا ایک نظام ہے جس کو ہم قائم کریں گے' اس خناس کو واش آؤٹ کرنا ہے۔

اس پس منظر میں اب آپ ایک بات سوچیے! بہت اہم بات ہے۔ امریکی مفکرین کہتے ہیں:

> "We are not against Islam, we are not going to war against Islam, we want a war within Islam."

اس کا کیا مطلب ہے؟ درحقیقت اسلام دو ہیں۔ اسلام کا ایک مذہبی تصور ہے کہ مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں' اُس کی نماز پڑھتے ہیں' اُس کے حکم پر روزے رکھتے ہیں' اُس کے حکم کے مطابق حج وعمرہ کرتے ہیں' جن کو اللہ توفیق دے وہ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ ان کے کچھ عقائد ہیں' کچھ تقاریب ہیں' عیدیں ہیں' یعنی عید الاضحیٰ اور عید الفطر۔ پھر ان کے کچھ سماجی رسوم و رواج ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو عقیقہ کرتے ہیں' شادی کرنی ہو تو نکاح ہوتا ہے اور کسی کے مر جانے پر اُسے جلاتے نہیں بلکہ دفن کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شراب نہیں پیتے' سور نہیں کھاتے۔ یہ مذہب ہے۔ جبکہ ایک اسلام ہے بطورِ دین۔ اس کا ایک سیاسی نظام ہے' ایک معاشی نظام ہے' ایک سماجی نظام

ہے۔تو وہ کہتے ہیں ہماری ساری جنگ اسلام بطورِ دین کے خلاف ہے‘اسلام بطورِ مذہب کے خلاف نہیں ہے۔

ان کا یہ کہنا کسی حد تک درست ہے کہ ہم مذہب اسلام کے خلاف نہیں ہیں‘ اور اس کی وہ گواہیاں دیتے ہیں کہ دیکھو تم یہاں آتے ہو اور کالوں اور گوروں کو مسلمان کر لیتے ہو‘ ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔تم یہاں آ کر ہمارے چرچ اور سینیگاگ خریدتے ہو اور مسجد بنا لیتے ہو‘ ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔تم نمازیں پڑھتے ہو‘ ہم نے اعتراض نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کام کے اوقات میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ البتہ ان میں کچھ لوگ اتنے بامروّت (considerate) ہوتے ہیں کہ کام کے اوقات میں بھی وہ وقت دے دیتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز پڑھ لو‘ ورنہ عام مسلمان وہاں مجبور ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کا جو دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوتا ہے اسی میں وہ ظہر اور عصر پڑھ لیتے ہیں اور پھر گھر جا کر مغرب اور عشاء ادا کرتے ہیں۔لیکن بہرحال اُن کا موقف یہ ہے کہ تمہاری نماز پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ روزے رکھتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسلام بطورِ مذہب سے تو ہماری جنگ نہیں ہے۔ بلکہ ہم رمضان میں وائٹ ہاؤس میں افطاری بھی دے دیں گے اور بہت سے لوگوں کو بلا لیں گے کہ آؤ روزہ افطار کرو۔ اور عید کے موقع پر کوئی یادگاری ٹکٹ بھی جاری کر دیں گے۔ تو اس اسلام سے ان کی کوئی جنگ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ’’We are ready to embrace it.‘‘ اس لیے کہ سیکولرازم کا اصول ہی یہ ہے۔ سیکولرزم لامذہبیت نہیں ہے‘ لادینیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک سیکولر ملک میں تمام مذاہب رہ سکتے ہیں۔ ہندو اور سکھ وہاں ٹمپل اور گوردوارے بنا سکتے ہیں‘ وہاں تمام مذاہب کو کھلی اجازت ہے۔ ان کی طرف سے آزادی ہے کہ چاہے ایک خدا کو پوجو‘ ہزار کو پوجو‘ درختوں کو پوجو‘ سانپ کو پوجو‘ بتوں کو پوجو‘ جس کو چاہو پوجو۔ چاہے ٹمپل بناؤ اور اس میں جو چاہو بھجن گاؤ‘ چاہے گروگرنتھ کے سامنے ماتھا ٹیکو‘ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح اسلام بطورِ مذہب سے بھی ان کی کوئی جنگ نہیں ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہم اسلام کو بطورِ دین کبھی برداشت نہیں کر سکتے‘ اس کو ہم نے ختم کر کے دم لینا ہے۔

نوٹ کر لیجیے کہ پچاس برس تک عالمی طاقتوں کی جو سرد جنگ چلی ہے وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں تھی‘ نظام کی بنیاد پر تھی‘ یعنی سرمایہ دارانہ نظام بمقابلہ اشتراکی نظام۔ اشتراکی نظام میں انفرادی ملکیت کے بجائے قومی ملکیت کا تصور تھا‘ لہٰذا اس میں سود کا بھی خاتمہ تھا۔تو آج اصل میں مغرب کی جنگ دین اسلام کے خلاف ہے جو طے کی جا چکی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں ’’War within Islam‘‘ یعنی وہ مذہبی تصور والے عناصر کو اسلام کو بطورِ دین ماننے والوں اور نظام کی بات کرنے والوں کے ساتھ ٹکرا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے علماء کی اکثریت اسلام کو ایک مذہب کی حیثیت سے جانتی ہے‘ دین کی حیثیت سے اسلام ان کے سامنے ہے ہی نہیں۔ تبلیغی جماعت بھی اسلام کو مذہب کے طور پر مانتی ہے۔ ان کے پیش نظر انفرادی ترجیحات مثلاً نماز‘ روزہ‘ ڈاڑھی‘ ٹخنوں سے اوپر شلوار وغیرہ ہیں۔ ان کو نظام سے کوئی بحث نہیں‘ نظام کوئی بھی ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی لوگ

نظام کے علمبرداروں کو crush کر دیں' لہٰذا وہ مذہبی لوگوں کی حمایت کریں گے۔ اس سے انہیں دو مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ ایک تو مذہبی لوگوں کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ مذہب کے خلاف تو ہیں ہی نہیں۔ وہ سوچیں گے کہ خواہ مخواہ کچھ لوگ ہمیں بہکاتے ہیں' یہ اسلام کے خلاف کہاں ہیں؟ ہو سکتا ہے وہ مسجد بنانے کے لیے آپ کو عطیات دے دیں' ان کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تبلیغی جماعت کے وفود امریکہ میں چکر لگائیں تو اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ وفود نظام کی بات نہیں کرتے۔ اور نظام کی بات کون کرتے ہیں؟ یہ میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ ذرا سمجھ لیں۔

اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے جذبے کا تاریخی پس منظر

اصل میں ہوا کیا ہے! آج سے نصف صدی قبل تک' کہیں سو برس سے' کہیں دو سو برس سے اور کہیں تین سو برس سے یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں عالم اسلام پر قابض تھیں۔ ہمارے ہاں انگریز تھا' ملایا وغیرہ کے اندر ولندیزی (Dutch) تھے' مصر اور عراق میں بھی انگریز تھے' شام میں فرانسیسی تھے' لیبیا میں اطالوی (Italian) تھے۔ ان استعماری طاقتوں نے ہمیں دبایا ہوا تھا۔ اور اس وقت ہمیں جو آزادی تھی وہ صرف مذہبی آزادی تھی' دین کی آزادی نہیں تھی۔ دین تو اُن کا تھا' پینل کوڈ اُن کا تھا' تعزیرات اُن کی تھیں' فوجداری قوانین اُن کے تھے۔ زیادہ سے زیادہ انہوں نے ہمارے ساتھ یہ رعایت کی تھی' اور یہ بہت بڑی رعایت تھی' کہ تم اپنے عائلی قوانین پر عمل کر سکتے ہو۔ یعنی نکاح جیسے چاہے کرو' طلاق جیسے چاہے دو' اس معاملے میں سارے فتوے اپنے مولویوں سے لے لو' ہمیں کوئی فکر نہیں ہے' ہمارے پاس بھی اگر آئے تو ہم تم سے پوچھ لیں گے کہ تم شریعت کا حکم چاہتے ہو یا رواج کا؟ تم رواج کا کہو گے تو ہم اس کے مطابق فیصلہ کر دیں گے' شریعت کا کہو گے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیں گے۔ ''Mohammadan Law'' نامی کتاب ایک پارسی کی لکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح وراثت کے قانون میں آزادی تھی کہ تم مالِ وراثت صرف بیٹوں کو دینا چاہو' صرف بڑے بیٹے کو دینا چاہو یا بیٹیوں کو بھی دینا چاہو تمہیں اختیار ہے۔ وہ پوچھ لیا کرتے تھے کہ آپ وراثت کے معاملے میں شریعت کا فیصلہ چاہتے ہیں یا رواج کا؟ ہمارے بڑے بڑے زمیندار کھڑے ہو کر کہتے تھے ''رواج کا!'' گویا شریعت ہمیں نہیں چاہیے۔ بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دے دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ رعایت بھی سیکولرزم کے خلاف ہے۔

آج امریکہ میں آپ کو اپنے عائلی قوانین (Family Laws) پر عمل کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں رہیں گے تو اُن کے عائلی قوانین کے مطابق آپ کو رہنا ہو گا۔ طلاق وغیرہ کے معاملے میں جو اُن کا قانون ہے اس کی پیروی کرنی ہو گی۔ اور بھارت یہی زور لگا رہا ہے۔ بی جے پی کے منشور کا سب سے اہم حصہ CCC (Common Civil Code) ہے کہ ہندوستان کی سب قوموں کے عائلی قوانین ایک ہوں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان جب ہمارے ساتھ رہتے ہیں تو فیملی لاز ایک سے ہونے چاہئیں۔ سیکولرزم میں تو قوم ایک ہوتی

ہے۔قوم ایک ہے تو خاندانی قوانین بھی ایک ہونے چاہئیں۔ یہ کیا کہ نکاح وطلاق کے ان کے اپنے اصول ہیں؟ بہرحال انگریز نے ہمیں رعایت دے رکھی تھی کہ عائلی قوانین یعنی نکاح وطلاق کے قوانین میں تمہیں آزادی ہے' یہاں تک کہ وراثت تم اپنے قوانین کے مطابق تقسیم کرسکتے ہو۔لیکن جب یہ نوآبادیاتی نظام تتر بتر ہونا شروع ہوا' ولندیزی ملایا (سماٹرا' جواَب انڈونیشیا کہلاتا ہے) سے چلے گئے' انگریز نے ہندوستان سے بستر باندھا' فرانس نے شام سے بستر تہہ کیا' صدر ناصر نے برطانیہ کو اٹھا کر بحیرۂ روم میں پھینک دیا' اٹلی لیبیا سے اور فرانس مراکو سے چلا گیا' تو مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں ایک خیال پیدا ہوا کہ ہمارا بھی تو ایک نظام ہے۔ یہ انگریز کا لایا ہوا بھی ایک نظام تھا' فرانسیسیوں کا دیا ہوا نظام بھی ایک نظام تھا' اور ہمارا بھی ایک نظام ہے' ہم کیوں نہ اس کو نافذ کریں!

یہ اصل میں اس آزادی کا ایک ثمرہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک خودآگاہی پیدا ہوئی' اور انہوں نے اسلام کو بطور ایک دین کے سمجھا۔لہٰذا احیائی تحریکیں ابھریں۔انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی' انڈو پاک میں جماعت اسلامی' ایران میں فدائین' عرب دنیا میں الاخوان المسلمون جیسی تحریکیں ابھریں۔ یہ ساری تحریکیں اس لیے اٹھیں کہ اسلام دین ہےاور دین اپنا غلبہ چاہتا ہے' ہمیں دین کو غالب کرنا ہے۔

لیکن بعض عوامل کی وجہ سے ان تحریکوں کو آج تک کہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ پہلا عامل یہ تھا کہ چاہے انگریز ہوں' فرانسیسی ہوں' اطالوی ہوں' سب نے سوسالہ' ڈیڑھ سوسالہ دَور میں جوحکومت کی تھی اور نظام تعلیم رائج کیا تھا اس سے ان ملکوں کا اعلیٰ طبقہ (elite class) ان کے رنگ میں رنگا گیا' یعنی انہوں نے انہی کی تہذیب' انہی کی زبان' انہی کا لباس' انہی کا ذہن' انہی کی سوچ' انہی کا فکر اپنا لیا۔اور جب انگریز حکومت ان کے حوالے کر کے چلے گئے تو بھی by-proxy انہی کی حکومت جاری رہی۔اور اس جتھے کے نزدیک اسلام صرف مذہب ہے' وہ اسلام بطورِ دین سے واقف ہی نہیں ہیں' وہ چاہے پرویز مشرف ہوں' نواز شریف ہوں' بے نظیر ہوں یا کوئی اور ہوں۔

دوسری بات یہ کہ ان مسلمان تحریکوں نے طریق کار غلط اختیار کیا۔ دنیا میں اسلام ایک نظام کی حیثیت سے محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا اور یہ دوبارہ برپا ہوسکتا ہے تو صرف حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق ہو سکتا ہے۔انہوں نے سمجھا وہ تو آؤٹ آف ڈیٹ ہے' پرانا ہے' لہٰذا الیکشن میں حصہ لے کر اس سے اسلام نافذ کریں گے۔اس میں ناکامی ہوئی تو گولی چلانی شروع کر دی کہ فلاں فلاں کو مار دو۔ چنانچہ سادات کو قتل کر دیا گیا۔سادات گیا تو حسنی مبارک آ کر براجمان ہو گیا (چند روز قبل میرے پاس ایک نوجوان آیا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے' میں چاہتا ہوں کہ پرویز مشرف کو قتل کر دوں۔ میں نے کہا تمہارا دماغ خراب ہے؟ تم ایک پرویز کو قتل کرو گے کوئی اور پرویز آ کر بیٹھ جائے گا' فائدہ کیا ہوگا؟) تو کہاں تبدیلی ہوئی ہے؟ فوجی حکومت کے ذریعے

سے کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ اس اعتبار سے اس غلط طریق کار نے ان تحریکوں کو کہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

اب ان دو اعتبارات سے اچھی طرح سمجھ لیجئے! ایک تو یہ کہ ہمارے عوام کے ذہنوں پر علماء کا جو تسلط ہے اس کے زیر اثر وہ اس تصور سے واقف ہی نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو بطورِ مذہب جانتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب مغربی استعمار کے بستر لپٹے ہیں تو جو نیچے حکومتیں بنی ہیں وہ انہی کے تربیت یافتہ اور تربیت دادہ لوگ تھے' چاہے وہ CSP آفیسرز تھے اور چاہے وہ بڑے بڑے لینڈ لارڈ تھے جن کے بچوں کی تعلیم مغرب میں ہوئی ہے۔ پیر پگاڑا اور ان کے بھائی کو بھی' جب ان کے والد کو پھانسی دی جا رہی تھی' انگلینڈ لے جایا گیا اور وہاں ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ اور جتنے بھی بڑے بڑے جاگیردار ہیں ان کے بچے وہیں سے تربیت حاصل کر کے آتے ہیں! وہاں سے ان کی برین واشنگ کر دی جاتی ہے۔ اور تیسرے نمبر پر یہ کہ دینی تحریکوں کا طریق کار غلط ہے۔ انہوں نے ''ballot یا bullet'' کا راستہ اختیار کیا۔ یہ دونوں غلط راستے ہیں اور یکساں غلط ہیں۔

اس پورے پس منظر میں یہ بات واضح ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور دین اسلام کا مستقبل بہت ہی تاریک ہے۔ امریکہ جیسی سپر پاور' عالمی تہذیب کے تین لحاف اور مذہبی و دینی سطح پر عیسائیت اور یہودیت کا گٹھ جوڑ اور اسلام سے دشمنی۔ اور تیسرا اس ٹرائی اینگل کے اندر شامل ہو گیا ہے بھارت' یعنی مشرکین' ان کی قوت و طاقت' ذرائع ابلاغ پر ان کا غلبہ۔ مزید یہ کہ NGOs کے ذریعے سے نظامِ تعلیم کو جو نیا رنگ دیا جا رہا ہے' ان سب کے باعث اسلام کے بطورِ دین نافذ ہونے کا کم سے کم مستقبل قریب میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہاں اسلام بطورِ مذہب باقی رہے گا' جیسے اقبال نے کہا تھا: ؎

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

دین اسلام آزاد نہیں ہوگا' مذہب اسلام موجود رہے گا۔ البتہ یہ صرف مستقبل قریب کی بات ہے' مستقبل بعید میں کیا ہونا ہے' اور ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

کی کیفیت کب اور کیسے پیدا ہوگی، جس کے ضمن میں قدرتِ الٰہی اور مشیتِ ایزدی نے پاکستان کو ایک اہم رول تفویض کیا تھا، جس کے آثار حالاتِ واقعی اور زمینی حقائق کی رو سے روز بروز دھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔ آیا اس کے بروئے کار آنے کا بھی کوئی امکان موجود ہے؟ ان امور پر ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل)

ہمارا ماضی

قرآنِ حکیم میں ناموں کی صراحت کے ساتھ تو صرف پچیس انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے' البتہ بعض نبیوں کا تذکرہ بغیر نام لیے بھی وارد ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اصولی بات بھی دو مقامات پر بیان ہوئی ہے کہ ایسے بھی بہت سے رسول دنیا میں گزرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا۔ (جیسے مثلاً سورۃ النساء کی آیت 164 اور سورۃ غافر کی آیت 78 میں)۔ پھر یہ اصول بھی دو ہی مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ: ﴿لِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ﴾ (الرعد: 7) ''ہر قوم کے لیے ہادی (بھیجا گیا) ہے''۔ اور: ﴿وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ﴾ (فاطر: 24) ''کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو''۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انبیاء علیہم السلام کی تعداد اتنی ہی رہی ہے جتنے مسلمان حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ کے ساتھ تھے' یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ' اور رسولوں کی کُل تعداد اتنی تھی جتنی تعداد میں جان نثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے' یعنی تین سو تیرہ۔ واللہ اعلم!

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کُل تعداد کتنی ہے' اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ ان میں سے پانچ سورۃ الاحقاف کی آیت 35 میں وارد شدہ اصطلاح کے مطابق ''اولوالعزم'' ہیں۔ یعنی حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ۔ چنانچہ ان ہی کا تذکرہ سورۃ الشوریٰ کی آیت 13 میں وارد ہوا ہے۔ پھر ان میں سے بھی صرف دو ہیں جنہیں کتاب اور شریعت سے نوازا گیا' یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں تو کسی صحیفے کا ذکر تک کہیں موجود نہیں ہے۔ ''صحفِ ابراہیم علیہ السلام'' کا ذکر اگرچہ قرآن میں ہے (سورۃ النجم' آیت 37 اور سورۃ الاعلیٰ' آیت 19)' لیکن غالباً انہیں ''کتاب'' اس لیے نہیں قرار دیا گیا کہ ان میں کوئی شریعت درج نہیں تھی۔ (راقم کو بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوؤں کے ویدوں اور اپنشدوں میں سے بعض صحف ابراہیم علیہ السلام کی بگڑی ہوئی اور تحریف شدہ صورتیں ہیں' تاہم ان میں بھی اگرچہ توحید کا بیان تو بلند ترین سطح پر بھی موجود ہے' لیکن احکام اور شریعت کا کوئی وجود نہیں ہے!) اسی طرح زبور اور انجیل کو بھی اگرچہ عرفِ عام میں کتابیں کہہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل بالذات کتابیں نہیں تھیں' بلکہ تورات ہی کے ضمیموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ زبور صرف حمد اور مناجاتِ باری تعالیٰ کے ترانوں پر مشتمل ہے اور انجیل صرف حکمت اور موعظت پر! یہی وجہ ہے کہ سورۃ الزخرف کی آیت 63 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے

کہ ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ﴾ ’’میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں‘‘۔ گویا وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوعِ انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی‘ دو ہی ہیں‘ یعنی اوّلاً تورات جو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دی گئی (بنی اسرائیل:2 والسجدہ:23) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوعِ انسانی کے لیے صرف ہدایت ہی نہیں ’’الہدیٰ‘‘ قرار پایا۔

چنانچہ صاحب کتاب و شریعت مسلمان اُمتیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: ایک سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ اُمت مسلمہ یعنی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں اُمتوں کی باہمی آویزش اور اِن کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے جس پر اس سے قبل مفصل گفتگو ہو چکی ہے‘ لہٰذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض مابہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے‘ تاکہ مستقبل کے بارے میں جو اشارات قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں اور جو تفصیلی پیشین گوئیاں احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بیان ہوئی ہیں ان کو صحیح پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ اور اس طرح ایک جانب حدیثِ نبویؐ اور جناب صادق و مصدوق ﷺ کی پیشین گوئیوں کی عظمت اور حقانیت پر دل مطمئن ہو جائیں‘ اور دوسری جانب پیش آنے والے حوادث و واقعات پر ذہن کا ردِ عمل تحیر اور استعجاب کا نہ ہو‘ بلکہ وہ ہو جو سرمدؔ کے اس مصرعے میں بیان ہوا کہ: ’’بیا بیا من ترا خوب می شناسم!‘‘ یعنی آؤ کہ میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں!

بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ 1800 قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے‘ اس لیے کہ انہی کا لقب ’’اسرائیل‘‘ یعنی ’’اللہ کا بندہ‘‘ تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں‘ لیکن ان کو اُمتِ مسلمہ کی حیثیت تقریباً 1350 ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی اور ان سے کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامنے اور شریعت خداوندی پر کاربند رہنے کا وہ پختہ عہد و میثاق لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار بہت شدّومد سے آتا ہے۔ بہرحال اس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سیّد المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی‘ گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتاب الٰہی کی امین اور شریعت خداوندی کی حامل اُمتِ مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تاآنکہ 624ء میں تحویل قبلہ کو بنی اسرائیل کی معزولی اور نئی اُمت یعنی اُمت محمد ﷺ کے اس منصب پر فائز کیے جانے کی علامت بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے تا قیامِ قیامت اُمت محمد ہی کتاب و شریعت کی حامل و امین اور روئے ارضی پر اللہ کی نمائندگی کی ذمہ دار ہے۔ کتابِ الٰہی کے امین اور شریعت خداوندی کے حامل ہونا بجائے خود

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

کے مصداق ایک بہت بڑا درجۂ فضیلت ہے' جو اِن دونوں اُمتوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دوبارہ یہ آیت مبارکہ سابقہ اُمتِ مسلمہ کے ضمن میں وارد ہوئی:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ○﴾
(البقرۃ:47و122)

''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا' اور مَیں نے تو تمہیں تمام جہانوں (یعنی تمام جہان والوں) پر فضیلت دے دی تھی!''

لیکن اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک مزید درجۂ فضیلت اس بنا پر حاصل ہے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت و رسالت اپنے نقطۂ عروج اور درجۂ کمال کو پہنچ کر ختم ہوگئیں اور آپ ﷺ کی بعثت تمام سابق انبیاء ورُسل علیہم السلام کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں' بلکہ پوری نوعِ انسانی کی جانب ہوئی' جیسے کہ فرمایا سورۃ سبا کی آیت 28 میں کہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!'' لٰہذا آپ ﷺ کی اُمت گویا اجتماعی طور پر تا قیامِ قیامت فریضۂ رسالت کی امین بھی ہے۔ یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ اُمت مسلمہ کی طرح صرف یہی نہیں ہے کہ خود کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعت خداوندی پر سختی سے کار بند رہے' بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوعِ انسانی تک رسالت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرے او ر پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لیے کہ یہی از روئے قرآن نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾
(التوبہ:33' الفتح:28' الصف:9)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے پورے دین (نظامِ زندگی) پر''

یہی وجہ ہے کہ اُمتِ محمد ﷺ کو ''اُمتِ وسط'' بھی قرار دیا گیا جس کا فرض پوری نوعِ انسانی پر اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے شہادت یعنی اتمامِ حجت کا فریضہ ادا کرنا ہے ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (البقرۃ:143) ''اور اسی طرح ہم

نے تمہیں ایک درمیانی امت (بہترین اُمت) بنایا' تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر' اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔''
اور ''خیر اُمت'' یعنی بہترین اُمت کا خطاب بھی دیا گیا ''جو پوری نوعِ انسانی کے لیے برپا کی گئی ہے''۔
﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:110) ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو۔'' بقول علامہ اقبال: ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

درجۂ فضیلت کے اس فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ اُمت مسلمہ ایک ''یک نسلی اُمت'' تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی جانب ہے' لہٰذا موجودہ اُمت مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (multinational) اُمت ہے۔ مزید برآں درجۂ فضیلت کے اعتبار سے خود یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے' جن کا صراحت کے ساتھ ذکر سورۃ الجمعہ میں کر دیا گیا ہے: ایک ''اُمیین'' یعنی بنی اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کے تابع اہل عرب اور دوسرے ''آخرین'' یعنی ان کے سوا تمام نسلوں اور جملہ اقوامِ عالم میں سے ایمان لانے والے مسلمان! اور ان میں سے مقدم الذکر کو اِن دو اسباب کی بنا پر بہت بڑا درجۂ فضیلت حاصل ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ انہی میں سے تھے۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول (محمد ﷺ) انہی میں سے!''

چنانچہ یہ تو ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' کے مصداق وہ فضیلت ہے جس پر اہل عرب جتنا ناز کریں کم ہے! اور یہ کہ اللہ نے ان ہی کی زبان میں اپنا آخری کلام اور نوعِ انسانی کے نام اپنا آخری پیغام نازل فرمایا' جس کا فہم اُن کے لیے نہایت آسان ہے۔ بقول علامہ اقبال:

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمیں!

یہ پوری بحث اس اعتبار سے تو یقیناً بڑی خوش آئند بھی ہے اور دل پسند بھی کہ ہمیں بحیثیت اُمت محمد ﷺ سابقہ اُمت مسلمہ پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کا ایک منطقی نتیجہ نہایت تلخ ہے' یعنی اوّلاً ''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!'' کے عام اور معقول اصول کے مطابق اور ثانیاً خود قرآن حکیم کی اس نص کی رو سے جو سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب کے

ضمن میں وارد ہوئی ہے، یعنی: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (آیت 32) "اے نبی کی گھر والیو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو" اور ﴿مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط﴾ (آیت 30) "اگر تم میں سے کسی نے کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اُسے (دوسروں کے مقابلے میں) دگنا عذاب دیا جائے گا"۔ یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی جرم کی جو سزا بنی اسرائیل کو دی گئی اسی جرم کا ارتکاب موجودہ اُمت مسلمہ کرے گی تو اس کے مقابلے میں دوہرے تہرے ہی نہیں بیسیوں گنا عذاب کی مستحق ہوگی۔ اور خود اُمتِ مسلمہ میں سے سورۃ النور میں وارد شدہ الفاظ ﴿وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ﴾ (آیت 11) "اور وہ جو والی ہوا اس کے سب سے بڑے حصے کا" کے مطابق اس عذاب کی شدید ترین صورت کے مستحق مسلمانانِ عالمِ عرب ہوں گے!

مندرجہ بالا اصولی نتائج کو ذہن میں جاگزیں کرنے کے بعد اب آیئے کہ پہلے ہم سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعثت نبوی (ﷺ) تک کے دَور پر ایک نظر ڈال لیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دَور کا وہ خلاصہ جو نئی اُمت مسلمہ یعنی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لیے کافی تھا' کمالِ فصاحت اور غایت اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (2 تا 7) اور آخری رکوع کی چار (101 تا 104) یعنی کُل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے' جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دَور گزر چکے تھے: دو دَور عروج کے' جن کے دوران اُن کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزّت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے --- اور دو ہی دَور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی' جس کے نتیجے میں اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے' اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی ہیکلِ سلیمانی کی حرمت بھی پامال ہوئی۔ تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

1) ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا' اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا' جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

2) حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا' اس لیے کہ فوراً ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنی انتہا کو

پہنچ گیا۔ چنانچہ اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر 587 قبل مسیح میں مشرق (عراق) سے آنے والے بخت نصر (Nebukadnezar) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنت یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' لاکھوں افراد کو قتل کیا' چھ لاکھ یہودی مَردوں' عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا ---- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکل سلیمانی کو کلیتہً مسمار کر دیا' حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! ---- بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری کا دَور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے۔

3) بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا' اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دَور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا' اور اس کا مظہر اعظم وہ مکابی سلطنت تھی جو تقریباً 170 ق م سے 67 ق م تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دَور کی یاد تازہ کر دی

4) بنی اسرائیل کا دوسرا دَورِ زوال 63 ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تا حال جاری ہے۔ اس کے دوران ان کی تاریخ میں دوسری بار اُن پر عذابِ الٰہی کے سخت کوڑے برسے چنانچہ 70ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس نے دوبارہ یروشلم شہر اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ 33 ہزار یہودیوں کو تہِ تیغ کر ڈالا اور 67 ہزار کو غلام بنا لیا۔ اور اُس دن سے جو یہودی اثر و رسوخ سرزمین فلسطین سے ختم ہوا تو لگ بھگ انیس سو برس تک انہیں وہاں سر اُٹھانے کا موقع نہ ملا' بلکہ پورے چھ سو برس تو اس سرزمین میں ان کا داخلہ بھی بند رہا۔ رہا اُن کا ہیکل مقدس تو وہ آج تک دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم شہر کو دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں ''ایلیا'' رکھا۔

موجودہ اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار اَدوار

امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

((لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

''میری اُمت پر بھی لازماً وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے' ہو بہو بالکل ایسے جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

اب (1993ء) سے لگ بھگ اٹھارہ برس قبل ان سطور کا راقم مسجد خضراء سمن آباد میں اعتکاف کی حالت میں اُمت مسلمہ کے ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک یہ حدیث مبارک ذہن میں بجلی کی طرح کوندگئی اور اس نے بعینہٖ وہ کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لیے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ فوراً اُمت کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک خاکہ نوشتۂ دیوار کی طرح نگاہوں کے سامنے آ گیا اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے جن چار اَدوار کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات میں ہوا ہے وہ ایک اعتبار سے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

کے مصداق خود اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا پیشگی بیان ہے۔ اس سے جہاں اس حدیث مبارکہ کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا وہاں اس حدیث نبویؐ ﷺ کی حقانیت بھی مزید منکشف ہوئی جس میں آنحضور ﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

((فِیْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ))

''اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی درج ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات کا ذکر بھی موجود ہے اور تمہارے مابین رونما ہونے والے جملہ نزاعات کا فیصلہ بھی موجود ہے۔'' (ترمذی و بیہقی، عن علیؓ بن ابی طالب)

بہرحال ذیل میں اُمتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے' تاکہ ایک طرف ''عروج'' کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں' اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی ویانا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دلوں میں ملت اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے! اور دوسری طرف ''زوال'' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدّل۔ اُس نے جو معاملہ سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا' حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دَور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دَور آئے۔ اگرچہ اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت و اِدبار کے یہ دَور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے' اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ۔

اِسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اُمت مسلمہ کے عروج وزوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں: ایک یہ کہ جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار سے اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا ''اُمیین'' یعنی بنی اسماعیل پر مشتمل ہے اور انہیں اس اُمت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے' اور دوسرا ''آخرین'' یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے' خواہ وہ کرد ہوں یا ترک' اہل فارس ہوں یا اہل ہند' افغان ہوں یا مغل' اہل حبش ہوں یا بربر' شرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالم اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے' یعنی ایک قلب' دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالم اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محو پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب' عراق' فلسطین' شام اور ایشیائے کوچک جو عالم اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں' اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب

کے جنوبی حصے کو اس کے دُم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی کے حساب سے اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے، اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت 571ء میں ہوئی۔ 610ء میں آپ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل 632ء میں آپ ﷺ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل فرما کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے فَصَلَّی اللّٰہُ علیہ وبارك وسلّم تسلیمًا کثیرًا۔ خلفاءِ ثلاثہ یعنی حضراتِ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران "امیّین" ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تو یہ عمل رُکا رہا، لیکن بنو اُمیہ کے دَور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ "امیّین" کے زیر نگیں آ گیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دَور ہے، جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں "امیّین" کی دو اہم شاخوں یعنی بنو اُمیہ اور بنو عباس کے پاس رہیں، اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر اُن کے دین و مذہب، اُن کے تہذیب و تمدن، اُن کے علوم و فنون اور اُن کی شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دُنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی، لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران "امیّین" کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالم اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی کے نتیجے میں عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے، یعنی کرد اور ترکانِ سلجوقی، جنہوں نے

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام' فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لیے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہوگئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں اُمتِ مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے ''وعدۂ اولیٰ'' کا ظہور ہوا اور ہو بہو وہی نقشہ کھنچ گیا جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 5 میں تاریخ بنی اسرائیل کے پہلے دورِ عذاب کے ضمن میں آیا ہے۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے' اور 1099ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا' بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لیے کہ دولت عباسی تو ''مرنے والی اُمتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی' گویا ''امیین'' میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر ''آخرین'' کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں 1187ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رُخ موڑا---اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیے اور بالآخر 1258ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے' بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی' اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجتاً ''زوالِ ملک مستعصم امیر المومنین'' کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گل ہو گیا' اور نہ صرف یہ کہ اُمتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پہلا دَور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم ''امیین'' کی حد تک تو وہ وعید بھی پوری ہوگئی جو سورۃ محمد (ﷺ)' آیت 38 میں وارد ہوئی تھی کہ ﴿وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ﴾ ''اور اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!'' چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیے گئے۔ دو سال بعد یعنی 1260ء میں اس طوفان کا رُخ بھی ''آخرین'' ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران عالم اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ﴿اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا﴾ (البقرۃ:259) ''کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے اس کی موت کے بعد!'' لیکن پھر اُمت مسلمہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا' صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ اُمتِ مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی نشاۃِ ثانیہ کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا' لیکن اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی' لہٰذا یہاں تجدیدِ ملت کا یہ کام ''آخرین''

کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مطابق نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالم اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی' بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالم اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی' اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جمایا' یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمہ داری سنبھالی' تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا اور اس طرح گویا عالم اسلام کے قلب کی عظمت و سطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی' اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اِدھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالمِ اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور ادھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں اُمتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دَور کا آغاز ہو گیا' جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں ''احیاء العلوم'' کا پورا عمل اسلام ہی کے زیر اثر شروع ہوا' اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ بڑھا' گویا عالم اسلام کی شامت آ گئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا' لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشاۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی' البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ ''مرنے والی اُمتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک کہ 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے' یعنی: ﴿كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھود:68و95) ''جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے''۔ اور: ﴿لَا يُرٰى إِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف:25) ''اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا!''

1498ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا' ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے' اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا' اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

اسی اثناء میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دَور سے گزر آئی تھی اور اب اُس نے بھی ''مردِ بیمار'' کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا' اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رُخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دَور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ: ((یُوشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ كَمَا تَدَاعَی الْاَكَلَةُ اِلٰی قَصْعَتِهَا)) یعنی ''ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے (کسی دعوتِ طعام میں) کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔''

اس طرح بحیثیت مجموعی اُمتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دَورِ ثانی اس صدی کے ربع اوّل میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا جب کہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا' اگرچہ خاص ''امّیین'' کے حق میں ''وَعْدُ الْاٰخِرَةِ'' کی وہ مکمل صورت جو سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 7 میں بیان ہوئی تھی' تقریباً نصف صدی بعد 1967ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب وملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی' اور عربوں کے عہد تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا' اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہو گا۔ اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اُمتِ مسلمہ کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا' اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا' نتیجتاً عالمِ اسلام کا قلب دولخت ہو گیا اور وحدتِ ملی کی علامت یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالمِ عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالمِ عرب کے کامل اتحاد کا امکان

تا حال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی اُمتِ مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾(الانعام:65) ''تمہیں (اللہ تعالیٰ) گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ''۔ چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر 1971ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِي الْأَبْصَارِ○﴾

☆☆☆

بیسویں صدی عیسوی: سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں

بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اس کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے پرزے اڑ گئے اور اواخر میں عظیم سوویت یونین کی دھجیاں بکھر گئیں' لیکن ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم اُمتوں' یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ضمن میں دو بالکل مخالف اور متضاد کیفیات کا عمل دخل بالکل اسی شان کے ساتھ جاری رہا جو سورۃ الرحمن کی آیات 19'20 میں بیان ہوئی ہیں' یعنی: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ (19) بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (20)﴾ ''چلائے دو دریا ایک دوسرے سے متصل' لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتے''۔ یعنی ایک جانب ان دونوں پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آ رہا تھا' لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی اُمتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کی جو تفصیل بیان ہو چکی ہے اس کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار برس قبل عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے' اس لیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے' جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت 49 اور سورۃ الصف کی آیت 6 میں صراحتاً مذکور ہے' لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا' بلکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ سلام اللہ علیہا پر بدکاری کا الزام عائد کیا' اور خود آنجناب علیہ السلام کو جادوگری اور ارتداد کے الزامات کے تحت واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور (انجیل برناباس کے مطابق) آپ علیہ السلام کی صورت میں درحقیقت آپ علیہ السلام کے اس غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کو سولی چڑھوا دیا جس نے سونے کے تیس سکوں کے عوض مخبری کر کے آپ علیہ السلام کو گرفتار کرایا تھا۔ تاہم ایک خاص حکمت کے تحت (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مؤخر رکھا۔

سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی آیت 8 سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے یہود کو بھی ایک موقع توبہ کا عنایت فرمایا تھا' بفحوائے: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ج وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ یعنی ''تمہارا رب اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لیے آمادہ ہے' لیکن اگر تم نے سابقہ روش برقرار رکھی تو ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں!'' یہ گویا جدید عدالتی

اصطلاح میں ایک رحم کی اپیل کا آخری موقع تھا جو یہودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث گنوا دیا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرما دیا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾

(الاعراف:167)

''اور جب اعلان کر دیا تیرے ربّ نے کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر لازماً ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیتے رہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا سب سے نمایاں مظہر اس بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا جب ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ مشرقی یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ایسے سپیشل گیس چیمبرز اور ایکسٹرمی نیشن پلانٹس کے ذریعے نیست و نابود کیا جن کی نظیر غالباً پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری جانب یہ معجزہ بھی اسی بیسویں صدی میں ظاہر ہوا کہ جو ملعون و مغضوب قوم دو ہزار برس سے در بدر بھٹک رہی تھی اور کہیں امان نہیں پا رہی تھی اسے دوبارہ اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی فلسطین میں پاؤں جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں سے جو بغاوت ترکوں کے خلاف کرائی تھی' جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عظیم سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانانِ عالم کی وحدتِ ملی کا نشان یعنی خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا' اس کا ''انعام'' انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے 2 نومبر 1917ء کے ''اعلانِ بالفور'' کی صورت میں ملا' جس کے نتیجے میں پہلے سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری ہوئی اور بالآخر 1948ء میں اسرائیل کا خنجر اُن کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ گویا کہ یورپی استعمار کی صورت میں موجودہ اُمت مسلمہ پر اللہ کی جو سزا گزشتہ تین صدیوں سے تدریجاً بڑھ رہی تھی اُس کے آخری اور شدید ترین دَور کا ''آغاز'' ہو گیا۔ یعنی اُمت مسلمہ کے افضل ترین حصے یعنی عربوں پر اللہ کی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا' جس کی پہلی قسط تو 1948ء ہی میں مل گئی تھی جب انگریزی فوج کے فلسطین سے نکلتے ہی عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہو گئی' جس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچتا' وہ اس رقبے سے بھی زیادہ پر قابض ہو گئے جو انہیں تقسیم کے فیصلے کے تحت ملا تھا۔

''امیین'' پر اللہ کے عذاب کا دوسرا اور شدید تر کوڑا لگ بھگ بیس برس بعد 1967ء کی چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت آمیز ہی نہیں' حد درجہ شرمناک شکست کی صورت میں پڑا' جس کے نتیجے میں 1948ء میں قائم ہونے والے اسرائیل نے ''عظیم تر اسرائیل'' کی جانب مزید پیش قدمی کر لی اور مصر و شام اور اردن سے اضافی علاقے ہتھیا لیے---اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مذہبی مرکز یروشلم پر بھی قبضہ حاصل کر لیا۔ ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!''

قصہ مختصر، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کے آخری عذابِ استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں سامنے آ گیا' اور دوسری طرف ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہو گئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہی معاملہ موجودہ اُمت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے' اور پھر 1967ء میں عربوں کی عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور 1971ء میں ''آخرین'' کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست و ریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذابِ الٰہی کے سائے مزید گہرے ہو گئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی' وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس صدی کے ربع اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جب اُمت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ درد انگیز صدا ایک تلخ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی کہ۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

رحمتِ خداوندی مین جوش آ چکا تھا اور تاریخ بالقوہ ایک کروٹ لے چکی تھی' جس کے نتیجے میں پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہو گیا' جس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بہت ضروری ہے' تاکہ مایوسی کے سائے زیادہ گہرے نہ ہوں اور حالات کے تاریک رُخ کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے' بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں' جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں' اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں' بلکہ سورۃ الانشقاق کی آیت: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (19)﴾ یعنی ''تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ'' کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے' اور چاہے بعد کے مراحل میں پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے' اپنے اپنے دَور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ

مسلّم ہے' بقول علامہ اقبال:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

اس احیائی عمل کا اوّلین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہِ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے' اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی وتکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں' تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی ومحکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی ونظریاتی اور تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے تو ''مسلمان اقوام'' کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے' اس لیے کہ از روئے قرآن وحدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی' لیکن واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمت یا حزب کا کردار تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملّی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا' لیکن اس صدی کے ربع اوّل کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا' اور اِس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک اُمت مسلمہ آباد نہیں ہے' بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ''نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے'' کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھیے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا' ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور ﴿يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (محمد:38) یعنی ''بدل دے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو'' کی شان دوبارہ ظاہر ہو---لیکن بحالاتِ موجودہ تو ع ''کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے'' کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں باہم لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات مسلمان اقوام کا آزادی وخود مختاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے' اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہی

کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا' تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ((اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ هٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ)) یعنی ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے اِس دین کی خدمت غیر متقی انسانوں سے بھی لے لیتا ہے''۔ (بخاری' کتاب الجہاد' عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے' لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا' اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا۔ اور حصولِ استقلال کے لیے جس مؤثر مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام و نشان بھی صفحہ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اِس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں! اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لیے واحد ممکن بنیاد بن سکتا تھا' اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے' بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے' اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملّی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لیے بھی وجہ جواز موجود تھی۔ (چنانچہ جمعیت علماء ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی' بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ مسلمانانِ پنجاب کو ''سکھا شاہی'' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ''مسلم قومیت'' کی اساس پر کیا' جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح جو اپنا نام ''سلمان بن اسلام'' بتایا کرتے تھے' صرف اور صرف ''فرزندِ اسلام'' قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام کے لیے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ'' کے مصداق اپنی پیدائش اور ہیئت ترکیبی کے

اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رُخ پر ڈالنے والے اسباب وعوامل میں سلبی ومنفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو اُن کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ممد ومعاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ۔

تُو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے!

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخ خلافت پر جس قدر شدید ردِّ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا' حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی ''تحریک خلافت'' بن گئی تھی، اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُردرد اور پُرتاثیر حُدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید واحیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو 1974ء میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز تھا' جہاں قریباً نصف صدی قبل قراردادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حُدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ:

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر
دلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرمِ کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ومشغول ہیں' اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر پاک وہند کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ علمائے دین کو جس قدر اثر ورسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا' اور راسخ العقیدہ اسلام

جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔ (1968ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمن مرحوم کی کتاب ''اسلام'' کے خلاف ہوا تھا اور پھر 1974ء میں جو معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں) حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی' جہاں اس صدی کے وسط تک محمد بن عبدالوہابؒ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں' اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے' اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سال کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی' اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اُسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سرِ نو مضبوط ہو گئی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ اس طرح ان کی خدمات کو سابق مجددین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے' اس لیے کہ جملہ مجددین اُمت کی مساعی کی اصل نوعیت بھی احیاءِ دین یا اقامت دین کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعت دین ہی کی تھی' اور یہ اس لیے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا' اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو' بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور قانونی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار تھا' حتیٰ کہ شریعت اسلامی اکثر مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجدّدین اُمت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان تک ہی محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو اُن کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی' اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق و اعمال' تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجدّدِ دین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔

اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ''خروج'' یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرما دی تھیں' اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ''کفر بواح'' یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی اُن کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی---- یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت

مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی' دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی' جس کی سب سے شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدین رحمہا اللہ ہے۔ عالم عرب میں اس کی متوازی تحریکوں کے طور پر مہدی سوڈانی اور شیخ سنوسی کی مساعی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

البتہ یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عہد حاضر میں' بالخصوص برعظیم پاک و ہند میں' علماء کرام کی خدمات دو اعتبارات سے اصلاح طلب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلید جامد کا دَور دَورہ ہوا اور تشتت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جما لیے' ہر فرقے کے علماء کرام دین کے نظامِ عقائد و اَعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو اُن کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے' جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دَور میں امام غزالی رحمہ اللہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کیا تھا' لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دورِ حاضر میں علماءِ دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے' البتہ کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے' اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برعظیم میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے "فکر" کا نہ سہی "علم" کا وارث ضرور ہے' اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائق ایمانی پر مرکوز کر دیا' اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ' خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی' بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد "جماعت تبلیغی" سے ہے جس نے اس دَور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں' دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے' اور جس کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہرحال "تجدید ایمان" کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے' اور جسے بلاشبہ زیر بحث ہمہ جہتی احیائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں بعض دوسرے مذہبی حلقوں نے بھی اسی طرز پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس سے فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو بلکہ ایمان کی باطنی کیفیات اور شعائر اسلامی کی پابندی کو تقویت حاصل ہو۔

اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں' لیکن ''ہے ایک ہی جذبہ' کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم!'' (جناب نعیم صدیقی) کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دَور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر ونفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برعظیم پاک وہند ہی کو حاصل ہے۔

برعظیم میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے' جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے ''حکومتِ الٰہیہ'' کے قیام اور اس کے لیے ایک ''حزب اللہ'' کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے' خصوصاً تحریک خلافت کے دوران میں' اُن کی شہرت کو برعظیم کے طول وعرض میں پھیلایا اور اُن کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کرلیا' لیکن اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر' جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے' انہوں نے دفعۃً اس عظیم مشن کو خیر باد کہہ کر انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کرلی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کردی۔ (راقم نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنی تالیف ''جماعت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ'' میں کی ہے۔)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے' لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں' اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام کا نصب العین اور ''تجدید واحیائے دین'' کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کردیا' اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر واستقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا' پھر کچھ عرصہ ''دارالاسلام'' کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خاں نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا' اور بالآخر 1941ء میں ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کردیا۔

سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے عالم اسلام میں علمی وثقافتی مراکز دو ہی رہے ہیں' عالم عرب میں مصر

اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں بھی ان ہی دو ملکوں سے اٹھیں۔ لیکن تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات تمام عرب ممالک تک پہنچ گئے جن میں کم و بیش بیس پچیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اور ہندوستان تو تھا ہی ایک برعظیم جس کے چار ٹکڑوں میں (اس لیے کہ اب کشمیر بھی بالقوہ تو بھارت سے جدا ہو ہی چکا ہے) لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں' جن کی نوجوان نسل کا معتدبہ حصہ تحریک اسلامی کے زیر اثر آیا ہے۔ ایران کا معاملہ خود اپنی جگہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس صدی کے آغاز تک وہ باقی مسلم دنیا سے الگ تھلگ گویا اپنے ہی خول میں بند تھا۔ پھر دوسرے ممالک کی احیائی تحریکوں کی فہرست میں ایران کے ''فدائین'' کا بھی ذکر سنائی دیا' لیکن اس کے بعد پھر کچھ خاموشی سی طاری رہی' تا آنکہ اچانک ایک طوفان کی سی کیفیت کے ساتھ ایران میں انقلاب آیا اور وہ بعض اعتبارات سے تو پوری مسلم دنیا سے آگے نکل گیا۔

مزید برآں ان تمام مسلمان ممالک سے جو نوجوان ساٹھ کی دہائی میں حصولِ تعلیم کے لیے امریکہ' انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک گئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے ان کے ذریعے ان تحریکوں کے اثرات مغربی دنیا میں بھی قابل لحاظ و احساس حد تک پہنچ چکے ہیں' چنانچہ مغرب ان ہی کو ''مسلم فنڈامنٹلسٹ'' کے نام سے پکار رہا ہے اور ان سے اپنی ''مثالی'' تہذیب و تمدن کو خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ (فرعون نے بھی سورۃ طٰہٰ کی آیت 63 کی رو سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اپنی ''مثالی'' تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا تھا) اور اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں' جیسے مثلاً عالم عرب میں مصر اور اردن میں بحیثیت مجموعی تو اِخوان نے پُرامن میانہ روی اختیار کی اور سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اپنی پیش رفت کا ذریعہ بنایا' لیکن ان ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے زیادہ ریڈیکل عناصر نے تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیا' جیسے مصر کی کچھ عرصہ قبل کی ''التکفیر والہجرۃ'' اور حالیہ ''جماعۃ اسلامیۃ''۔ (اکتوبر 1979ء میں راقم نے قاہرہ میں اخوان کے مرشد عام عمر تلمسانی مرحوم سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ ''التکفیر والہجرۃ'' اخوان ہی کے لوگ ہیں جو ہم سے علیحدہ ہو کر دہشت گردی کے راستے پر چل نکلے ہیں۔) اسی طرح اردن ہی کے تقی الدین نبہانی مرحوم نے کہیں زیادہ ریڈیکل ''حزب التحریر'' کی بنیاد رکھی۔ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاءِ اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

الغرض' بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب تو سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے' لیکن دوسری جانب یہود کی بھی دو ہزار

سالہ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور وہ صہیونی تحریک کی زیر قیادت ''ارضِ موعود'' میں قدم جما کر عظیم تر اسرائیل کے قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کی جانب پیش قدمی کے لیے پر تول رہے ہیں' اور خود مسلمان بھی مغربی استعمار کی کم از کم براہِ راست غلامی سے نجات پا کر (اس لیے کہ ابھی ریموٹ کنٹرول غلامی بتمام وکمال موجود ہے) اپنے دین کے احیاء اور اسلامی نظامِ حیات کے بہمہ وجوہ قیام ہی نہیں' عالمی غلبہ دین کے خواب دیکھ رہے ہیں' اور اس صدی کی آخری دہائی کے بقیہ حصے میں جو عظیم واقعات وحوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو اُمتوں کی آخری آویزش کارفرما ہوگی' اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری اُمت ادا کرے گی جو ابراہیمی مذاہب کے ''ثالث ثلاثہ'' یعنی تین میں کے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس سے قبل کہ مستقبل کے واقعات وحوادث کے بارے میں کچھ بات کی جائے' کسی قدر گفتگو اس تیسری اُمت کے بارے میں ضروری ہے۔

ابراہیم مذاہب کا ''ثالث ثلاثہ''

''ثالث ثلاثہ'' کے الفاظ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ کی آیت 73 میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں، یعنی ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ ''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے!'' ''ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ'' (''تین میں کا تیسرا'') کے ان الفاظ میں ایک طنز اور تعریض مضمر ہے، جس کے فہم کے لیے اس حقیقت کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اگرچہ تمام مشرکانہ مذاہب کے عقائد میں یہ قدرِ مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ اوپر ایک بڑے خدا کو مان کر اس کے نیچے بہت سے چھوٹے خداؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن پھر اصل خدائی چھوٹے خداؤں ہی کی ہوتی ہے، بڑا خدا تو بس ایک ''دستوری سربراہ'' بن کر رہ جاتا ہے (جیسے ٹھیٹھ پارلیمانی نظام میں صدرِ ریاست!) چنانچہ ہندوؤں کے نزدیک ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے جب کہ دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں۔ اسی طرح یونانی اور رومی میتھالوجی میں ''G'' سے لکھا جانے والا ''God'' تو ایک ہی ہوتا تھا، لیکن ''g'' سے لکھے جانے والے gods اور godesses اَن گنت تھے۔ اسی طرح اہل عرب اللہ کو تو واحد بھی مانتے تھے اور بلاشرکت غیرے کل کائنات کا خالق اور مالک بھی تسلیم کرتے تھے، لیکن ان کے نزدیک اس کے تحت ''اِلٰہ'' بہت سے تھے جن کو اللہ نے جملہ اختیارات تفویض کر دیے تھے۔ لیکن، جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا، پھر اصل پوجا پاٹ، چڑھاوے اور نذرانے چھوٹی دیویوں اور دیوتاؤں اور گاڈز اور گاڈیسز اور ہبل یا لات و منات اور عُزّیٰ ہی کے لیے ہوتے تھے، بڑا خدا تو بس ''تین میں کا تیسرا'' بن کر رہ جاتا تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ابراہیمی مذاہب (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے ضمن میں عیسائیت کا ہے کہ وہ تعدادِ نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمی مذاہب میں سب سے بڑا مذہب ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمی مذاہب کی جانب اس کی نسبت صرف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے، ورنہ عقائد و نظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذہب ہے جس کا شمار ''فلسفیانہ مذاہب'' میں ہونا چاہیے نہ کہ ''آسمانی مذاہب'' میں، اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہیے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب۔

بہر حال ہم جس موضوع پر سلسلہ وار کلام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے اس مذہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمی اُمتوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دَور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ چنانچہ سابقہ ابراہیمی اُمت یعنی یہود پر چوتھی صدی عیسوی کے اوائل سے لے

کہ جب سلطنت روما نے عیسائیت اختیار کی تھی' بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط تک' گویا سولہ سو برس سے زائد عرصے تک' تشدّد وتعذیب' قتل وغارت' جلاوطنی اور ملک بدری کا سلسلہ مختلف عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں جاری رہا۔ (حالات وواقعات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس پورے عرصے کے دوران میں یہودیوں کو اگر کوئی سہولت یا سہارا حاصل ہوا تو صرف اُن مسلمانوں کی جانب سے جن کے وہ بدترین دشمن ہیں۔ چنانچہ انہیں کئی سو برس بعد یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کے ذریعے' پھر مکابی سلطنت کے زوال کے بعد یعنی لگ بھگ آٹھ سو برس بعد اگر انہیں کہیں امن وسکون اور چین کا سانس لینا نصیب ہوا تھا تو بنوعباس کے عہد خلافت میں' اور مسلم سپین کو تو اِن کے زعماء اور دانشور برملا طور پر اپنے دورِ جلاوطنی یعنی ''Diaspora'' کا ''عہد زریں'' قرار دیتے ہیں۔) اسی طرح موجودہ ابراہیمی اُمت یعنی اُمت مسلمہ پر بھی گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے مسلسل عذابِ الٰہی کے کوڑے عیسائیوں کے ہاتھوں پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ اوّلاً گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران صلیبیوں نے شام' فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا' چنانچہ 1099ء میں بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام تو تاریخ انسانی کے بدترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ پھر تیرہویں' چودہویں اور پندرہویں صدی کے دوران عیسائیوں نے تدریجاً ہسپانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کیا' تا آنکہ سولہویں صدی کے اوائل میں پورے جزیرہ نمائے آئی بیریا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹ گیا اور یورپ کے جنوب مغربی علاقے سے ''نسلی صفائی'' (Ethnic Cleansing) کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا (جو اَب پانچ سو برس بعد یورپ کے جنوب مشرقی کنارے یعنی بلقان کے علاقے میں ہو رہا ہے۔) بعدازاں یورپ کی عیسائی اقوام کا سیلاب واسکوڈی گاما کے دریافت کردہ بحری راستے کے ذریعے مشرقِ اقصیٰ کے مسلمان ممالک پر ٹوٹ پڑا' اور سترہویں' اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران جاوا' ملایا' سماٹرا اور ہندوستان سے مسلمان حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے بالآخر یہ سیلاب بیسویں صدی کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کو بھی بہا کر لے گیا اور پورا شرقِ اوسط اور شمالی افریقہ بھی عیسائی اقوام کے زیرنگیں آ گیا۔ بقول علامہ اقبال: ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل علیہ السلام
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

الغرض' یہودیوں کے لیے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کے لیے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اور' جیسے کہ سطورِ گزشتہ میں واضح کر دیا گیا تھا' اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے' جس کے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص ''واسپ'' (WASP) یعنی White Anglo-Saxon

Protestants یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار و سرپرست' اور بباطن ''فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے!'' کے مطابق زیرنگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور ''ترسم کہ دِگر خیزد'' کے مصداق اندیشہ ہے کہ عنقریب مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار ﴿حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ﴾ (الانبیاء:96) کی سی شان کے ساتھ عالم اسلام بالخصوص شرق اوسط پر ہونے والی ہے' جس کی صریح پیشین گوئیاں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں' اور جس کی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔ اور جس کے آئندہ بھیانک تر مرحلے کا جواز فراہم کرنے کے لیے ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کا ہوا کھڑا کیا جا رہا ہے' جس کے ضمن میں حال ہی میں ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (یوسف:26) کے مصداق امریکی پروفیسر ڈاکٹر اسپوزیٹو نے' حالیہ تالیف میں یہ ''سچی بات'' غالباً کسی ''مستی'' کے عالم میں کہہ دی ہے کہ ''مغرب یا عالم عیسائیت کو اسلام کی جانب سے کسی خطرے یا اندیشے کا واویلا بالکل بے جا اور غیر واقعی ہے' اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک عیسائی دنیا کو کبھی کوئی گزند اسلام کی جانب سے نہیں پہنچا' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے برعکس ہمیشہ عالمِ اسلام ہی کو عیسائی دنیا کی جانب سے نقصان پہنچتا رہا ہے۔''

لیکن اس سے قبل کہ ہم ''آنے والے دور کی'' صرف ''دھندلی سی اِک تصویر'' نہیں بلکہ وہ واضح تصویر دیکھیں جو احادیث میں موجود ہے' آیئے کہ پہلے موجودہ دنیا میں مذاہب کے اعتبار سے ''انسانی جغرافیہ'' پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر ابراہیمی مذاہب خصوصاً عیسائیت کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں۔

اِس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی ساڑھے پانچ یا پونے چھ ارب کے لگ بھگ ہے۔ (ماہرین کا اندازہ ہے کہ 2000ء میں یہ آبادی چھ ارب تیس کروڑ ہو جائے گی) ☆ اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمی مذاہب کی پیروکار ہے۔ چنانچہ شکاگو کی عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ ''نیشنل کانفرنس'' نے 1990ء میں جو ''انٹر فیتھ کیلنڈر'' شائع کیا تھا اس کے مطابق اب سے تین سال قبل دنیا میں یہودیوں کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم' مسلمانوں کی ایک ارب سے زائد اور عیسائیوں کی پونے دو ارب کے لگ بھگ (اینگلی کن چرچ سات کروڑ' کیتھولک نوے کروڑ' آرتھوڈوکس تیرہ کروڑ اور پروٹسٹنٹ تریسٹھ کروڑ) تھی (واضح رہے کہ یہ تحریر 1993ء کی ہے۔ اِس وقت دنیا کی آبادی چھ ارب ستر کروڑ ہو چکی ہے۔ 2008ء)۔ اس میں اگر ان دو عوامل کا اضافہ کر لیا جائے کہ اوّلاً یہودیوں اور عیسائیوں میں تو آبادی کا اضافہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے' جبکہ مسلمانوں کے بارے میں مسلّم ہے کہ ان کی آبادی میں شرحِ اضافہ بہت زیادہ ہوتا ہے' اور ثانیاً مسلم اقلیت والے ممالک (بالخصوص بھارت) میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھائی جاتی ہے' تو محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں ایک ارب تیس کروڑ (بعض لوگوں کے خیال میں پونے دو ارب) مسلمان موجود ہیں (واللہ

اعلم)۔ مذکورہ بالا کیلنڈر کے مطابق 1990ء میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی، یعنی پینسٹھ کروڑ سے زائد' پھر بدھ مت کے پیروکار تھے' یعنی پچیس کروڑ کے لگ بھگ' پھر سکھ تھے' یعنی تقریباً پونے دو کروڑ' اور باقی صرف لاکھوں میں۔ ان میں بھی تین سال کے عرصے کے دوران کا اضافہ شامل کرلیا جائے اور پھر اس میں ایک ارب کے قریب لا مذہب یا نیچر وَرشپ والے لوگوں کو جمع کرلیا جائے تو کُل حاصل جمع وہی بن جاتا ہے جو اوپر دیا گیا۔

قرآن حکیم پر ایمان اور قرآن کے فلسفۂ تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اِس دم تک دین برحق اسلام ہی رہا ہے' اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں' لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقولِ جگر مرادآبادی ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!'' البتہ صرف دو مذہب وہ ہیں جن کا اصل ''اسلام'' کے ساتھ تعلق اور تسلسل کم از کم تاریخی اعتبار سے ثابت ہے' یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے' ان میں سے بھی اصل مسلمان اُمتیں دو ہی ہیں' یعنی سابقہ اُمت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہوگا' لیکن مستقبل قریب میں ابتداءً نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمی مذاہب کے ''تین میں کے تیسرے'' مذہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔ لہٰذا ان کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

موجودہ عیسائی مذہب اگرچہ ان چار بڑے بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (بلکہ ان کی مزید تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت بائیس ہزار سے زائد ''چرچ'' وجود میں آ چکے ہیں)' تاہم ان سب کے مابین تثلیث' صلیب اور کفارہ کے عقائد متفق علیہ ہیں۔ قرآن حکیم تثلیث کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہی ہے' اس خیال کی بھی پُرزور تردید کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھائے گئے جہاں ان کی موت واقع ہوئی' جس سے کفّارے کا عقیدہ بھی خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ اگرچہ صلیب کا واقعہ تو اناجیل اربعہ میں موجود ہے' لیکن تثلیث یا ابنیتِ مسیح کے عقیدے کی کوئی بنیاد ان میں ہرگز موجود نہیں' اور ان کا اوّلین سراغ تو اگرچہ سینٹ پال کی تحریروں میں مل جاتا ہے' تاہم انہیں باضابطہ اور سرکاری طور پر طے شدہ عقائد کی حیثیت بہت بحث و تمحیص اور جدل و نزاع کے نتیجے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لگ بھگ تین سو برس بعد حاصل ہوئی' اور اس عرصے کے دوران موحدین اور تثلیث کے قائلین کے مابین شدید خون خرابہ بھی ہوا۔ جہاں تک حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے' چند امور تو وہ ہیں جو ایک جانب قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہ ﷺ اور دوسری جانب اناجیل اربعہ کے مابین مشترک ہیں' لہٰذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین متفق علیہ عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں' جب کہ بعض امور ایسے ہیں جن میں

قرآن اور اناجیل تو متفق ہیں' لیکن سینٹ پال کی ترامیم کے باعث عیسائیت ان کی قائل نہیں' اور بعض امور ایسے بھی ہیں جو قرآن اور اناجیل کے مابین بھی مختلف فیہ ہیں۔ چنانچہ متفق علیہ امور تو یہ ہیں کہ:

1) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوئی' لیکن چونکہ اُن کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ عنہا اسرائیلی تھیں' لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام کا تعلق بھی بنی اسرائیل سے ہے۔

2) ان کے دست مبارک سے ایسے عظیم معجزے صادر ہوئے جن کی نہ کوئی دوسری مثال موجود ہے نہ ہی ان سے بڑے حسی معجزوں کا تصور ممکن ہے۔ جیسے مُردوں کو زندہ کر دینا' گارے سے پرندے کی صورت بنانا اور پھر اس میں پھونک مار کر اسے زندہ اور اُڑتا ہوا پرندہ بنا دینا' وغیرہ۔ (واضح رہے کہ قرآن حکیم معنوی اور ابدی معجزہ ہونے کے اعتبار سے ان جملہ معجزات سے افضل ہے' لیکن اس کا اعجاز صرف دل کی آنکھ اور عقل کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے' سر کی آنکھ سے نہیں!)۔

3) انہوں نے یہودیوں میں توبہ کی زبردست منادی کی اور انہیں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی زور دار دعوت دی' اور اس ضمن میں ان کے علماء' مفتیوں' قاضیوں اور ان کی ریاکارانہ مذہبیت پر شدید تنقیدیں کیں' چنانچہ مذہب کے یہ اجارہ دار طبقات آنجناب علیہ السلام کے شدید دشمن اور جان کے درپے ہو گئے۔

4) ان کی زور دار دعوت کا شور اور غلغلہ تو بہت بلند ہوا' اور یروشلم اور آس پاس کے علاقے کے یہودی عوام اس سے متاثر بھی بہت ہوئے' لیکن ان پر ایمان بہت ہی کم لوگ لائے اور ان میں سے بھی صرف چند حواری ایسے تھے جو ان کے دن رات کے ساتھی اور دل و جان سے فدائی تھے۔ (اناجیل کی رو سے ان کی تعداد بارہ تھی' اگرچہ مختلف اناجیل میں ناموں کا اختلاف ہے۔)

5) بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھا لیا اور قیامت کے قریب وہ دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل اور نہایت توجہ کے قابل ہے کہ دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ کے بارے میں ان پانچ امور پر متفق ہے' جن میں سے بعض باتیں نہایت غیر معمولی اور خالص خرقِ عادت یعنی دنیا کے عام طبعی قوانین کے بالکل برعکس ہیں!

اب آیئے ان دو نہایت اہم اور اساسی امُور کی جانب جن پر قرآن و حدیث اور اناجیل اربعہ تو متفق ہیں' لیکن سینٹ پال کی اختیار کردہ ترمیمی آراء اور اقدامات کی بنا پر موجودہ عیسائیت کا موقف اور طرزِ عمل ان سے مختلف ہی نہیں متضاد ہے۔ وہ دو امور حسب ذیل ہیں:

1) حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی نئی شریعت لائے تھے' نہ ہی انہوں نے شریعتِ موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو منسوخ کیا' بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی لائی ہوئی شریعت کی تجدید و توثیق اور بنی اسرائیل کی اخلاقی و روحانی اصلاح اور دین کی حقیقی روح کے احیاء کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ گویا وہ اپنی ذات کی حد تک سابقہ

اُمت مسلمہ ہی سے تعلق رکھتے تھے اور کسی نئے دین و مذہب یا ملت و اُمت کے بانی نہیں تھے۔ چنانچہ مشہورِ زمانہ تالیف "The 100" کے مؤلف ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جب تک حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں موجود رہے' آپ علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کے ساتھیوں کی حیثیت یہود ہی کی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ فرقے کے علاوہ کچھ نہ تھی! گویا موجودہ مسیحیت کے اصل بانی حضرت مسیح علیہ السلام نہیں' سینٹ پال ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ شریعت موسوی علیہ السلام کو عیسائیوں کے لیے منسوخ قرار دیا' بلکہ خود شریعت ہی کی کلی نفی کر دی اور اسے (معاذ اللہ) "لعنت" قرار دیا۔

2) حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ چنانچہ آنجناب علیہ السلام نے خود اپنی دعوت اور خطاب کو بھی صرف بنی اسرائیل تک محدود رکھا اور صاف فرمایا: "میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!" اور اپنے شاگردوں کو بھی سختی کے ساتھ منع فرما دیا کہ اپنی دعوت و تبلیغ کے دائرے کو بنی اسرائیل کے باہر وسعت نہ دیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی "انقلابی قدم" سینٹ پال ہی نے اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کی چالیس کی دہائی کے دوران اس معاملے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کے محدود حلقے میں شدید بحث و نزاع کا بازار گرم رہا' لیکن بالآخر فتح سینٹ پال اور ان کے حامیوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد عیسائیت کو اصل فروغ غیر اسرائیلی اقوام ہی میں ہوا' اور آج عیسائیوں میں نسلی طور پر بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تناسب آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی بہت کم ہے۔

آخر میں اس واحد اہم اور اساسی امر پر بھی نگاہ ڈال لیں جس کے معاملے میں ایک جانب قرآن و حدیث اور دوسری جانب اناجیل اربعہ میں واضح اختلاف بلکہ کھلا تضاد ہے---- یعنی یہ کہ اناجیل اربعہ کے مطابق یہودی علماء کے فتوے اور ان کی مذہبی عدالت کے فیصلے کے مطابق' بلکہ ان کے اصرار پر رومی حاکم پیلاطس پونٹس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا جہاں ان کی موت واقع ہو گئی' اگرچہ بعد میں جب کہ ان کا جسد خاکی ایک غار میں رکھا ہوا تھا' وہ زندہ ہو گئے اور اپنے بعض شاگردوں کو اپنی واپسی اور دوبارہ دنیا میں آنے کی نوید سنا کر آسمان پر چلے گئے۔ جب کہ قرآن حکیم ان کے مصلوب یا قتل ہونے کی شدت سے نفی کرتا ہے' اور صحیح اور مستند ترین احادیث صراحت کرتی ہیں کہ آنجناب علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے اور اس کے بعد ہی آپ علیہ السلام پر طبعی موت کا مرحلہ آئے گا۔ تاہم قرآن اور حدیث دونوں میں یہ تفصیل موجود نہیں ہے کہ آنجناب علیہ السلام کا رفع سماوی کب' کہاں اور کس مرحلے پر ہوا اور آپ علیہ السلام کی جگہ کون مصلوب ہوا۔ البتہ یہ خلا بتمام و کمال انجیل برنباس کے ذریعے پُر ہو جاتا ہے' یعنی عین اس وقت جب حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کی مخبری پر رومی سپاہی

آنجناب علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے اس باغ میں داخل ہوئے جہاں آپ علیہ السلام روپوش تھے' اللہ کے حکم سے چار فرشتے نازل ہوئے جو آنجناب علیہ السلام کو اٹھا کر لے گئے' اور اس غدار حواری کی صورت آپ علیہ السلام کے مشابہ بنا دی گئی۔ چنانچہ وہی گرفتار ہوا اور بالآخر مصلوب ہو کر کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

(واضح رہے کہ عیسائی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سینٹ برنباس حضرت مسیح علیہ السلام کے اوّلین مبلغین میں سے تھے' یہاں تک کہ ابتدا میں خود سینٹ پال کی حیثیت ان کے نائب کی تھی' لیکن متذکرہ بالا انجیل کی نسبت ان کی جانب درست نہیں سمجھتے' بلکہ اسے جعلی اور فرضی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ بکثرت موجود ہے لہٰذا عیسائی اسے کسی مسلمان کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس خیال کی تردید کے لیے صرف یہ ''قرائن کی شہادت'' کفایت کرتی ہے کہ اگر واقعتاً ایسا ہوتا تو اس انجیل کا تذکرہ مسلمانوں کے لٹریچر میں ہونا لازمی تھا' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا حوالہ پورے مسلم لٹریچر میں کہیں موجود نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی جملہ تفاسیر حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے وقت اور مقام کی تفاصیل اور اس سوال کے جواب سے خالی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جگہ کون شخص مصلوب ہوا؟ اس لیے کہ قرآن حکیم حضرت مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے' لیکن واقعۂ صلیب کی مطلق نفی نہیں کرتا۔)

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور تورات اور عہد نامہ قدیم کی دیگر کتابوں کی بائبل میں شمولیت کی بنا پر عیسائیت ابتدا میں یقیناً ابراہیمی مذاہب ہی کے سلسلے کی کڑی تھی' لیکن چونکہ زیادہ سے زیادہ تین سو سال بعد اس کی کامل قلب ماہیت ہو گئی تھی' چنانچہ موجودہ عیسائیت اپنے عقائد یعنی تثلیث' صلیب اور کفارہ کے حوالے سے اور شریعت موسوی علیہ السلام سے انقطاع کے باعث ایک بالکل علیحدہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے جو آسمانی مذاہب کے مقابلے میں فلسفیانہ مذاہب سے قریب تر ہے' لہٰذا اب اس کی بقیہ دونوں ابراہیمی مذاہب سے کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ ''آنے والے دَور'' میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول یا آپ علیہ السلام کی آمد ثانی بجائے خود بھی نہایت اہم واقعہ ہو گا اور اس پر مستزاد اہم ترین عالمی تبدیلیوں کی تمہید بنے گا (اگرچہ آنجناب علیہ السلام کے نزول یا آمد ثانی کا مقصد اناجیل سے واضح نہیں ہوتا' بلکہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے اور وہ قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جس پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے' تاہم اس پر مفصل کلام بعد میں ہو گا) مزید برآں' چونکہ اس سے بھی پہلے ایک جھوٹا' مکار اور دجال شخص حضرت مسیح علیہ السلام ہی کے نام پر دنیا میں عظیم فساد برپا کرے گا' جس کی واضح پیشینگوئیاں احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی موجود ہیں اور عہد نامہ جدید میں بھی' لہٰذا ضروری ہے کہ اناجیل اربعہ کے ساتھ تقابل سے قطع نظر' مثبت طور پر قرآن اور حدیث کے حوالے سے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت پر مزید روشنی ڈال دی جائے۔

(واضح رہے کہ متذکرہ بالا جھوٹے اور مکار شخص کو احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ''المسیح الدجال'' کا نام دیا گیا ہے' اور

عیسائی دنیا اسے ''Anti-Christ'' کے نام سے جانتی ہے۔ اور آج کل سولہویں صدی عیسوی کے ایک فرانسیسی نژاد یہودی النسل عیسائی درویش ''ناسٹرے ڈیمس'' کی پیشینگوئیوں پر مبنی ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے اس کا بہت چرچا مغربی دنیا میں ہو رہا ہے' اور اگرچہ عیسائی دنیا کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ قدیمی اور روایتی دشمنی کی بنا پر یہ پروپیگنڈا شد ومد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ یہ اینٹی کرائسٹ عرب مسلمانوں میں سے ہوگا' تاہم اس سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے ہوگا' یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تصور بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔)

بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آنجناب علیہ السلام اللہ کے محبوب بندے' برگزیدہ نبی اور جلیل القدر رسول تھے۔ بحیثیت نبی آپ علیہ السلام سلسلۂ انبیاءِ بنی اسرائیل کی آخری کڑی تھے اور بحیثیت رسول آپ علیہ السلام کی بعثت بھی بنی اسرائیل ہی کی جانب تھی۔ آپ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد دینِ موسوی علیہ السلام ہی کی تجدید و توثیق اور اس میں پیدا کردہ تحریفات کا ازالہ اور یہودیوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح تھا۔ مزید برآں آپ علیہ السلام ایک جانب ان پیشینگوئیوں کے مصدِّق و مصداق بن کر آئے تھے جو انبیاءِ بنی اسرائیل یہود کے ایک نجات دہندہ کے ظہور کے بارے میں کرتے آئے تھے' اور دوسری جانب آپ علیہ السلام خاتم النبیین اور آخر المرسلین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے مبشر اور منادی کرنے والے بن کر آئے تھے (الصف:6)۔ آپ علیہ السلام کی ولادت چونکہ بن باپ کے ہوئی تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اپنی جانب سے ایک خاص روح اور اپنا ایک خصوصی کلمہ قرار دیا جو آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کی جانب القاء کیا گیا' (النساء:171)۔ ولادت کے فوراً بعد آپ علیہ السلام سے یہ عظیم معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں سے بول کر اپنی والدہ ماجدہ کی پاکدامنی کی بھی گواہی دی اور اپنی نبوت و رسالت کا بھی اعلان کیا (مریم:29 تا 31)۔ پھر جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' آپ علیہ السلام کو عظیم ترین حسی معجزات عطا کیے گئے۔ گویا کہ بنی اسرائیل پر آپ علیہ السلام کے ذریعے آخری درجہ میں اتمامِ حجت کر دیا گیا' لیکن اس سب کے باوجود یہود کی اکثریت بالخصوص ان کے علماء نے آپ علیہ السلام کی تصدیق نہیں کی' بلکہ آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ پر بدکاری کی تہمت لگا کر آپ علیہ السلام کو (معاذ اللہ) ولد الزنا بھی قرار دیا اور جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر واجب القتل بھی ٹھہرایا' اور اپنے بس پڑتے تو آپ علیہ السلام کو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ''وہ نہ آپ علیہ السلام کو قتل کر سکے نہ صلیب دے سکے' بلکہ اللہ نے آپ علیہ السلام کا معاملہ ان کے لیے مشتبہ بنا دیا... اور انہوں نے آپ علیہ السلام کو ہرگز قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے آپ علیہ السلام کو اپنی جانب اٹھا لیا!'' (النساء:157'158) مزید برآں' قرآن نے بھی آپ علیہ السلام کو ﴿عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾ (الزخرف:61) ''قیامت کی ایک نشانی'' قرار دیا ہے' اور احادیث نبویہ ﷺ میں تو یہ بات تواتر اور غایت درجہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ

آپ علیہ السلام قیامت سے قبل نازل ہوں گے اور جھوٹے اور فریبی مسیح یعنی ''المسیح الدجال'' کو بنفسِ نفیس خود قتل کریں گے۔

''آنے والے دَور'' کی ایک دھندلی نہیں واضح تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو بھی تاریخی حقائق کے پس منظر میں سمجھ لیا جائے کہ یہ انقلابِ عظیم کیسے رونما ہوا کہ وہ یہودی جو ایک ہزار برس تک عیسائیوں کے نزدیک ارذل خلائق اور مبغوض ترین لوگ رہے اور ان کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتے رہے' رفتہ رفتہ اس پوزیشن میں آ گئے کہ اس صدی کے اوائل میں نابغۂ عصر اور ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز'' علامہ اقبال نے اپنے انگلستان اور جرمنی کے مختصر سے قیام کے دوران وہ حقیقت بچشمِ دِل دیکھ لی تھی جو آج پوری دنیا بچشمِ سر دیکھ رہی ہے' یعنی ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!''

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں واضح کیا ہے کہ ''ہم نے ان کے (یعنی یہود اور نصاریٰ کے) مابین قیامت کے دن تک کے لیے بغض اور عداوت پیدا کر دی ہے!'' (المائدۃ:14و64) قرآن حکیم پر یقین رکھنے والا ہر سنجیدہ طالب علم اس سے یہ دو نتائج لازماً اخذ کرے گا کہ اوّلاً یہودیوں اور عیسائیوں کا موجودہ ''گٹھ جوڑ'' محض ظاہری اور سطحی ہے اور ثانیاً اب دُنیا کا خاتمہ اور ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ﴾ کا مرحلہ زیادہ دور نہیں ہے' لیکن سرِدست اِن حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلقات کے تین اَدوار پر مرکوز کر دیجیے جن کا مختصر بیان حسب ذیل ہے:

1) پہلا دَور عیسوی تقویم کی پہلی تین صدیوں پر محیط ہے جن کے دوران پیروانِ مسیح علیہ السلام کی تعداد قلیل تھی (اور ان میں معتد بہ تعداد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل موحد پیروکاروں کی بھی شامل تھی) چنانچہ ان پر دو جانب سے تشدد ہو رہا تھا' یعنی ایک یہودیوں کی طرف سے اور دوسرے بت پرست رومیوں کی جانب سے۔

2) اس صورتِ حال میں انقلاب چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں آ گیا جب سلطنت روما نے عیسائیت قبول کر لی۔ لہٰذا اب معاملہ برعکس ہو گیا اور یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور انہیں بدترین تشدد اور تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس لیے کہ وہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کے قاتل تھے' جن کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کا ''غلو'' (النساء:171) اس درجہ شدید تھا کہ انہیں الوہیت میں شریک کر دیا تھا۔ یہ دَور کم وبیش ایک ہزار سال تک جاری رہا۔

3) اِس صورت حال میں جو انقلاب تدریجاً برپا ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر یہودیوں اور عیسائیوں کا وہ ''گٹھ جوڑ'' پیدا ہوا جس کی پیشگی خبر قرآن حکیم نے ﴿بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاۗءُ بَعْضٍ﴾ (المائدۃ:51) کے الفاظ میں دے دی تھی' وہ یہودی سیاست اور ذہانت کا شاہکار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کو آلۂ کار بنایا۔ چنانچہ پہلے انہوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی' اس لیے کہ ہسپانیہ کے عیسائی ان کے بدترین دشمن تھے اور انہیں توہین وتذلیل ہی نہیں تشدد وتعذیب کا نشانہ بنا

رہے تھے‘ اور دنیا کا مسلّم اصول ہے کہ کسی کے دشمن کا دشمن اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ وہ نکلا جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے‘ یعنی مسلم سپین ان کے لیے امن اور عافیت کا گہوارہ بن گیا۔ چنانچہ اسی سرزمین کو انہوں نے عیسائیت کے قلعے میں نقب لگانے کے لیے استعمال کیا اور غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم کے جو سوتے پھوٹ کر فرانس اور جرمنی کی جانب بہہ نکلے ان پر ”لبرلزم“ کے عنوان سے ذہنی وفکری آوارگی اور اخلاقی وعملی بے راہ روی کے اضافی ردے چڑھا کر یورپ کے عیسائی معاشرے میں اپنے اثر ونفوذ کی راہیں ہموار کر لیں‘ اور پھر جب اوّلاً احیاء العلم (Renaissance) اور اصلاحِ مذہب (Reformation) کی تحریکوں‘ اور بالآخر پوپ کے اختیارات اور کلیسا کے اقتدار کے خلاف احتجاج (protest) کی تحریک کے نتیجے میں پاپائیت کی گرفت کمزور پڑی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف ممالک میں اس سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی جو اس سے قبل عیسائی یورپ میں مطلقاً حرام اور ممنوع تھا۔ اور اس طرح ایک جانب فکری و اخلاقی آوارگی کے جال‘ اور دوسری جانب سودی معیشت کے چنگل میں پھنسا کر یہود نے یورپ کے عیسائی معاشرے پر اپنی وُہ گرفت مضبوط کر لی جو رفتہ رفتہ شدید سے شدید تر ہو کر بالآخر آج اس صورت میں موجود ہے کہ پورے عالم عیسائیت پر فیصلہ کن غلبہ ”واسپ“ (Whit Anglo-Saxon Protestants) کا ہے‘ جن کے مضبوط ترین گڑھ انگلستان اور امریکہ ہیں... اور خود اُن کے سر پر سوار ہے صہیونیت کی بدنامِ زمانہ یہودی تحریک۔ چنانچہ یہ اسی کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ دو ہزار سال سے قائم شدہ عقیدے کے برعکس چند سال قبل پاپائے روم نے ایک خصوصی حکم نامے کے ذریعے یہودیوں کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے الزام سے بری کر دیا... ”کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!“ واقعہ یہ ہے کہ ”جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!“ کی اس سے زیادہ نمایاں مثال دنیا کی پوری تاریخ میں شاید ہی کبھی سامنے آئی ہو!

(سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

فلسطین کا تاریخی پس منظر اور اس کا ہولناک مستقبل

ڈیڑھ سو برس تک فلسطین یہودیوں سے خالی رہا۔ اس کے بعد ایران کا بادشاہ سائرس منظر عام پر آیا‘ جس نے عراق پر حملہ کر کے نمرود کو شکست دی اور یہود کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی تحریک کے ذریعے بنی اسرائیل کی purgation کی گئی اور مشرکانہ اعمال سے ان کو پاک کیا گیا۔ معبد سلیمانی کو انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا اور اسے Second Temple کا نام دیا۔ اس کے بعد ان پر یونانی حملہ آور ہوئے‘ سکندر اعظم یہیں سے گزر کر انہیں تہس نہس کرتا ہوا پنجاب تک آیا اور اس کے سپہ سالار سلیوکس کی ان پر حکومت رہی۔ کچھ عرصے بعد رومیوں نے یہاں پر حکومت قائم کر لی۔ البتہ انہوں نے براہِ راست قبضہ نہیں کیا بلکہ وہاں پر مقامی بادشاہتیں رہنے دیں۔ بہر حال اس زمانے میں ایک عظیم مکابی

سلطنت قائم ہوئی، جس نے 170 ق م سے لے کر 63 ق م تک پھر بالکل وہی نقشہ دکھا دیا جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے زمانے کا تھا۔ یہ 100 برس ایسے ہیں کہ پورے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ رہا۔ پھر ان کے اندر زوال آیا اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو ان پر مسلط کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اس زمانے میں مبعوث کیے گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا کفر کیا۔ انہیں 33 یا 34 عیسوی میں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو یوں سزا دی کہ 70ء میں ایک رومن جنرل ٹائٹس نے ان پر حملہ کیا اور یروشلم کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سیکنڈ ٹیمپل گرا دیا گیا۔ 70ء سے آج 2004ء تک 1934 برس سے یہودیوں کا خانہ کعبہ گرا ہوا ہے۔ ٹائٹس نے ایک دن میں ایک لاکھ 33 ہزار یہودی یروشلم میں قتل کیے اور 66 ہزار کو وہ قیدی بنا کر یورپ لے گیا۔ یہودیوں کو فلسطین سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ 1917ء تک یہودی فلسطین سے بے دخل رہے ہیں۔

یہ ساری داستان میں نے آپ کو اس لیے بتائی ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ فلسطین کی سرزمین اللہ نے ہمیں دی ہے اور اس پر ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج بدقسمتی سے لبرل مسلمان، یہاں تک کہ میں حیران ہوں کہ بعض وسیع النظر علماء بھی ان کے اس دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لیے قرآن کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ "تمہارے لیے یہ ارضِ مقدس لکھ دی گئی ہے۔" لیکن اُس وقت یہ چیز اس سے مشروط تھی کہ اگر جہاد کر کے فتح کرلو گے تو یہ تمہاری ہوگی۔ جب انہوں نے جہاد و قتال نہیں کیا تو یہ وعدہ ختم ہوگیا۔ بہر حال ان کا حق نہیں ہے یہاں پر۔ وہ دو ہزار سال پہلے نکال دیئے گئے تھے۔ پوری دنیا میں ان سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی یورپ کے اندر انہیں ستایا اور مارا جاتا تھا۔ ان کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوتی تھیں، صرف دو گھنٹے کا وقت مقرر تھا کہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لیے آجا سکتے ہو۔ یہ حال تھا ان کا!

فلسطین پر یہودیوں کے دعوے میں عیسائیوں کا بھی ایک بہت بڑا اور مؤثر حلقہ ان کے ساتھ ہے۔ عیسائیوں کو دو فرقوں یعنی کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس میں تقسیم کرنے والے بھی یہودی تھے، ورنہ پہلے سب عیسائی ایک پوپ کو ماننے والے تھے۔ پوپ کے خلاف بغاوت یہودیوں نے کروائی اور سب سے پہلے اس کا ظہور انگلستان میں ہوا۔ انگریزوں نے اپنا چرچ "چرچ آف انگلینڈ" کے نام سے علیحدہ کرلیا، جو پوپ کے تحت نہیں تھا۔ سب سے پہلا پروٹسٹنٹ ملک بھی برطانیہ تھا اور وہیں پر یہودیوں نے سب سے پہلا "بینک آف انگلینڈ" قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی بینک نہیں تھا۔ کوئی سودی معاملہ نہیں تھا۔ پوپ کے زیر اثر کسی بھی علاقے میں سود کی اجازت نہیں تھی۔ یوں پروٹسٹنٹس یہودیوں کے آلۂ کار بن گئے۔ 100 سال پہلے تک پروٹسٹنٹس کا امام برطانیہ تھا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہ جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔ عیسائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ارضِ فلسطین سے ان کا بھی تعلق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں پیدا ہوئے، وہ مقام بیت اللحم ہی تھا۔ پھر جہاں

انہوں نے تبلیغ کی وہ سارا علاقہ فلسطین ہی کا تو ہے۔ پھر عیسائیوں کے قول کے مطابق اسی یروشلم شہر کے اندر انہیں صلیب دی گئی۔ تو عیسائیوں کی نظر میں فلسطین مذہبی اعتبار سے ان کا اہم ترین اور مقدس ترین علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ایک ہزار سال بعد انہوں نے ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے واگزار کرانے کے لیے کروسیڈز شروع کیں۔ ان کروسیڈز کے اندر انتہائی خون ریزی ہوئی اور بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثر بستیاں تباہ و برباد ہو گئیں۔ 1099ء میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کر لیا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ یورپی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین کے گھوڑے یروشلم میں داخل ہوئے تو ان گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ مسلمانوں پر ایسا عذاب آیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اٹھاسی سال بعد 1187ء میں اُس نے ایک مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبی کو اٹھایا۔ انہوں نے عیسائیوں کو شکست دی اور یروشلم واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی تین چار کوششیں ہوئی ہیں۔ کروسیڈز ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہوئے ہیں۔ تاہم اب امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائی کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ کن صلیبی جنگ شروع ہونے والی ہے جب مسلمانوں کے ایک ایک بچے کو فلسطین سے نکال دیا جائے گا اور یہ زمین پاک کر دی جائے گی۔ The Philadelphia Trumpet کی اشاعت بابت اگست 2001ء میں اس کے ایڈیٹر کی طرف سے یہ عبارت شائع ہوئی ہے کہ ''اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ صلیبی جنگ ماضی کی بات ہے جو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی۔ لیکن وہ غلط سمجھتے ہیں۔ آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں اور وہ سب سے زیادہ خون ریز ہوگی۔''

اب مستقبل کیا ہے؟ آئندہ کے حالات سامنے آ گئے ہیں۔ سن 70ء سے نکالے ہوئے یہودی جن کی انتہائی persecution ہوئی ہے۔ پہلے کروسیڈز میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے اس کے برابر یہودیوں کا بھی ہوا ہے، کیونکہ عیسائیوں کو یہودیوں سے بھی شدید نفرت تھی۔ ایک قوم (عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتی ہے جبکہ دوسری (یہود) انہیں حرام زادہ واجب القتل کافر اور مرتد ٹھہراتی ہے (نعوذ باللہ)۔ تو ان دونوں قوموں میں کوئی مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تاریخ کا معجزہ ہے۔ یہ یہودیوں کی محنت جدوجہد کوشش سازشی انداز منصوبہ بندی اور دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عیسائیوں کو جو یہودیوں کے خون کے پیاسے تھے اور ان سے انتہائی نفرت کرتے تھے رفتہ رفتہ دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ پروٹسٹنٹس کو انہوں نے اپنا آلہ کار بنایا اور آج پوری عیسائی دنیا ان کے قبضہ قدرت میں ہے۔

یہودیوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ ''آرمیگاڈان'' کی ایک خبر دی گئی ہے کہ بہت بڑی جنگ ہوگی۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ جلد از جلد ہو جائے جس کی حدیث میں بھی خبر ہے الملحمۃ الکبریٰ۔ تاریخ انسانی کی یہ سب سے بڑی جنگ کئی سالوں پر پھیلی ہوگی۔ یہ جنگ اگرچہ چھوٹے سے علاقے میں ہوگی لیکن خون ریزی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ کی کوئی جنگ اس کے مساوی نہیں ہوگی۔ تو یہود چاہتے ہیں کہ پہلے تو آرمیگاڈان کے نتیجے

میں گریٹر اسرائیل قائم ہو جائے۔ اس کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔ ذرا سوچیے کہ امریکہ نے عراق پر کیوں حملہ کیا! ابھی تک کوئی وجہ سامنے نہیں آسکی۔ کوئی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تیل کے لیے کیا گیا۔ قطعاً نہیں! یہ گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ 1991ء کی خلیجی جنگ کے اتحادی کمانڈر انچیف نے بعد میں صاف کہہ دیا تھا کہ ''ہم نے اسرائیل کی حفاظت کے لیے جنگ کی۔''

یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔ پہلے کہتے تھے کہ فرات تک ہمارا علاقہ ہے' اب کہتے ہیں دریائے دجلہ بھی ہمارا ہے۔ سقوطِ بغداد کے وقت اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے صاف کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ یہ ساری تیاری اس کے لیے ہے۔ یہ یہودی ہیں جو بش اور اس کے ساتھیوں کو چابی دے رہے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ 11 ستمبر 2001ء کا واقعہ کرنے والے بھی یہودی ہیں۔ امریکہ میں اب اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہو رہی کہ 11 ستمبر 2001ء کا واقعہ کس نے کیا تھا! شروع میں کچھ کارروائی ہوئی تھی' لیکن اس کی بعض باتیں لیک ہونے پر معاملہ فوراً ٹھپ کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ کھرا تو اسرائیل تک پہنچ رہا تھا۔

بہرحال یہودیوں کا ایجنڈا یہ ہے کہ سب سے پہلے آرمیگاڈان جلد از جلد ہو جائے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو۔ وہاں پر وہ اپنا تھرڈ ٹمپل تعمیر کریں گے' جس کے لیے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ دونوں کو گرایا جائے گا۔ پھر وہاں پر تخت داؤد لا کر رکھا جائے گا اور اس پر وہ مسیحا آ کر بیٹھے گا جس کا انہیں انتظار ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ آرمیگاڈان جنگ جلد ہو' گریٹر اسرائیل قائم ہو اور تھرڈ ٹمپل بنے۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولکس کے درمیان مذہب کے نام پر جتنی خون ریزی ہوئی ہے' دنیا میں کبھی نہیں ہوئی۔ یورپ میں اس پر جس قدر خانہ جنگیاں ہوئی ہیں' اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ سارے پروٹسٹنٹس یہاں سے مار مار کر بھگا دیئے گئے' جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ یورپ کا بڑا حصہ کیتھولکس پر مشتمل ہے۔ سپین' اٹلی' فرانس' جرمنی سب کیتھولکس ہیں۔ پروٹسٹنٹس نے امریکہ کے اندر اپنی نئی دنیا بسائی ہے اور وہاں وہ غالب ہیں۔ یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی برطانیہ اور امریکہ کو نیا اسرائیل کہتے ہیں' اس لیے کہ یہاں انہیں طاقت اور کنٹرول حاصل ہے۔ بہرحال کیتھولکس کی چونکہ پروٹسٹنٹس کے ساتھ دشمنی ہے اس لیے درحقیقت اب یورپ میں آخری صلیبی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ یورپ کو دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے' جیسے کبھی رومن امپائر ہوتی تھی اور پورا یورپ تقریباً ایک بادشاہ کے تحت ہوتا تھا۔ یہ اصل میں پوپ کی طرف سے کروایا جا رہا ہے تاکہ بہت بڑی رومن کیتھولک امپریلزم قائم ہو سکے۔ نیٹو سے علیحدہ ہو کر یورپ کی اپنی الگ فوج بنانے کی تیاریاں بھی اسی منصوبے کا حصہ ہیں۔ پروٹسٹنٹس کا کہنا یہ ہے کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو فتح کرنا چاہتے ہیں' تاکہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ختم کر کے وہاں پر کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو جائے۔

سابقہ اُمتِ مسلمہ بنی اسرائیل جن کو اللہ نے کتاب ہدایت اور کتاب شریعت تورات عطا کی تھی' تقریباً دو ہزار برس تک اس دنیا میں اللہ کی نمائندہ قوم کے منصب پر فائز رہی۔ انہیں 1400 قبل مسیح میں تورات عطا کی گئی تھی اور 610 عیسوی میں آنحضور ﷺ کی بعثت تک وہ امت مسلمہ تھے۔ 624ء میں تحویل قبلہ کا حکم اس امر کی واضح علامت اور اعلان تھا کہ سابقہ امت مسلمہ' جس کا مرکز بیت المقدس تھا' اب اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی ہے اور جو نئی امت اس مقام پر فائز کی گئی ہے یعنی امت محمد ﷺ' اس کا مرکز خانہ کعبہ ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ تھی جبکہ تقریباً ساڑھے چودہ سو برس اس امت محمد ﷺ کے ہیں۔ اس پس منظر میں فلسطین کے حوالے سے ایک بڑا پیارا جملہ میری نظر سے گزرا تھا کہ Too small a geography but too big a history۔ یعنی فلسطین جغرافیہ کے اعتبار سے تو بہت چھوٹی جگہ ہے' اس کا رقبہ ہماری سابقہ ریاست بہاول پور کے برابر ہے' لیکن تاریخ اس کی پانچ ہزار سال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے مانند دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس کا آغاز آج سے چار ہزار سال قبل انبیاء کرامؑ کے سلسلے سے ہوتا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے فلسطین میں آئے تھے۔ ان کی قوم کی طرف سے دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ آگ میں ڈال دیئے گئے۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ گل وگلزار بن گئی۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب میں یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ یہ اللہ کا قانون رہا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ قوم اس رسول کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے تو پھر اُسے ہجرت کی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کو اپنا مسکن اور مرکز بنا لیا۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کا مقام بھی یہیں رہا۔ پھر اُن کے بیٹے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی یہیں قیام کیا۔ ان تین انبیاءؑ کے تسلسل کے ساتھ وہاں قیام کو بھی بنی اسرائیل اپنی تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر چلے گئے اور چار پانچ سو سال تک وہاں رہے۔ اس دوران فلسطین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ شدید ترین غلامی اور تعذیب کا دور تھا' جس سے انہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے نجات دلائی۔ پانچ چھ سو سال قبل محض ستر افراد کا جو قافلہ مصر میں داخل ہوا تھا' اب اُس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قافلے کو لے کر فلسطین کی سرحد پر پہنچ گئے اور اپنی قوم کو حکم دیا کہ اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن پوری قوم نے کورا جواب دے دیا، جسے قرآن مجید میں بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے: ''ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے ارض فلسطین میں جب تک کہ جو لوگ آج اس پر قابض ہیں وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ تو جاؤ تم اور تمہارا رب لڑو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اس پر اللہ کا فیصلہ آ گیا کہ انہوں نے بزدلی دکھائی ہے ''تو ارضِ مقدس چالیس برس تک ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ اب وہ اس زمین کے اندر بھٹکتے اور بھٹکتے پھریں گے۔ پس (اے موسیٰ!) اب تم افسوس نہ کرو ان

فاسقوں کے بارے میں (کہ ان کا یہ حشر ہو رہا ہے۔)''

ان چالیس برسوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا۔ وہ ساری نسل جو کہ مصر میں غلام رہی تھی، ختم ہو گئی۔ نئی نوجوان نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ پورا فلسطین فتح کر لیا۔ لیکن ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ پورے فلسطین پر کوئی ایک مرکزی حکومت قائم نہیں کی گئی۔ بارہ میں سے دس قبیلوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں جبکہ دو قبیلوں کا تاریخ میں سراغ نہیں ملتا کہ کہاں گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بھارت میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں کا برہمن وہی یہودی طبقہ ہے جو اس وقت برہما یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لے کر یہاں آیا تھا۔ ''صحف ابراہیم وموسیٰ'' کا قرآن مجید میں دو جگہ ذکر ہے، لیکن وہ آج ہمارے پاس کہیں نہیں ہیں۔ تورات بگڑی تگڑی ہے تو سہی ناں۔ زبور محرف حالت میں سہی، لیکن موجود تو ہے۔ انجیل کیسی بھی ہو، وجود تو رکھتی ہے۔ لیکن آج دنیا میں صحف ابراہیم کے نام سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ میری رائے ہے کہ ہندوؤں کے اپنشد درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے ہیں۔ یہ رائے میں نے اپنشد کا کچھ مطالعہ کر کے قائم کی ہے۔ بہرحال انہوں نے دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں، جو باہم دست و گریباں رہنے لگیں۔ آس پاس کی مشرک قومیں ایک دوسرے کے خلاف ان سے مدد لیتیں۔ ہوتے ہوتے ان قوموں کا اتنا اثر و نفوذ ہو گیا کہ تقریباً پورے فلسطین پر وہ قابض ہو گئے اور ان کو اپنے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یہ تین سو برس کی تاریخ ہے جو ان چند جملوں میں بیان ہوئی ہے۔

پھر انہیں ہوش آیا کہ ہمیں تو جہاد کرنا چاہئے۔ چنانچہ وقت کے نبی سے کہا گیا کہ ایک سپہ سالار معین کر دیں۔ انہوں نے حضرت طالوت کو معین کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو جالوت کے مقابلے میں فتح دی۔ یہاں سے یہود کی تاریخ کا زریں باب شروع ہوا، جو میرے نزدیک ان کی خلافتِ راشدہ ہے۔ 1000 قبل مسیح سے لے کر 900 قبل مسیح تک محیط تقریباً 100 برس میں پہلے حضرت طالوت تھے، پھر ان کے داماد حضرت داؤد علیہ السلام آئے اور پھر ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام۔ اس کے بعد ان کا ایک دورِ زوال شروع ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: شمالی اسرائیل اور جنوبی یہودیہ۔ شمالی سلطنت کا دار الخلافت سامریہ جبکہ جنوبی کا یروشلم تھا۔ آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 700 قبل مسیح میں آشوریوں نے اسرائیل کی شمالی سلطنت ختم کر دی، صرف چھوٹی سی جنوبی ''یہودیہ'' رہ گئی۔ پھر ان کے ہاں فسق و فجور کا بازار گرم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عراق کے بادشاہ اور اس وقت کے نمرود نبوکدنضر (بخت نصر) کے ہاتھوں ان پر زبردست عذاب مسلط کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو معبد (ہیکل سلیمانی) بنایا تھا، اسے مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا۔ لاکھوں افراد یروشلم میں موقع پر قتل ہوئے جبکہ چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا۔

یہودیوں، رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں تینوں کی نگاہ اس وقت اس چھوٹے سے علاقے پر ہے۔ یہ سارا معاملہ اب ارضِ فلسطین پر آ گیا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہے؟ ایک اصولی اور مبنی بر انصاف حل تو یہ ہے جو

شروع سے پی ایل او کا مطالبہ تھا اور اب بھی حماس کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل کا قیام ناجائز طور پر ہوا تھا' ہمارے اوپر ظلم کر کے یہاں یہودیوں کو آباد کیا گیا اس لیے اسرائیل کو ختم ہونا چاہئے اور پورے کا پورا فلسطین اس کے اصل رہنے والوں کو دیا جائے۔ لیکن اصل فیصلہ تو طاقت کرتی ہے۔ ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!'' امریکہ ان کی پشت پر ہے۔ یورپ سے بھی کبھی کبھی امیدیں بنتی ہیں کہ وہ کچھ یہودیوں کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق کی بات کر دیتے ہیں' لیکن ان کا بھی اصل ایجنڈا یہی ہے کہ یہاں سے یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نکال کر رومن کیتھولک حکومت قائم کی جائے۔ بہر حال یہ صورتِ حال ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ بھئی زمینی حقائق کو دیکھو۔ ایک زمانہ ہوا کہ پی ایل او نے ہتھیار ڈال دیئے کہ اچھا ٹھیک ہے' اسرائیل بھی رہے لیکن ایک فلسطینی ریاست بھی بن جائے۔ اب اس صورتِ حال کو بھی بارہ تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اس چھوٹے سے جغرافیہ پر اتنے لوگوں کی نگاہیں ہیں اور بے چارہ مسلمان وہاں پر پٹ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں پی ایل او کی بات بھی کسی درجے میں صحیح ہے۔ امریکہ کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار ہے؟ بہر حال دنیا کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق آرمیگاڈان اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے لیے یورپ بھر پور تیاریاں کر رہا ہے۔ آج کل ایک عجیب بات قبرص کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کوفی عنان صاحب وہاں بار بار آ رہے ہیں۔ اصل میں نیٹو افواج کا صدر مقام پہلے جرمنی تھا' وہاں سے یہ کوسووو کی طرف منتقل ہوا۔ اب وہاں سے ان کا اگلا قدم قبرص ہے۔ وہیں اصل ''جمپنگ پیڈ'' بنے گا۔ فلسطین یہاں سے بہت قریب ہے' لہٰذا یہیں سے حملہ ہوگا' اور اس حملے میں اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ جب تک یہود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نہ گرائیں ان کا تھرڈ ٹمپل نہیں بن سکتا۔ قبضہ ان کے پاس ہے اور دنیا کی عظیم ترین عسکری قوت ان کی پشت پر ہے۔ اب اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون نے فیصلہ کیا ہے کہ غزہ کی پٹی پر قائم چند یہودی بستیوں کو تو ہم خالی کر دیں گے' جس کا رقبہ محض 140 مربع میل ہے' لیکن مغربی کنارے پر ہم اپنی بستیاں نہیں گرائیں گے اور وہ یہودی علاقہ ہی رہے گا۔ امریکہ نے بھی اس منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ اس سے آگے یہ معاملہ ہوا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے اپنے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران بش کو یہ دھمکی دی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امن کا عمل طویل ہونے اور روڈ میپ پر اسرائیل کے کاربند نہ ہونے سے عرب دنیا میں بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔ عوام یہ صورت حال کب تک برداشت کریں گے! عرب نوجوانوں کے اندر یہودیوں کی نفرت رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ اٹھیں گے اور پھر ہولناک قتل عام ہوگا۔ اس میں سب سے پہلے امریکہ کے ایجنٹوں کی صورت میں جو مسلمان حکمران بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے نوجوانوں کو ختم کریں گے۔ ملت عرب کے لیے انتہائی خون ریز معاملہ آنے والا ہے۔ یہ ہے وہ ہولناک منظر جسے حضور ﷺ نے المَلحَمۃ العُظمیٰ اور الملحمۃ الکُبریٰ یعنی تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ مستقبل سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔

ہمارا مستقبل

''آنے والے دَور'' کی ایک واضح تصویر

علامہ اقبال نبوت تو درکنار' ولایت تک کے مدّعی نہیں تھے۔ (''میں نہ عارف' نہ مجدد' نہ محدث' نہ فقیہہ!'') گویا وہ صرف ایک نابغہ انسان تھے۔ اس کے باوجود ایک جانب ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!'' کے مصداق ان کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے تقریباً پون صدی قبل اس حقیقت کا مشاہدہ کہ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' بچشم قلب کرلیا تھا جو آج پوری دنیا کو بچشم سر نظر آ رہی ہے' اور دوسری جانب وہ ایک وِژنری بھی تھے اور اپنے مستقبل کے وِژن پر انہیں جو اعتماد اور یقین حاصل تھا وہ ان کے ان اشعار سے عیاں ہے کہ:

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ افکار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!

اور ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

مزید برآں اپنی اس مستقبل اندیشی اور ''عاقبت بینی'' میں انہیں جس قدر جذب اور انہماک حاصل تھا وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ہسپانیہ میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع جامع قرطبہ میں کہا تھا' یعنی:

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور ان کی اس ''دُور بینی'' نے انہیں ''آنے والے دَور'' کے جو منظر دکھائے اس پر خود اپنی حیرت اور استعجاب کا اظہار انہوں نے یوں کیا کہ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

تو جب ایک غیر نبی نابغہ انسان کا عالم یہ ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے غور کیجیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ ﴿مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الانعام:75) کے جو مشاہدات کراتا رہا ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ﴿بِمَا اَرٰكَ اللّٰهُ﴾ (النساء:105) اور اَرَیْنٰكَ (بنی اسرائیل:60) کا جو معاملہ نبی اکرم ﷺ سے ساتھ رہا اس کی بنا پر جو پیشین گوئیاں آپ ﷺ نے مستقبل کے حوادث و واقعات کے ضمن میں کی ہیں ان کے

حتمی اور قطعی ہونے میں کسی شک کا کوئی امکان کسی مدعیٔ ایمان کے لیے کیسے ممکن ہے؟ لیکن افسوس کہ عہد حاضر میں مادیت اور مادہ پرستی کی جو ہوائیں چلیں اور ان کے باعث جو نظریاتی اور اعتقادی فتنے خود مسلمانوں میں پروان چڑھے ان کے زیر اثر جدید تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ ان پیشین گوئیوں کو توجہ اور اعتناء کے لائق نہیں سمجھتا' اور اس ''مفتونیت'' کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اب بھی جب کہ وہ حوادث وواقعات جن کی خبر دی گئی تھی 'نوشتۂ دیوار کے مانند نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں' ان کو تسلیم کرنے سے اعراض ہی کی روش پر اصرار کیا جارہا ہے۔

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں سے سب سے یقینی اور قطعی معاملہ تو اس دنیا کے خاتمے یعنی قیامِ قیامت کا ہے' جسے قرآن حکیم السَّاعَة ،اَلْوَاقِعة، القارِعَة اور الحَاقّة ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے' اور جس کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر قرآن مجید کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تو اسلام اور ایمان کے بنیادی لوازم میں شامل ہے۔ تاہم اب سے تقریباً سوا سو برس قبل جو نئی ''سائنٹیفک عقلیت'' عالم اسلام پر حملہ آور ہوئی تھی' جس کی اساس نیوٹن کی فزکس پر تھی' اس نے قیامِ قیامت کو بھی موہوم اور مشکوک بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ اس دَور کی فزکس کے مطابق مادہ حقیقی بھی تھا اور دائمی وغیر فانی بھی' چنانچہ یہ تصور عام تھا کہ کائنات ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ تو بھلا ہو آئن سٹائن اور اس کے بعد کے علماءِ طبیعیات کا جن کے انقلاب آفریں انکشافات کے نتیجے میں مادہ بھی تحلیل ہو کر صرف انرجی کی صورت اختیار کر گیا اور کائنات کے بارے میں بھی یہ حقائق تسلیم کر لیے گئے کہ یہ ایک خاص لمحے میں ایک ''عظیم دھماکے'' (Big Bang) کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی (جو گویا اللہ تعالیٰ کے امرِ ''کُن'' کی تعبیر ہے) اور ایک پھلجھڑی کے مانند چکر لگاتی ہوئی مسلسل کھل اور پھیل رہی ہے' اور ایک خاص مدت کے بعد واپس برعکس سمت میں چکر لگاتی ہوئی تنگ ہوتے ہوئے بالآخر ایک نقطہ کی صورت اختیار کر لے گی' جیسے کہ متعدد کہکشائیں پہلے ہی ''سیاہ سوراخوں'' (Black Holes) کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال قبل ایک پاکستانی ماہر طبیعیات چوہدری بشیر الدین نے ایک کتاب بھی طبیعیاتِ قیامت کے موضوع پر ''The Mechanics of Doomsday'' کے نام سے تصنیف کر دی ہے (شائع کردہ: ''ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن'' 60۔بی ناظم الدین روڈ' اسلام آباد)' جس میں واضح کر دیا ہے کہ پوری کائنات کی بڑی اور آخری قیامت سے قبل' جو ہو سکتا ہے کہ ابھی کافی دور ہو' اس کے جس حصے میں ہماری زمین واقع ہوئی ہے اس کی چھوٹی اور محدود قیامت واقع ہو سکتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ قریب ہی ہو۔ (جگر مراد آبادی نے تو نہ معلوم کس کیفیت میں یہ شعر کہا تھا:

ارباب ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی' دُنیا کی قیامت دُور نہیں!

لیکن اس میں ہو سکتا ہے کہ کچھ ''توارد'' متذکرہ بالا نظریے کے ساتھ بھی ہو گیا ہو۔)

بہر حال ایمان کے نقطۂ نظر سے تو اصل اہمیت قیامت کے قُرب یا بُعد اور اس کی ''مکینکس'' اور جزوی یا کُلی ہونے کی نہیں اس کے ''یقینی'' ہونے کی ہے' اور انسان کی فوز و فلاح کے نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت کا معاملہ ''بعث بعد الموت'' یعنی موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر یقین کا ہے۔ اسی طرح ہماری اس وقت کی بحث اور گفتگو کے اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں ان کے اعتبار سے اب یہ معاملہ زیادہ دیر اور دور کا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو آپ ﷺ نے خود اپنی بعثت کو قربِ قیامت کی علامت قرار دیا' اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کسی نبی یا رسول کو نہیں' قیامت ہی کو آنا ہے۔ چنانچہ بخاری رحمہ اللہ اور مسلم رحمہ اللہ دونوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ''میری بعثت اور قیامت آپس میں ایسے ملی ہوئی ہیں جیسے یہ دونوں انگلیاں!'' اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں آپ ﷺ نے یہی بات ان الفاظ میں فرمائی جو ترمذی رحمہ اللہ نے مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت کیے ہیں' یعنی: ''میں تو گویا عین قیامت ہی میں مبعوث کیا گیا ہوں' اور میں نے اس سے صرف اتنی ہی سبقت کی ہے جتنی درمیانی انگلی انگشت شہادت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے'' ---- اور سردست ان خالص معجزانہ اور خرقِ عادت واقعات سے قطع نظر جو عین وقوعِ قیامت سے متصلاً قبل پیش آئیں گے' قربِ قیامت کی بعض اہم علامات کا تعلق صحرائے عرب اور اس کے بادیہ نشینوں کی اس حیرت ناک خوشحالی سے ہے جو آج سے سو سال قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی آنی ممکن نہیں تھی۔

چنانچہ اس ''حدیث جبریل علیہ السلام'' میں جو ''اُمُّ السُّنَّۃ'' یعنی حدیث رسول ﷺ کے ذخیرے میں اسی مقام و مرتبے کی حامل قرار دی جاتی ہے جو قرآن حکیم میں سورۃ الفاتحہ کا ہے' اور جو صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں متعدد جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے' قربِ قیامت کی ایک اہم علامت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ: ''تم دیکھو کہ وہ مفلوک الحال چرواہے جو کبھی ننگے پیر اور ننگے بدن ہوا کرتے تھے' عالی شان عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں!'' امام مسلمؒ نے جو حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس میں قربِ قیامت کی علامت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ: ''دولت اتنی کثیر اور عام ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ نکالے گا لیکن اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا (سعودی عرب' کویت اور متحدہ عرب امارات کے مقامی باشندوں کی حد تک یہ صورت حال فی الواقع پیدا ہو چکی ہے) اور عرب کی زمین سبزہ زاروں اور چشموں کا منظر پیش کرنے لگے گی!'' اور سب سے بڑھ کر وہ حدیث جو امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کی ہے' جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہو گی جب تک فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد نہ ہو جائے جس پر

لوگ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے، یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ مارے جائیں گے۔''

ان میں سے جہاں تک پہلی دو حدیثوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو خود ہی ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کی مصداقِ کامل ہیں، البتہ تیسری حدیث پر غور کے ضمن میں یہ چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں: (i) قدیم زمانے میں ملکوں کو دریاؤں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج تھا، چنانچہ یہاں فرات سے مراد عراق اور کویت ہیں۔ (ii) آج کے صنعتی دَور میں سب سے زیادہ قیمتی متاع تیل ہے، جسے بجا طور پر ''سیال سونا'' کہا جاتا ہے۔ (iii) کوئی عجب نہیں کہ تیل کے وہ زیر زمین اور زیر سمندر سوتے بھی، جن سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تیل نکال رہے ہیں، وادیٔ فرات ہی کی جانب سے آتے ہوں۔ (iv) اس تیل کی دولت پر جو ''جنگ عظیم'' شروع ہوئی ہے دو سال قبل کی خلیج کی جنگ کو اس کے صرف نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہو گا کہ اسے صدام حسین نے اُمُّ المَحَارِب، یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا تھا۔ اور (v) اس چند روزہ ''نقطۂ آغاز'' کے دوران جو ناقابل تصور حد تک وحشیانہ بمباری عراق پر ہوئی تھی اس کے پیش نظر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر جنگوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھے تو عراق اور کویت کی تباہی اسی درجہ کی ہو جائے جو اِس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ ''حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!''

الغرض، راقم کو اگرچہ ان نجومیوں کی پیشین گوئیوں اور ماہرین فلکیات کی دی ہوئی خبروں سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو دنیا کے خاتمے کو صرف قریب ہی نہیں قرار دے رہے ہیں بلکہ اس کا وقت بھی معین کر رہے ہیں (اگرچہ ''قرائن کی شہادتِ'' کے درجے میں وہ بھی قابل اعتناء ہیں!) لیکن ان احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بنا پر، جن میں سے چند کا حوالہ اوپر دیا گیا، راقم کو یہ یقین حاصل ہے کہ دنیا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ (گویا ''دوڑ و زمانہ چال قیامت کی چل گیا!'' کے سے انداز میں) اپنے خاتمے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لطف یہ ہے کہ زمانہ اور وقت اور واقعات و حوادث کی اس تیز رفتاری کا نقشہ بھی ایک حدیث میں نہایت خوبصورت استعاراتی زبان میں کھینچ دیا گیا ہے، جسے امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جس کی رو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمانہ مختصر نہ ہو جائے، جس کے نتیجے میں سال مہینے کے برابر نظر آنے لگے، مہینہ جمعہ (تا جمعہ یعنی ایک ہفتہ) محسوس ہونے لگے، جمعہ (یعنی ہفتہ) ایک دن کی طرح ہو جائے، دن ایک گھنٹے کے برابر محسوس ہو اور ایک گھنٹہ آگ کے ایک شعلے کی بھڑک کے مانند مختصر ہو جائے!''

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وقوعِ قیامت تو چونکہ قرآن مجید کا سب سے زیادہ کثیر الذکر موضوع ہے، لہٰذا اس سے تو کسی مسلمان کو مجالِ انکار ہو ہی نہیں سکتی، قربِ قیامت کی ان علامات سے بھی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان ہوئی ہیں، شاید ہی کوئی مسلمان اختلاف کرے، اِلّا یہ کہ ان کے بعض الفاظ کی تعبیر و تاویل

میں کسی جزوی اختلاف کی گنجائش ہو۔ اسی طرح عین وقوع قیامت کے وقت جن واقعات و حوادث کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ بھی جدید سائنسی نظریات کے پیش نظر کچھ ایسے مستبعد اور ''اَن ہونے'' نظر نہیں آتے' جیسے مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا' یا زمین کا تین مقامات پر ''خسف'' یعنی بری طرح دھنس جانا' یا بہت عظیم آگ' یا بے پناہ دھواں! اس لیے کہ جدید طبیعیات کے نزدیک جس طرح اس وقت کل کائنات ایک عظیم پھلجھڑی کے مانند اپنے محور پر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہوئے کھلتی اور پھیلتی جا رہی ہے' اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ وہ برعکس رُخ پر چکر کھاتی ہوئی سکڑتی اور سمٹتی چلی جائے گی' تو یہ کیا بعید ہے کہ اس بڑی قیامت سے قبل کی چھوٹی قیامت کے موقع پر نظامِ شمسی میں وہ اختلال پیدا ہو جائے اور زمین کی گردش ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!'' کے انداز میں مغرب سے مشرق کی بجائے مشرق سے مغرب کی جانب ہو جائے' جس کے نتیجے میں سورج مغرب سے طلوع ہونے لگے۔ مزید برآں' جیسے کہ سورۃ القیامۃ کی آیات 8 اور 9 میں وارد ہوا ہے' چاند اور سورج یکجا ہو جائیں اور چاند سورج میں دھنس جائے اور خود زمین پر بھی اتنے بڑے بڑے شہاب گریں کہ وہ تین جگہ سے بری طرح دھنس جائے اور اس دھنسنے کے باعث اس کے اندر کی گیس اور آگ کا طوفان ابل پڑے۔

البتہ درمیانی عرصہ کے چار عظیم واقعات کے بارے میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تو ایک معتدبہ حصہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہے ہی' بہت سے ایسے علماء و مفسرین بھی مذبذب اور متردّد ہیں جو عہدِ حاضر (بلکہ صحیح تر الفاظ میں ماضی قریب) کی نیوٹن کی سائنس پر مبنی ''عقلیت پرستی'' کا شکار ہو گئے۔ ان چار عظیم واقعات کی جانب اشارات تو اگرچہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیلی خبریں اور پیشین گوئیاں ان احادیث نبویہ ﷺ میں وارد ہوئی ہیں جو کتاب الفتن کے مختلف ابواب میں شامل ہیں۔ ان عظیم واقعات کے مابین زمانی ترتیب یہ ہے: (1) سب سے پہلے "الملحمۃ الکُبریٰ" یعنی تاریخ انسانی کی ''عظیم ترین جنگ'' جس کی جانب اشارہ سورۃ الکہف کی دوسری آیت میں بَاْسًا شَدِیْدًا کے الفاظ میں وارد ہوا ہے' لیکن جس کی تفاصیل کتب حدیث کے ''باب الملاحم'' میں بیان ہوئی ہیں۔ (2) ''المسیح الدّجال'' کا خروج اور اس کے ہاتھوں مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی عظیم تباہی یا بالفاظِ دیگر اس کے ذریعے ''اُمّیین'' پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل۔ (3) حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کا نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا آخری قلع قمع' یا بالفاظِ دیگر اللہ کا عذابِ استیصال۔ چنانچہ جہاں تک نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے اس کا بھی واضح اشارہ سورۃ الزخرف کی آیت 60 میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ''اور وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ایک نشانی ہیں قیامت کی!'' اور بالآخر (4) اسلام کا عالمی غلبہ اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کا قیام!

عالمی خلافت کا قیام

اسلام کا عالمی غلبہ یا عالمی نظامِ خلافت

قیامت سے قبل کے چار عظیم واقعات میں سے جہاں تک آخری یعنی اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے' اگرچہ اس کی کوئی قطعی نص تو کم از کم راقم کے علم کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے' تاہم منطق کے اس قضیے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بتکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں' جس کا لازمی نتیجہ دینِ حق کا عالمی غلبہ ہے۔ چنانچہ تین بار قرآن حکیم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:33' الفتح:28' الصف:9) یعنی "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کل کے کل دین (نظامِ زندگی) پر!" اور دو مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ (التوبۃ:32' الصف:8) یہ الفاظ بھی وارد ہوئے کہ: "یہ لوگ (اور یہاں اصلاً مراد یہود ہیں' اس لیے کہ دونوں مقامات پر متصلاً قبل یہود ہی کا ذکر ہے) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے بجھا دیں جب کہ اللہ اپنے نور کو لازماً مکمل فرما کر رہے گا' خواہ یہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!" گویا ان پانچ آیات پر مشتمل تو صغریٰ ہے' اور کبریٰ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی اور کل عالمِ انسانیت کی جانب ہے' اور حسنِ اتفاق سے یہ مضمون بھی قرآن حکیم میں قدرے مختلف الفاظ میں پانچ ہی بار وارد ہوا ہے۔ یعنی: (1) "ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے نبی ﷺ!) آپ ﷺ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!" ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ (سبا:28) (2) "ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ ﷺ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر!" ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء:107) (3) "بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرنے والا بن جائے!" ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ (الفرقان:1) (4) سورۃ الجمعہ کی آیات 2 اور 3 میں فرمایا کہ آپ ﷺ کی بعثت صرف "اُمّیین" یعنی عربوں ہی کے لیے نہیں "آخرین" یعنی دوسروں کے لیے بھی ہے! اور (5) سورۃ الاعراف کی آیت 158 میں آپ ﷺ کو حکم دیا گیا: "کہہ دیجیے کہ لوگو! میں تم سب کی جانب اللہ کا رسول ہوں!" ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف:158)----

اب صغریٰ اور کبریٰ کو جمع کر لیجیے تو یہ لازمی منطقی نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد بتمام و کمال اسی وقت پورا ہوگا جب پورے عالمِ انسانی یعنی کل روئے ارضی پر آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا حتمی غلبہ

ہو جائے گا۔ گویا بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

رہیں احادیث نبویہ ﷺ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث مبارک تو وہ ہے جس کی رُو سے دنیا میں وہ نظام ایک بار پھر قائم ہو کر رہے گا جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں قائم ہوا تھا اور آپ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک اپنی کامل اور آئیڈیل صورت میں برقرار رہا۔ اسے امام احمد بن حنبل ؒ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کے مطابق آنحضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی' (آپ ﷺ کا اشارہ خود اپنی ذاتِ اقدس کی جانب تھا) جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھا لے گا۔ اس کے بعد نبوت کے طریقے' پر خلافت قائم ہو گی اور یہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے' پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) ملوکیت آئے گی اور وہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر مجبوری کی ملوکیت (غالباً مراد ہے مغربی استعمار کی غلامی) کا دور آئے گا اور وہ بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا۔۔۔۔ اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہو گی!'' راوی کے قول کے مطابق اس کے بعد آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمالی۔ (اور آپ ﷺ کی یہ خاموشی بھی بلاسبب نہ تھی' تاہم اس کا بیان بعد میں ہو گا)۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جب وہ نظام دنیا میں دوبارہ قائم ہو جائے گا تو آسمان بھی اپنی ساری برکات نازل فرما دے گا اور زمین بھی اپنی تمام برکتیں باہر نکال کر رکھ دے گی۔ (چنانچہ بعض دوسری احادیث میں ان برکات کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں)

پھر دو نہایت اہم احادیث وہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جو خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو گا وہ پورے عالم انسانیت اور کل روئے ارضی کو محیط ہو گا۔ چنانچہ (1) صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ (جو آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ نے میرے لیے پوری زمین کو سمیٹ یا سکیڑ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی' اور سن رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے سکیڑ یا لپیٹ کر دکھا دیے گئے!'' اور (2) مسند احمد بن حنبل ؒ میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''کل روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ اونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے' خواہ کسی عزّت کے مستحق کے اعزاز کے ساتھ اور خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کے

ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ انہیں عزت دے گا اور اہل اسلام میں شامل کر دے گا یا انہیں مغلوب کر دے گا' چنانچہ وہ اسلام کی بالادستی قبول کر لیں گے!'' حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ ''تب وہ بات پوری ہوگی (جو سورۃ الانفال کی آیت 39 میں وارد ہوئی ہے) کہ دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے!''

الغرض' قیامِ قیامت اور دنیا کے خاتمے سے قبل کُل روئے ارضی پر وہ دورِ سعادت یقیناً آ کر رہے گا جس میں ''اللہ ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنے والے مسلمانوں کو لازماً زمین کی خلافت اسی طرح عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو (مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو) عطا کی تھی' اور ان کے لیے ان کے اس دین کو زمین میں لازماً تمکن عطا فرما دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمالیا ہے' اور ان کی خوف زدگی کی کیفیت کو لازماً امن و سکون کی حالت سے تبدیل کر دے گا!''

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط﴾ (النور:55)

چنانچہ اسی کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی عہدِ حاضر کے وژنری' عبقری اور نابغہ انسان علامہ اقبال کی ''نگاہِ تیز'' نے' جب انہوں نے کہا تھا:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اور اس میں بھی ہرگز کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس دورِ سعادت کی نوید ہندو دھرم کی کتابوں میں بھی موجود ہے' اس لیے کہ جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' دنیا کے تمام مذاہب اسلام ہی کی بدلی اور بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اور ان سب میں مشکوٰۃِ نبوت کے انوار کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود اور برقرار ہے۔ چنانچہ پنڈت شری رام اچاریہ اپنی تحریر شائع شدہ ''اکھنڈ جیوتی'' بابت مارچ 1981ء میں لکھتے ہیں: ''ایسے ثبوت موجود ہیں

کہ یگ بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔کل یگ (جسے عرف عام میں کلجگ کہہ دیا جاتا ہے) اب وداع ہو رہا ہے اور اس کی جگہ پر ایسا دور آ رہا ہے جسے ست یگ (یعنی سچا زمانہ یا برحق زمانہ) کہا جا سکے۔منوسمرتی' لنگ پران اور بھاگوت میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق حساب پھیلانے سے پتا چلتا ہے کہ موجودہ دور بحران کا دور ہے... ان سب اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے وہ وقت ٹھیک ان ہی دنوں میں ہے جس میں یگ بدلنا چاہیے... یعنی 1980ء سے 2000ء تک بیس سال کا عرصہ۔'' (بحوالہ ''اگر اب بھی نہ جاگے تو...'' تالیف مولانا شمس نوید عثمانی' شائع کردہ روشنی پبلشنگ ہاؤس' بازار نصر اللہ خاں' رام پور۔ یو پی۔ بھارت)۔تو اس وقت اس امر سے تو بحث نہیں ہے کہ پنڈت جی کا حساب کتاب صحیح ہے یا نہیں' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ دورِ سعادت کی یہ نوید اور خوشخبری قرآن حکیم کے اشارات (گویا دلالۃ النص) اور حدیث نبوی ﷺ کی تصریحات (گویا عبارۃ النص) کے عین مطابق ہے۔اس پر مزید اضافہ فرما لیجیے اس کا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی' جو عیسائیوں کے جملہ فرقوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے' زمین پر ''آسمانی بادشاہت'' اور ''خدائی عدالت'' کے قیام ہی کے لیے ہوگی۔گویا ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!'' کے مصداق اسلام کے نظامِ عدل و قسط یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا عالمی سطح پر قیام اپنوں اور بیگانوں سب کے نزدیک مسلّم ہے اور گویا تقدیر مبرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی یقیناً مفید ہوگا کہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' میں علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کی خالص فلسفیانہ سطح پر مدلل ترین اور مبسوط ترین تشریح کرنے والے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے قیامت سے قبل اسلام کے نظامِ عدل و قسط کے عالمی سطح پر قیام کو نظریۂ ارتقاء کا لازمی اور منطقی نتیجہ قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک ارتقاء کی پہلی منزل خالص کیمیائی اور طبیعیاتی ارتقاء کی تھی جس کے نتیجے میں سادہ کیمیاوی عناصر نے ان پیچیدہ حیاتیاتی مرکبات کی صورت اختیار کی جن میں حیات کا ظہور ممکن ہوا۔ اس کے بعد حیاتیاتی ارتقاء کا عمل شروع ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔پھر ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء کا سفر شروع ہوا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔پھر سماجی اور تمدنی ارتقاء کا آغاز ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور آپ ﷺ پر ''دین حق'' کی تکمیل اور سماجی اور تمدنی عدل و قسط کے نظام کے بالفعل قیام پر اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔اب ارتقاء کے اس طویل سفر کا صرف ایک ہی مرحلہ باقی ہے اور وہ ہے اس نظام کے عالمی سطح پر قیام کا ---- اس کے بعد چونکہ موجودہ تخلیق جن اصول و قواعد اور حدود و قیود کے ساتھ ہوئی ہے ان میں ارتقاء کی کوئی اور جہت اور سمت ممکن نہیں ہے لہٰذا اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اسی کا نام قیامت ہے۔گویا قیامت سے قبل محمد ﷺ پر کامل ہونے والے دین حق کا پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی پر غلبہ سفر ارتقاء کی وہ آخری اور لازمی منزل ہے جس کی جانب

وہ کاروانِ انسانیت کشاں کشاں رواں ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل بجا طور پر کہا تھا:

یا ز نورِ مصطفیٰ ﷺ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ ست!

البتہ ایک اور خبر جو بعض دوسری احادیث میں وارد ہوئی ہے' یہ ہے کہ ''ہر کمالے را زوالے'' کے مطابق اس دورِ سعادت کے بعد بھی ایک ایسا دور آئے گا جس میں پوری زمین پر ایک انسان بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہیں رہے گا (مسلم رحمہ اللہ عن انس رضی اللہ عنہ) اور دنیا میں صرف ''بدترین خلائق'' ہی رہ جائیں گے (مسلم رحمہ اللہ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)۔ چنانچہ قیامت ان ہی پر قائم ہوگی۔ یہ غالباً اس لیے ہوگا کہ صاحب ایمان اور نیک بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے بچا لیا جائے۔ صحیح مسلمؒ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی احادیث مروی ہیں کہ جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا وہ دورِ سعادت جتنا عرصہ اللہ چاہے گا قائم رہ چکے گا تو دفعۃً ایک پاک اور ٹھنڈی ہوا ایسی چلے گی جس سے ہر وہ شخص موت کی نیند سو جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا... چنانچہ اس کے بعد دنیا میں صرف بے ایمان اور بدکار لوگ ہی باقی رہ جائیں گے' اور وہی جہنم کے اُخروی عذاب سے قبل ہولناک زلزلۂ قیامت ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ (الحج:1) کی سختیاں بھی جھیلیں گے! ---- اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے اس سکوت اور توقف کا جو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے دوسری بار ''خلافت علیٰ منہاج النبوت'' کے قیام کی نوید کے بعد اختیار فرمایا تھا۔ یعنی اس دورِ سعادت کے تذکرے کے فوراً بعد آپ ﷺ نے اس دورِ نحوست کا ذکر مناسب نہیں خیال فرمایا۔ واللہ اعلم!

اب جہاں تک ان عظیم حوادث و واقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں' یعنی ایک عظیم' نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ' دجال کا خروج' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال' جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' اور ان کے علاوہ' بلکہ ان ہی کے ذیل میں یاجوج و ماجوج کا سیلاب' بیعت مہدیؒ اور ''دَابَّةُ الْاَرْض'' کا ظہور وغیرہ' تو واقعہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت تو ان کا ذکر بھی پسند نہیں کرتی۔ رہے علماء دین تو ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کے لیے ان کا انکار تو ممکن نہیں ہے' تاہم ماضی قریب کے بعض نامور علماء اور مفسرین بھی ان کے بارے میں کم از کم مذبذب اور متردّد ضرور رہے ہیں' اور موجودہ علماء میں سے بھی بہت سے ان کی عقلی اور سائنسی توجیہہ یا استعاراتی تاویل کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔

اس صورت حال کے بعض اسباب تو عمومی ہیں اور بعض خصوصی۔ عمومی اسباب میں سے چند یہ ہیں:

1) اگرچہ خالص سائنس کی دنیا میں تو نیوٹن کی طبیعیات کا دَور ختم ہو چکا ہے' لیکن عوامی سطح پر یورپ اور

امریکہ تک میں تا حال اسی کے جامد نظریات و تصورات کا سکہ رواں ہے' لہٰذا عام طبعی قوانین کے خلاف کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے ذہن بالعموم تیار نہیں ہیں۔ (گزشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے اپنے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے لیے انگلستان کے نومسلم سکالر جناب عبدالحکیم کو دعوت دی تھی جو حکمت تبلیغ کے تحت مغرب میں اپنا سابق نام گائی ایٹن ہی استعمال کرتے ہیں' اور انہوں نے بھی اپنے ایک خطبے میں اسی بات کی گواہی دی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر لوگ تا حال ذہنی اعتبار سے نیوٹونین فزکس ہی کے دور میں جی رہے ہیں۔)

2) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی باتوں پر توجہ سے جذبۂ عمل کمزور پڑ جاتا ہے' اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر لوگ کسی ''مَردے از غیب'' کے انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات خام اور نیم پختہ اذہان کے اعتبار سے درست بھی ہے!

3) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان ہی چیزوں کا سہارا لے کر اُمت کی تاریخ کے دوران مختلف مواقع پر شہرت وعزّت اور نام و نمود کے خواہاں حوصلہ مند لوگ مختلف دعوے کر کے عوام کے دین و ایمان کے لیے فتنہ کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں' اور کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں!

ان پر مستزاد ہیں وہ دو خصوصی اسباب جن کا تعلق ان دو فتنوں سے ہے جو گزشتہ صدی کے اواخر میں سائنسی عقلیت کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور تا حال پروان چڑھ رہے ہیں۔ یعنی (1) فتنۂ قادیانیت اور (2) فتنۂ استخفاف و انکارِ حدیث۔ ان میں سے مؤخر الذکر نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں میں حدیث نبوی ﷺ کی وقعت و اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے اذہان اس فتنے سے زیادہ مسموم ہیں وہ تو حدیث نبوی ﷺ کی حجیت کا صریح انکار کر دیتے ہیں' باقی بھی عملاً اس کی جانب سے ''غضِ بصر'' اور صرفِ نظر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ رہا مقدم الذکر فتنہ تو اس کے بانی اور مؤسس نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ غضب ڈھایا کہ نہ صرف خود مجدّد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا' بلکہ

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کی صفات!

کی بحث چھیڑ کر اور پھر خود ہی کو مثیلِ مسیح علیہ السلام اور مسیح موعود علیہ السلام قرار دے کر نزولِ مسیح علیہ السلام کا باب ہی بند کر دیا (جس کے لیے ''رفع مسیح علیہ السلام'' کا انکار بھی لامحالہ ضروری تھا!)

لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان واقعات و حوادث کے سلسلے کی پہلی کڑی' یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے' اب بالکل نوشتۂ دیوار کے مانند سامنے کی بات ہے' اور ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ جہاں تک ان واقعات و حوادث کی ان تفاصیل کا تعلق ہے جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں' ان میں یقیناً استعاراتی زبان بھی استعمال ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اب سے چودہ سو

برس قبل آج کے سلاحِ جنگ اور ذرائع رسل و رسائل کا بیان اسی طور سے ممکن تھا' اور مختلف راویوں کی روایات میں لفظی فرق اور زمانی ترتیب کا گڈمڈ ہو جانا بھی عین قرین قیاس ہے۔ جہاں تک ان کے مجموعی خاکے کا تعلق ہے' راقم اپنے مطالعہ اور فہم القرآن کی بنا پر پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ قرآن کے فلسفہ و حکمت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور بالخصوص قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جو صفحاتِ گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے۔

☆☆☆

اب آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سلسلۂ مضامین کی کڑیوں کو ذہن میں جوڑ لیا جائے جو اس سے قبل بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا نقطہ آغاز ایک ایسا خیال تھا جو ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!'' کے مصداق اپنے بیرونی سفر کے دوران ایک روز اچانک ذہن میں بجلی کی مانند کوند گیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم قرآن مجید میں ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط﴾ (البقرۃ:61) ''ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے عذاب میں گھر گئے'' کے الفاظ پڑھتے ہوئے آرام کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے گزر جاتے ہیں کہ یہ یہود کا ذکر ہے' حالانکہ موجودہ معروضی صورت حال میں ان الفاظ کا مصداقِ کامل یہود نہیں' ہم ہیں! پھر اس پر راقم اپنے قیامِ حرمین شریفین کے دوران بھی مسلسل غور کرتا رہا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اور اسی غور و فکر کا حاصل تھا جو پہلے 25 مارچ 1993ء کو خطابِ عیدالفطر میں بیان ہوا اور اس کے بعد سے زیرِ نظر مضامین کی صورت میں پیش ہو رہا ہے جو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئے۔

اس سلسلے کا پہلا مضمون ''ہیں آج کیوں ذلیل؟'' کے عنوان سے 16/ اپریل 1993ء کو شائع ہوا تھا جو متذکرہ بالا خیال ہی کی وضاحت پر مشتمل تھا کہ آج یہودی تو دنیا میں کل چودہ ملین یعنی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم ہونے کے باوجود بالفعل دولت و ثروت اور عزت و وجاہت کی چوٹی پر متمکن ہیں' یہاں تک کہ علامہ اقبال کے اس قول کے عین مطابق کہ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' وہ دنیا کی عظیم ترین اور وقت کی واحد سپر پاور یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو کنٹرول کر رہے ہیں' جب کہ ہم مسلمان ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی؟'' کی سی کیفیت سے دوچار ہیں۔ البتہ یہ وضاحت اسی وقت کر دی گئی تھی کہ یہ صورتِ حال مستقل نہیں' عارضی ہے اور بہت جلد بالکل برعکس ہو جانے والی ہے۔ پھر 23/ اپریل کو شائع ہوئی تھی راقم کی وہ تحریر جس کے بارے میں راقم کو اپنی کم علمی کے باوصف یہ ''زعم'' ہے کہ اس اچھوتے موضوع پر شاید ہی کبھی کسی نے اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہو' یعنی ''قرآن کا قانونِ عذاب''۔ اور اب ہمیں اپنے موضوع کے جس حصے کی جانب پیش قدمی کرنی ہے' یعنی وہ عظیم حوادث اور تباہ کن واقعات جو حدیث نبوی ﷺ میں واردشدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل قریب میں پیش آنے والے ہیں' ان کے پس پردہ کار

فرما حکمت خداوندی کے فہم کے لیے ضروری ہے کہ اس قانونِ عذابِ الٰہی کی بعض دفعات کو پھر سے ذہن میں تازہ کرلیا جائے۔ یعنی (1) اوّلاً یہ کہ یہ دنیا اصلاً دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں! لیکن (2) یہ قاعدۂ کلیہ پوری طرح صرف افراد پر منطبق ہوتا ہے' قوموں اور ملتوں پر نہیں!

بقول اقبال:

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

چنانچہ قوموں اور اُمتوں کا مجموعی حساب دنیا ہی میں چکا دیا جاتا ہے۔ (3) دنیا میں ''عذابِ اکبر'' یعنی اللہ کے اجتماعی عذاب کی عظیم ترین صورت ''عذابِ استیصال'' کی ہے جس کے ذریعے پوری پوری قوموں کو نسیاً منسیاً کر دیا گیا' اور انہیں بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُن کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ اور یہ صورت اُن قوموں کے ساتھ پیش آئی جن کی جانب کوئی رسول مبعوث کیا گیا اور اس نے اپنی دعوت و تبلیغ اور قولی و عملی شہادت کے ذریعے اتمامِ حجت کا حق بدرجہ تمام وکمال پورا کر دیا' لیکن اس کے باوجود قوم نے بحیثیت مجموعی کفر اور انکار کی روش پر اصرار کیا' جیسے قومِ نوح علیہ السلام' قوم ہود علیہ السلام' قومِ صالح علیہ السلام' قومِ لوط علیہ السلام' قومِ شعیب علیہ السلام اور آلِ فرعون۔ (4) اس سے کمتر لیکن پیہم اور متواتر عذاب ان لوگوں پر آتا رہا جنہوں نے رسولوںؑ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اُمتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی اور اس حیثیت میں اللہ کے ساتھ عہد و میثاق کا رشتہ استوار کیا' لیکن پھر امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے قول وقرار سے انحراف کرتے ہوئے شریعت کی حدود کو پامال کرنے اور اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دینے کی روش اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ ہے عذابِ اجتماعی کی وہ دوسری شکل جس کے کوڑے سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی پیٹھ پر بھی پیہم پڑتے رہے' اور موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی ہم مسلمانوں پر بھی متواتر برس رہے ہیں۔

اس کے بعد جو مضمون جمعہ 30 / اپریل اور ہفتہ یکم مئی 1993ء کو دو قسطوں میں شائع ہوا اس میں دو نکات کی وضاحت کی گئی۔ یعنی: (1) یہ کہ اگرچہ دنیا میں انبیاء اور رسول علیہم السلام تو بہت سے گزرے ہیں' لیکن صاحب کتاب اور حامل شریعت اُمتیں پوری انسانی تاریخ کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی امت محمد ﷺ۔ اور (2) بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک بنی اسرائیل کی لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال کی تاریخ اور اُمت مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے مابین نبی اکرم ﷺ کے اس قولِ مبارک کے مطابق حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے کہ: ''میری اُمت پر بھی لازماً وہ سارے احوال واقع ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے' بالکل ایسی مشابہت کے ساتھ جو ایک جوڑی کی ایک جوتی کو دوسری جوتی سے ہوتی ہے!'' (ترمذی عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بن العاص) چنانچہ

اس عرصے کے دوران سابقہ اُمت مسلمہ بھی دو بار عروج سے ہمکنار ہوئی اور دو مرتبہ زوال سے دو چار ہوئی' اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی مسلمان بھی دو ہی بار عزت و وجاہت اور قوت و سطوت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہوئے اور دو ہی مرتبہ ذلت و مسکنت کے قعر مذلت کی انتہائی پستیوں میں گرے۔ (بقول اقبال: پیش ما یک عالم فرسودہ است ---- ملت اندر خاکِ اوُ آسودہ است!)

اس کے بعد 7 اور 8 مئی 1993ء کو دو ہی قسطوں میں ''بیسویں صدی عیسوی اور سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں'' کے عنوان سے مضمون شائع ہوا' جس میں واضح کیا گیا کہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب و غریب منظر پیش کرتی ہے کہ اس کے دوران ایک جانب دونوں اُمتوں پر حسب سابق عذاب الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے' چنانچہ یہودیوں پر ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں ہٹلر کے ہاتھوں عذابِ الٰہی کا شدید ترین کوڑا پڑا اور مسلمانوں میں سے افضل تر حصے یعنی عربوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر پیوست ہوا' اور اس پر مستزاد اس کے ہاتھوں انہیں پہلے 1948ء میں اور پھر 1967ء میں عبرتناک ہی نہیں نہایت شرمناک ہزیمت کا مزہ چکھنا پڑا' یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی ہوئی اور وہ اس کی تولیت سے محروم ہو گئے' اور غیر عرب مسلمانوں میں سے بھی پاکستانی قوم کو 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور المیۂ مشرقی پاکستان کی صورت میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن دوسری جانب اس صدی کے دوران دونوں ہی اُمتوں میں احیاء اور نشاۃِ ثانیہ کا عمل بھی شروع ہوا' اگرچہ اس کی ترقی اور پیش قدمی کی رفتار سابقہ اُمت یعنی یہود میں بہت تیز رہی' جب کہ اس کے مقابلے میں اُمتِ مسلمہ کا احیائی عمل نہایت سست رفتار رہا۔ چنانچہ یہودکی ترقی کی سرعتِ رفتار کا عالم تو یہ ہے کہ 1897ء میں ان کے چند ''بزرگوں'' (Elders of the Zion) نے جو سکیم تیار کی تھی اس کا پہلا ثمرہ کل بیس ہی برس بعد 2 نومبر 1917ء کے ''اعلانِ بالفور'' کی صورت میں سامنے آ گیا' اور پھر کل تیس برس بعد 1948ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آ گیا۔ اور اِس وقت واقعی صورت حال یہ ہے کہ جہاں ایک جانب اسرائیل بذاتِ خود بھی ایک بہت بڑی عسکری قوت ہے' اور اس پر مستزاد اسے پوری عیسائی دنیا کی حمایت و نصرت بھی حاصل ہے' وہاں دوسری جانب وقت کی واحد سپریم پاور تو یہود کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے ہی' پوری دنیا کے مالیاتی نظام پر بھی ان کا کامل تسلط ہے اور عالمی معیشت کا لیور تو اس طرح ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں ذرا سی جنبش کے ذریعے عظیم ترین سلطنتوں کو تہ و بالا اور ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔ (جس کی ایک نمایاں مثال سوویت یونین کا حالیہ حشر ہے!) چنانچہ اِس وقت حقیقی اور واقعی صورت حال یہ ہے کہ ''عظیم تر اسرائیل'' کے قیام کے لیے عملی اقدام میں کوئی تاخیر یہود اور اسرائیل کی اپنی حکمت عملی ہی کے تحت تو ہو سکتی ہے دنیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت بالفعل موجود نہیں ہے جو اس کی راہ میں مزاحم ہو سکے! ---- دوسری طرف مسلمانانِ عالم بھی نہ صرف یہ کہ مغربی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات حاصل کر چکے ہیں' بلکہ ان میں

اپنے اصل تشخص کی بازیافت اور اپنی تہذیب و تمدن کے احیاء اور اسلام کو ایک ''دین'' یعنی نظامِ زندگی اور سسٹم آف سوشل جسٹس کی حیثیت سے قائم و نافذ کرنے کی شدید اُمنگ پیدا ہو چکی ہے' جس کی لہر مشرق سے مغرب تک پورے عالم اسلام میں ''ہے ایک ہی نغمہ' کہیں اونچا کہیں مدھم!'' اور ''ہے ایک ہی جذبہ' کہیں واضح کہیں مبہم!'' کی شان کے ساتھ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس ''احیائی دور'' میں یہودی مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اور دراصل اسی معروضی حقیقت میں آئندہ پیش آنے والے عظیم حوادث اور ہولناک واقعات کا راز مضمر ہے' جس پر مفصل گفتگو آئندہ ہو گی۔

اس کے بعد دو ہی اقساط میں' یعنی 14 اور 16 مئی کو وہ تحریر شائع ہوئی جس میں ''ابراہیمی مذاہب کا ثالث ثلاثہ'' کے عنوان سے یہ حقائق واضح کیے گئے کہ: (1) عیسائیت اپنی اصل اور آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً ابراہیمی مذاہب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو کار سابقہ اُمت مسلمہ ہی کا ''فرقہ'' سمجھے جاتے تھے' لیکن سینٹ پال کی ترمیمات کے نتیجے میں موجودہ عیسائیت ایک بالکل جداگانہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے' جس کا کوئی حقیقی اور معنوی تعلق ابراہیمی مذاہب کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ (2) یہودیوں اور مسلمانوں دونوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دَور کے ضمن میں یورپ کی عیسائی اقوام ہی ''کوڑے'' کے طور پر استعمال ہوتی رہیں۔ چنانچہ یہودیوں پر بھی چوتھی صدی عیسوی کے بعد سے آج تک سارا تشدد اور کُل تعذیب عیسائیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی اور مسلمانوں پر بھی پہلے دورِ عذاب کی ابتدا بھی صلیبیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگرچہ اس وقت اصل عذاب تاتاریوں کے ہاتھوں آیا تھا' لیکن دوسرے دورِ عذاب کے دوران تو' جو چودہویں اور پندرہویں صدی میں ہسپانیہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا' عذابِ الٰہی کے تمام کوڑے یورپ کی عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں پڑے۔ (چنانچہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں یہ حقیقت بھی بہت اہم رول ادا کرنے والی ہے!) (3) یہودیوں نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے ازلی اور جانی دشمنوں یعنی عیسائیوں کو پہلے رام کیا اور پھر باقاعدہ زیر کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے پہلے ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی' پھر مسلم اسپین کو اپنے مورچے اور کمین گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عیسائی یورپ کی فصیل میں نقب لگائی' اور علم و حکمت کے جو سوتے قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں سے پھوٹ کر یورپ کی جانب بہہ رہے تھے ان میں ''لبرلزم'' کے عنوان سے فکری آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا زہر شامل کر کے ایک جانب یورپ کے معاشرے کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب ''پروٹسٹنٹ ازم'' کی راہ سے کلیسا کی گرفت کو کمزور کر کے سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح یورپ کو اپنے اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ چنانچہ اس وقت حقیقی اور معروضی صورت حال یہ ہے کہ پوری عیسائی دنیا پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے ''واسپ'' (White

AngloSaxon Protestants) کو جن کے سرخیل ہیں امریکہ اور برطانیہ اور ان کے سر اور شانوں پر سوار ہے "صیہونیت" کا سازشی ٹولہ!

اور بالآخر جمعہ 21 مئی اور اتوار 23 مئی 1993ء کو دو قسطوں میں شائع ہوئی "آنے والے دور کی ایک واضح تصویر" کے عنوان والی تحریر جس کی پہلی قسط میں سب سے زیادہ حتمی و یقینی اور قطعی و شدنی بات کا تذکرہ ہوا یعنی قرآنی اصطلاح میں الواقعہ القارعہ الحاقہ اور الساعہ کا ذکر جسے عرفِ عام میں "قیامت" کہہ دیا جاتا ہے (حالانکہ اصل قرآنی اصطلاح کے مطابق قیامت کے لفظ کا اطلاق بعث بعد الموت کے بعد حساب کتاب اور جزا و سزا کے فیصلے کے دن یعنی "یوم الدین" پر کیا جاتا ہے) اور دوسری قسط میں اس سے قبل کے اتنے ہی حتمی اور یقینی واقعے کا تذکرہ ہوا جو قرآن حکیم سے "دلالۃ النص" اور احادیث نبویہ ﷺ سے "صراحۃ النص" کے طریق پر تو ثابت ہے ہی فلسفہ اقبال کے شارح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی رائے میں نظریۂ ارتقاء کے بھی منطقی اور لازمی نتیجے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسلام کا عالمی غلبہ اور عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام!

اب آئندہ ہمیں ان عظیم واقعات و حوادث پر گفتگو کرنی ہے جن کی تفصیلی خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں وارد ہوئی ہیں یعنی سلسلۂ ملاحم اور المَلحَمۃُ الکُبریٰ بیعت مہدی خروجِ دجال نزولِ مسیح علیہ السلام استیصالِ یہود اور خاتمۂ عیسائیت جن کے بارے میں ہم اپنی یہ حتمی اور سوچی سمجھی رائے پیش کر چکے ہیں کہ ان کی واقعاتی تفاصیل اور ان کے وقوع کے ٹائم ٹیبل سے قطع نظر جہاں تک ان کے مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ دونوں مسلمان اُمتوں کی تاریخ اور قرآن کے اس قانونِ عذاب کے فریم میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے جس کا اجمالی ذکر آج کی صحبت میں بھی ہو گیا ہے۔ آئندہ ہم ان میں سے ایک ایک کے بارے میں مختصر گزارشات پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز!

پندرہویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے

2 جون 1993ء کو نماز عید الاضحیٰ سے فراغت کے بعد باغ جناح لاہور سے واپس آ کر اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں کسی قدر خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک ذہن اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ غلبۂ اسلام سے قبل کے حوادث یعنی سلسلۂ ملاحم بیعت حضرت مہدی خروجِ دجال نزولِ مسیح علیہ السلام اِستیصالِ یہود اور عیسائیت کے اسلام میں مدغم ہونے کو کس ترتیب اور اسلوب سے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ اس لیے کہ احادیث صحیحہ میں وارد شدہ خبریں بھی اپنے مقام پر اور میرا ایمان و یقین اور وثوق و اعتماد بھی اپنی جگہ لیکن آج کا جدید تعلیم یافتہ انسان ان مباحث سے طبعاً الرجک واقع ہوا ہے اور ان پر گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے بعض مباحث بہت تفصیل طلب ہیں جب کہ ایک روزنامے کے "کالم" کا مزاج اور اس کی محدودیت دونوں ان تفاصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ میں کچھ دیر اسی ادھیڑ بن میں رہا لیکن پھر

اچانک خیال آیا کہ اب سے دس بارہ سال قبل میں نے اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی تھی جو ماہنامہ ''میثاق'' میں شائع بھی ہو گئی تھی' کیوں نہ اسے دیکھا جائے' شاید کہ معاملہ آسان ہو جائے۔ چنانچہ اسے نکال کر پڑھا تو ایک تو میں خود ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ اب سے ساڑھے بارہ سال قبل جو باتیں بہت دور دراز نظر آتی تھیں' اس عرصے کے دوران نوشتۂ دیوار کی طرح عالم واقعہ میں رونما ہو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف میری مشکل واقعتاً آسان ہو گئی اور دل نے یہی رائے دی کہ پہلے اس کے متعلقہ حصے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔ اس سے ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے آجائے گا۔ پھر بعض معاملات کی کسی قدر وضاحت اور اس عرصے کے دوران پیش آمدہ واقعات سے استشہاد کے ذریعے پورا مرحلہ بآسانی طے ہو جائے گا' اور اس طرح ان آراء میں اضافی وزن اس بنا پر پیدا ہو جائے گا کہ یہ خیالات ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید'' کے مصداق خلیج کی جنگ کے بعد پیدا نہیں ہوئے' بلکہ اس سے لگ بھگ دس سال قبل وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکے تھے۔

واضح رہے کہ یہ تقریر میں نے 24 اکتوبر 1980ء کو اپنے دوسرے سفر امریکہ سے واپسی پر مسجد شہداء ریگل چوک لاہور میں کی تھی۔ پھر اسے ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے جوں کا توں ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کی اشاعت بابت جنوری فروری 1981ء میں شائع کر دیا گیا تھا۔ سفر امریکہ کے دوران اس موضوع کی جانب میرا ذہن جن اسباب کی بنا پر منتقل ہوا اُن میں سے بعض کا ذکر تو اس تقریر کے آغاز میں موجود ہے' لیکن ایک اہم بات جو اُس وقت بیان ہونے سے رہ گئی تھی' یہ تھی کہ میں نے اپنے 1979ء اور 1980ء کے امریکہ کے سفر کے دوران کثرت کے ساتھ یہ سٹکرز کاروں کے پچھلے شیشوں یا بمپرز پر چسپاں دیکھے کہ ''یسوع مسیح علیہ السلام تشریف لا رہے ہیں!'' (Jesus is Coming) جس سے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے ورودِ ثانی کو ہمارے اور عیسائیوں کے مابین ایک بہت بڑی قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ بہر حال اب اس تمہید کے بعد میری اس تقریر کے متعلقہ حصے ملاحظہ ہوں۔ میں نے اب اس میں تقریر کو تحریر کا انداز دینے کے لیے صرف کچھ لفظی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر کا فرق کیا ہے اور بعض غیر ضروری تفاصیل حذف کر دی ہیں' ورنہ اصلاً یہ آج سے ساڑھے بارہ سال قبل ہی کی تقریر ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء' نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام اور ماثورہ دعاؤں کے بعد عرض کیا گیا)

حضرات! میری آج کی گفتگو کا عجیب پہلو یہ ہے کہ مجھے اعلان کے مطابق ایک ہی نشست میں دو موضوعات پر گفتگو کرنی ہے' ایک موضوع تو میرے شمالی امریکہ کے حالیہ دورے کے تاثرات و مشاہدات سے متعلق ہے (تقریر کا یہ حصہ اِس وقت تو بالکلیہ حذف کیا جا رہا ہے' لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی موقع پر اسے بھی ہدیۂ قارئین کیا جائے تو اِن شاء اللہ مفید بھی ہو گا اور موجب دلچسپی بھی!) اور دوسرا پندرہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے' جس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کو دوسرے مسلمان ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی

سرکاری سطح پر منایا جارہا ہے بلکہ اس کے استقبال کے لیے کافی پہلے سے مختلف تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ عوام الناس ہی نہیں ہمارے خواص کے بھی قابل ذکر حصے میں چودھویں اور پندرھویں صدی کے متعلق عجیب وغریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ باتیں کچھ تو ہمارے ان واعظین کے باعث پھیلی ہیں جن کا مبلغِ علم صرف سنی سنائی باتوں اور سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی معلومات تک محدود ہوتا ہے پھر اس میں کافی دخل عوام الناس کی اس عادت کا بھی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔

اس موضوع پر کہ اُمت مسلمہ اور ملّتِ اسلامیہ چودہ سو سال میں عروج و زوال کے مختلف اَدوار سے گزرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی ہے اور فی الوقت ہم کس صورتِ حال سے دو چار ہیں میں پہلے بھی مفصل تقریریں کر چکا ہوں اور اُمت مسلمہ کے عروج و زوال کے دو دو اَدوار کے متعلق میرے تجزیے اور میرے مطالعے کا حاصل تحریری شکل میں بھی آ چکا ہے لیکن علم مطالعہ اور مشاہدہ کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض نئی باتیں حال ہی میں میرے سامنے آئی ہیں جن کو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان نئی باتوں کی جانب ذہن منتقل ہونے کا سبب یہ حسنِ اتفاق ہوا کہ شمالی امریکہ میں کافی عرصہ سے ایک اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کا امریکہ کے مختلف شہروں میں ہر سال ایک کنونشن منعقد ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب میں پہلی بار امریکہ گیا تھا تو ڈیلاس میں ان کے سالانہ کنونشن کا انعقاد ہو رہا تھا جس میں ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ امسال میں جب دوسری مرتبہ دعوتی دورے پر شمالی امریکہ گیا تو ان کا سالانہ کنونشن مشہورِ عالم آبشار نیاگرا کے سامنے نیاگرا سٹی میں منعقد ہونے والا تھا جس میں شریک ہونے اور آخری اجلاس میں ''پندرھویں صدی ہجری کے چیلنج خطرات اور توقعات'' کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت وتوفیق سے اس موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جس کے دوران کچھ پہلو اور نکات ایسے ذہن میں آئے کہ میں نے چاہا کہ ان کو آپ کے سامنے بھی بیان کروں۔ (یہ مقالہ پاکستان میں روزنامہ ''مسلم'' اسلام آباد اور بھارت میں ہفت روزہ ''Radiance'' دہلی میں شائع ہو چکا ہے)

احادیث شریفہ میں قیامت کی جو علامات بتائی گئی ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنیں اور ہم چوکس و ہوشیار رہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اور اس معاملے میں کوئی مغالطہ لاحق ہو تو اس کو دور کر لیجیے کہ کسی صدی کے تعین کے ساتھ خواہ وہ چودھویں صدی ہو خواہ پندرھویں صدی کوئی خبر نہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے نہ احادیث شریفہ میں۔ علاماتِ قیامت کے باب میں احادیثِ نبویہ ﷺ میں غور وفکر کرنے سے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ڈرامہ اپنے ڈراپ سین یعنی اختتام

سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وہ نقشہ اور وہ حالات تیار ہوتے نظر آ رہے ہیں جن کی خبریں الصادق المصدوق جناب محمد ﷺ نے دی تھیں۔ میں ان حالات کا جن سے اس کرۂ ارض کو مستقبل قریب میں سابقہ پیش آنے والا ہے' ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آج کی اس گفتگو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جامعہ مدنیہ لاہور کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ (افسوس کہ مولانا موصوف کا انتقال 3 مارچ 1988ء کو بالکل اچانک انداز میں ہوگیا۔ غَفَرَ اللّٰہُ لَنَا وَلَہٗ وَاَدْخِلْہُ فِی اَعْلٰی عِلِّیِّیْن... آمین!) سے بہت مدد ملی ہے۔ مولانا موصوف نے اسی موضوع پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر تقریر بھی کی تھی' پھر میرا اس موضوع پر ان سے آج ہی تبادلۂ خیالات بھی ہوا ہے اور اس گفتگو سے میری اپنی سوچ میں مزید پختگی پیدا ہوئی ہے' اور میری ان گزارشات میں ان سے استفادہ بھی شامل ہے۔

قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث نبویہ ﷺ میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان سے ذہن میں آنے والے واقعات و حالات کی ایک ترتیب بھی بنتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعات مختلف مراحل میں رونما ہوں گے۔ ہر مرحلے میں کتنی مدت صرف ہوگی اور کتنا عرصہ لگے گا' اس کا تعین ممکن نہیں' لیکن مختلف احادیث نبویہ ﷺ' کو جمع کر کے غور و تدبر کیا جائے تو ایک اجمالی نقشہ اور خاکہ ذہن میں ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس طرح جو نقشہ میرے ذہن میں مرتب ہوا ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

احادیث شریفہ سے ایک بات تو پورے جزم اور یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ وقوعِ قیامت کے قریب کچھ جنگیں ہوں گی جن کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ایسی وسعت کی حامل ہوں گی کہ ان کے سامنے سابقہ تمام جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ماند پڑ جائیں گی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے' اس جنگ میں بے پناہ خونریزی ہوگی اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوت کو فتح و کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے بارے میں احادیث شریفہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے۔ عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب' اپنے عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اس کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور یہ تفرقہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلح معرکہ آرائی اور ایک شدید جنگ کی صورت اختیار کر لے گا جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ چنانچہ ترکی' لبنان' شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے' حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے اور دباتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس جنگ میں یہودیوں کی تمام دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہوگا اور ان کا سرمایہ' ان کی ٹیکنیکل مہارت' ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مہیب و مہلک اسلحہ اور

ان کے پراپیگنڈے کے ہتھیار سب عیسائیوں کی پشت پر ہوں گے‘ لیکن خود وہ براہِ راست جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ احادیث کے مطابق اس مرحلہ پر حضرت مہدیؑ کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ لیکن اسی موقع پر یہ بات بھی جان لیجیے کہ حضرت مہدی کی حدیثِ نبوی ﷺ میں بیان شدہ شخصیت اور اہلِ تشیع کی اعتقادی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان دونوں کے مابین سوائے لفظ اور نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ وہ جس مہدی کے ماننے والے ہیں وہ اُن کے بارہویں امام ہیں جو اُن کے عقیدے کے مطابق روپوش ہو گئے تھے اور کسی غار میں مقیم ہیں اور اُس وقت وہی ظاہر ہوں گے، ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ احادیث نبویہ ﷺ سے ہمارے سامنے حضرت مہدیؑ کی شخصیت اور ان کے ظہور کا جو نقشہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کے ایک قائد اور ایک راہنما کی حیثیت سے ابھریں گے۔ ان کا نام محمد ہوگا اور ان کے والد کا نام عبداللہ۔ وہ بیت اللہ شریف میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی مہدیٔ موعود ہیں۔ وہ خود مہدی ہونے کے دعوے دار نہیں ہوں گے‘ بلکہ لوگ ان کو از خود پہچانیں گے اور کوئی ندائے غیبی اس امر کی تائید کرے گی۔ مسلمان ان کی قیادت میں متحد اور مجتمع ہو کر عیسائی قوتوں سے جنگ و قتال کریں گے اور ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ جائیں گے۔ اور جب قسطنطنیہ کو عیسائیوں کے چنگل سے آزاد کرا رہے ہوں گے تو پھر ایک اور مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کو ہم تیسرا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ وقت دجالِ اکبر کے ظہور کا ہوگا۔ اس کے ظہور کی خبر اس کے قبضے میں غیر معمولی اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آناً فاناً پھیل جائے گی۔ بعض احادیث میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران کا شہر) بتائی گئی ہے‘ لیکن وہ خود بھی یہودی النسل ہوگا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہر ناقابلِ تسخیر قوت اس کی پشت پر ہوگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوگا۔ عیسائی قوتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اور مسلمانوں کو دوبارہ شدید ہزیمت و شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ شدید نقصانات اٹھاتے ہوئے حضرت مہدی کی قیادت میں دمشق کی طرف پلٹیں گے۔ احادیثِ نبویہ ﷺ کی رو سے یہ وقت ہوگا عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کا‘ جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

یہاں تھوڑا سا توقف کر کے اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں‘ اور ان کے جلو میں تباہی‘ ہلاکت اور خون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں۔ ہمیں بالعموم یہ کہہ کر تھپکی اور لوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرہویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہے اور روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے‘ اور ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان ''امانی'' سے بہل جاتے ہیں اور ہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جو اعلائے کلمۃ اللہ‘ احقاقِ حق‘ ابطالِ باطل اور غلبہ دینِ متین کی سعی و جہد کے ضمن میں ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔ حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کن انتہائی کٹھن مراحل سے سابقہ

پیش آنے والا ہے اور قطرہ کے گہر ہونے تک اس پر کیا کچھ بیتنے والی ہے اور ان امتحانوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لیے ہمیں حقیقی ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں سلطنت اسرائیل کے قیام اور دنیا بھر سے لاتعداد یہودیوں کی وہاں منتقلی‘ پھر ان ممالک کی طرف سے جو عظیم اکثریت کے لحاظ سے عقیدۃً عیسائی ہیں ’’اسرائیل‘‘ کی سرپرستی اور معاونت اور اس کی جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کو پیش نظر رکھئے اور غور کیجیے کہ مستقبل میں کون کون سے علاقے محاذِ جنگ بننے والے ہیں۔

بہرحال صحاحِ ستہ جیسی بلند پایہ کتب احادیث کے علاوہ دوسرے بہت سے مجموعوں کے ذریعے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں‘ ان میں قطعیت اور صراحت کے ساتھ دجالِ اکبر کے ظہور اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی سال وسن اور صدی کے تعین کے بغیر خبریں دی گئی ہیں۔ ان احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں ہمارا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام بنفس نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ صحیح مسلم‘ جامع ترمذی‘ سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ میں نزولِ مسیح علیہ السلام کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ’’دجال جب مسلمانوں کو پامال کرتا ہوا دمشق کا محاصرہ کر لے گا تو اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم علیہ السلام کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے‘ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی‘ اور وہ حد نظر تک جائے گی‘ وہ کافر زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریم علیہ السلام دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔‘‘ ایک اور حدیث میں دجال کے ظہور کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ’’پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو افیق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔‘‘ ان احادیث میں دجال کے قتل کا مقام لُد اور افیق کی گھاٹی کا قرب بیان کیا گیا ہے‘ تو جان لیجیے کہ لُد (لِڈا) فلسطین میں اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ افیق آج کل فیق کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شام اور اسرائیل کی سرحد کے قریب شام کا آخری شہر ہے‘ جس سے آگے اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور لُد کے ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔

ان واضح احادیث اور تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اسی مضمون کی بہت سی احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نزول فرمانے والے بنفس نفیس وہی حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ہوں گے۔ احادیث صحیحہ میں یہ وضاحت وصراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام دوبارہ اس دنیا میں بحیثیت نبی تشریف نہیں لائیں گے‘ بلکہ اس وقت ان کی حیثیت خاتم النبیین آخر الرسل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اُمتی کی ہوگی۔ احادیث میں ان کے نزول کا وقت نمازِ فجر کے قریب بیان ہوا ہے اور یہ بات بھی مذکور ہے

کہ ان سے کہا جائے گا کہ آپ آگے بڑھیے اور نماز کی امامت فرمائیے' لیکن آنجناب علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ حضرت مہدیؒ کی اقتداء ہی میں نماز ادا کریں گے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیسے ہو گے تم لوگ جب کہ تمہارے درمیان ابن مریم علیہ السلام اتریں گے اور تمہارا امام اس وقت تم ہی میں سے ہوگا!'' اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں۔ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ ان کی حیثیت اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک اُمتی کی ہوگی اور اُمت مسلمہ کا نظم برقرار رہے گا۔

نزولِ مسیح علیہ السلام کے سلسلے کی جملہ احادیث پر غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزول کا اصل مشن دجال کا قتل اور یہود کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ چونکہ قرآن حکیم میں رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ جن قوموں کی طرف رسولوں کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے وہ اگر بحیثیت مجموعی رسول پر ایمان لانے سے انکار کر دیں تو ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ جیسے قومِ نوح' قومِ لوط' قومِ صالح اور قومِ شعیب علیہم السلام پر عذابِ استیصال کے نزول اور ان کی ہلاکت و بربادی کا قرآن حکیم میں تفصیل سے متعدد بار ذکر ہے۔ از روئے قرآن مجید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی' جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت 49 کے آغاز میں فرمایا ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کے جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کیا گیا' ان پر عذابِ استیصال نہیں آیا' لہٰذا ان کی ہلاکت کا مرحلہ سنت اللہ کے مطابق ابھی آنا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا جن کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا اور ان ہی کے ہاتھوں سے یہود سنت اللہ کے مطابق برباد' ہلاک اور نیست و نابود کر دیے جائیں گے اور ان کا بالکلیہ استیصال ہوگا۔ یہودیوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ نزولِ مسیح علیہ السلام کے بعد عیسائیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور تمام دنیا پر دین الحق کی حکمرانی ہوگی' اور اس طرح ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کی شان بکمال و تمام سارے عالم پر ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم اور ترمذی و مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ضرور اُتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر' پھر وہ صلیب کو توڑ دیں گے (فیکسر الصلیب) اور خنزیر کو ہلاک کریں گے (ویقتل الخنزیر) اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔ دوسری روایت میں جزیے کا لفظ ہے' یعنی جزیہ ختم کر دیں گے (ویضع الحرب او یضع الجزیۃ) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا' اور حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔'' تھوڑے سے لفظی

اختلاف کے ساتھ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح سند کے ساتھ مختلف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔ ان تمام احادیث میں "یکسر الصلیب" اور "یقتل الخنزیر" اور "یضع الجزیة" کے جو الفاظ آئے ہیں اس کا مفہوم تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ صلیب کو توڑنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت ایک الگ مذہب کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی... حضرت مسیح علیہ السلام اپنے نزول کے بعد خود اعلان فرمائیں گے کہ میں خدا کا بیٹا نہیں' بلکہ اُس کا بندہ ہوں "اِنِّي عَبْدُ اللهِ"... نہ ہی مجھے صلیب پر چڑھایا گیا تھا' بلکہ مجھے میرے ربّ نے آسمان پر زندہ اُٹھا لیا تھا' نہ میں نے خنزیر کو حلال کیا تھا اور نہ ہی میں نے شریعت کو ساقط کیا تھا۔ اور ساتھ ہی وہ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق فرمائیں گے۔ نتیجتاً عیسائیت ختم ہو جائے گی۔ اور "یضع الجزیة" یعنی جنگ یا جزیہ کو ختم کر دینے کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کے بعد اُمتوں کا اختلاف ختم ہو جائے گا' دوسرے تمام مذاہب و اَدیان بھی مٹ جائیں گے اور سب لوگ ملتِ اسلام میں شامل ہو کر ایک اُمتِ واحدہ بن جائیں گے۔ اس طرح نہ جنگ و قتال کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور الصادق المصدوق ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق آسمان سے رحمتیں نازل ہوں گی اور زمین اپنے تمام پوشیدہ خزانے اور برکتیں اُگل دے گی۔

متعدد احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فتنۂ دجال کے فرو کرنے، یہودیوں کا استیصال کرنے' تمام باطل ادیان کو محو اور تمام ملل و اُمم کو ملتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ضم کرنے کے بعد چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ چنانچہ مسند احمد میں ایک روایت آتی ہے جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دجال کے قصے میں بیان کرتی ہیں کہ "پھر عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔" بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی بھی ہوگی' وہ صاحب اولاد ہوں گے' پھر ان کا انتقال ہوگا اور وہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کے اٹل قانونِ قدرت سے دوچار ہوں گے، یعنی ان پر بھی طبعی موت واقع ہوگی جیسے ہر ذی نفس پر واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کی تدفین بھی اس حجرہ شریف میں ہوگی جس میں نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے دو جاں نثار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدفون ہیں۔

مَیں نے عرض کیا تھا کہ احادیث نبویہ ﷺ میں قربِ قیامت کے متعلق جو علامات اور پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں وہ ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ گویا آخری سین کے لیے اسٹیج تیار ہو رہا ہے۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر تھے ان کی اسرائیل کے نام سے فلسطین میں ایک آزاد و خود مختار ریاست آج سے تقریباً تینتیس سال قبل قائم ہو چکی ہے۔ (اب اسرائیل کے قیام پر 73 سال بیت چکے ہیں۔ 2021ء) جہاں تمام دنیا سے سمٹ سمٹ کر یہودی جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا سرمایہ' ان کی قابلیت' ذہانت اور مہارت مجتمع ہو کر عالم اسلام

کے لیے ایک خطرہ بن چکی ہے۔ اس خطرے کا عملی مظاہرہ 1967ء کی جنگ میں ہو چکا ہے' جس کے نتیجے میں شام' اردن' لبنان اور مصر کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہوا جو آج تک برقرار ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس پر بھی وہ قابض ہے اور اس کی حرمت اس کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے دلوں میں اللہ کے آخری رسول ﷺ' آخری کتاب' آخری اور مکمل دین و شریعت سے جو بغض و عداوت اور حسد پیدا ہوا تھا اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے' حالانکہ یہ اُمویوں' عباسیوں' فاطمیوں اور عثمانیوں کی مسلم حکومتیں ہی تھیں جنہوں نے یورپ کے متعصب عیسائی حکمرانوں کے جور وستم اور ظلم و تعدّی سے یہودیوں کو نجات دلائی تھی اور جن کی زیر عافیت یہ باقی بھی رہے اور پھلتے پھولتے بھی رہے' لیکن ان کا سازشی اور انتقامی ذہن اسلام کی سلامت روی اور انسان دوستی سے بالکل متاثر نہیں ہوا... اسی یہودی ذہن کی کرشمہ سازیاں ہیں جو آج دنیا میں مادہ پرستانہ فکر ونظر کی شدت کی صورت میں ظاہر ہیں۔ عریانی' فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے جو مناظر آج دنیا دیکھ رہی ہے اس کی ترویج میں بہت بڑا حصہ ان ہی یہودی دانشوروں اور سرمایہ داروں کا ہے۔ یورپ کے متعدد ممالک اور خاص طور پر امریکہ کے ذرائع ابلاغ' اخبارات و رسائل' ریڈیو' ٹی وی اور فلمی صنعت پر زیادہ تر ان ہی کا قبضہ ہے۔ یہی حال بڑی بڑی صنعتوں اور بینکاری کا ہے۔ جن اداروں پر ان کا براہِ راست قبضہ نہیں ہے وہ ان کے زیر اثر ہیں۔ ایوانِ حکومت میں بھی وہ بہت بااثر ہیں۔ کتنے کلیدی عہدے ان کے پاس ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے کہا تھا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' تو آج یہ صورت حال زیادہ روشن اور واضح طور پر دنیا کے افق پر نظر آ رہی ہے۔ سود خوری یہود کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا گوشت پوست اور خمیر اسی حرام کی غذا سے بنا ہے۔ آج اسی یہودی ذہن کی سازش کے باعث دنیا کی تمام معیشت سودی لین دین کی لعنت میں گرفتار ہے' پھر اس کو فریب اور پرکاری کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ لوگ اس کی مضرتوں کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔

اس وقت مشرقِ وسطیٰ جس نازک صورت حال سے دوچار ہے اس پر غور کیجیے۔ بہت سے مسلم ممالک جن میں مصر خاص طور پر قابل ذکر ہے' چاروناچار امریکہ کی طرف جھکتے چلے جا رہے ہیں' اور کچھ ایسا نقشہ جمتا نظر آ رہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑنے کا وقت دور نہیں... اور اگر یہ جنگ چھڑی تو سب سے بڑا میدانِ جنگ مشرقِ وسطیٰ ہی ہوگا' اور عجب نہیں کہ بیشتر مسلم ممالک خواہی نخواہی امریکہ اور اُس کے یورپی اتحادیوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شامل ہوں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ گویا احادیث نبویہ ﷺ میں جس عظیم جنگ کی خبر دی گئی تھی کہ ایک زبردست اور خون ریز و تباہ کن جنگ ہوگی جس میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے' اس کے آثار سامنے نظر آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس متوقع ہولناک تباہی کے ظہور میں آنے میں کچھ اور وقت لگے' لیکن

موجودہ حالات کی سنگینی بتا رہی ہے کہ یہ جنگ اور ٹکراؤ ناگزیر اور اٹل ہے۔ یہودی اس جنگ میں یقیناً امریکہ ہی کے حلیف ہوں گے' کیونکہ امریکہ کی حمایت ہی میں اس سرطان نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے پنجے گاڑے ہیں اور امریکہ ہی اس وقت ان کا سب سے بڑا حامی و مددگار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے دلوں میں متوقع جنگ کے بعد یہودی ہی نفرت کا بیج بونے کا کردار ادا کریں گے اور پھر دجال کی قیادت میں عیسائی مملکتوں کی تائید و اعانت حاصل کر کے مسلمانوں پر یلغار کریں گے اور مسلمان شکست و ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ یہی وقت ہوگا حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کا اور یہی دور ہوگا جب یہودیت کا بالکلیہ استیصال ہو گا اور عیسائی دینِ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے گا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ امن و سلامتی کا دور کتنے سال اور کتنی صدیوں تک رہے گا' لیکن بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انسانیت کا قافلہ پھر صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹ کر شیطان کی بتائی ہوئی پگڈنڈیوں میں بھٹک جائے گا' حتیٰ کہ زمین اللہ تعالیٰ سے بغاوت و سرکشی کی وجہ سے ظلم و ستم اور جور و تعدی سے معمور ہو جائے گی' شر غالب ہوگا اور خیر مغلوب ہی نہیں' ناپید اور معدوم ہو جائے گا۔ یہ زوالِ دنیا کا خاتمہ لے کر آئے گا اور وہ ساعت جس کو ہم قیامت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی خبر قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے دی گئی ہے' آئے گی اور یہ دنیا تہ و بالا اور ملیامیٹ کر دی جائے گی۔ نظامِ ثقل درہم برہم ہو جائے گا' اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلے ہوئے عظیم الشان ستارے اور کرے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ عالم تہس نہس ہو جائے گا۔

حاصل کلام یہ کہ یہ کائنات مشیت و حکمت خداوندی کے تحت اپنی اجل مسمّٰی یعنی قیامت کی طرف گامزن ہے اور اس انجام سے لازماً دوچار ہوگی جو اس کا مقدر ہے' لیکن اس انجام کے وقت' سال' سن یا صدی کا تعین کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' جیسا کہ سورۃ لقمان کی آخری آیت اور حدیثِ جبریل علیہ السلام سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ البتہ یہ گھڑی آ کر رہے گی' اس میں شک کرنا کفر ہے۔ پھر اس آخری گھڑی کے آنے تک اُمت مسلمہ اور بنی نوعِ انسان جن حالات سے دوچار ہوں گے اس کا جو نقشہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سامنے آتا ہے' اس کو بھی میں نے بیان کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ قرآن و حدیث میں کسی صدی کے تعین کے ساتھ کوئی خبر نہیں دی گئی ہے' لیکن احادیث میں جو علامات بیان ہوئی ہیں وہ ہم کو چشم سر سے نظر آ رہی ہیں اور صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمیں بہت کٹھن مراحل اور سخت امتحانات سے گزرنا ہے' اور یہ محض خام خیالی ہے کہ پندرھویں صدی از خود ہمارے لیے غلبۂ اسلام کی نوید لے کر آ رہی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی اُمت مسلمہ کو کن کن صدموں اور حادثوں سے دوچار ہونا ہے' البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک دور لازماً آئے گا جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا... بڑے نصیبے والے ہوں گے وہ لوگ جو اس

غلبۂ اسلام میں حضرت مہدیؒ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیر قیادت فی سبیل اللہ اور غلبۂ دین حق کے لیے جہاد و قتال میں اپنے جان و مال کی قربانیاں پیش کریں گے' اور بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے جو غلبۂ اسلام کے اس دور کا نظارہ بھی سر کی آنکھوں سے کریں گے اور اس کی سعادتوں سے متمتع اور مستفیض بھی ہوں گے۔

(نوٹ: یہاں اب سے بارہ سال قبل کی گزارشات اختتام کو پہنچیں!)

دو شبہات اور اُن کے جواب

ان صفحات میں جو بحث چل رہی ہے اس کے ضمن میں جو مسائل زیر بحث آ رہے ہیں ان کے بارے میں مَیں اپنی یہ تشویش بیان کر چکا ہوں کہ ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ طبعاً ''الرجک'' ہے اور ان پر بحث و گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس سے قبل یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ فتنۂ انکارِ سُنّت اور استخفافِ حدیث کے زیر اثر نہ صرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بلکہ بہت سے نوجوان ''علماء'' بھی ان مسائل سے ''غض بصر'' اور صرفِ نظر ہی کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان موضوعات پر گفتگو کے سلسلے میں راقم کو کچھ اور ''اندیشے'' بھی تھے کہ اس گفتگو سے کوئی منفی تاثرات نہ لے لیے جائیں!

حال ہی میں راقم کو اپنی متذکرہ بالا تشویش اور اندیشوں کے دو شواہد موصول ہوئے۔ چنانچہ ایک تو خط ہے جو نیویارک سے موصول ہوا۔ مراسلہ نگار پروفیسر میاں ابراہیم ہیں (288۔ ایسٹ' سٹریٹ 8' بروکلن' نیویارک۔ 11218) اور اس کے آغاز اور اختتام کے یہ جملے پورے مکتوب کا حاصل اور لب لباب ہیں: ''امید ہے کہ مزاج خوشگوار ہوں گے۔ روزنامہ نوائے وقت میں آپ کے مضامین ''ابراہیمی مذاہب کا ثالث ثلاثہ'' اور'' آنے والے دور کی واضح تصویر'' کا مطالعہ کیا۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے ... ان مضامین کے لکھنے سے آپ کا مقصد جو کچھ بھی ہو' آپ ہی بہتر جانتے ہیں' لیکن قاری صرف یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ آپ مسلمانوں خصوصاً بوسنیا اور مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو بشارت دے رہے ہیں کہ ظلم وستم کا ہر وار نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شکر الحمد للہ پڑھ کر برداشت کیے جاؤ۔ قیامت سے قبل ابن مریم علیہ السلام تشریف لائیں گے اور ظالموں سے انتقام لے لیں گے!'' ---- دوسرا منفی ردّعمل ''بالمشافہ'' موصول ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ ملتان سے دو نوجوان علماء نے شدّ رحال فرما کر لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی' تاکہ مجھے ''مطلع'' کریں کہ میری ان تحریروں سے یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ میں خود ''مہدیٔ موعود'' ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہوں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل کچھ وضاحتیں ان دو امور کے بارے میں پیش کر دی جائیں۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر بات کا تعلق ہے' اگرچہ اس پر صرف ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ﴾ پڑھ دینا بھی کافی ہے۔ تاہم شاید اس پر مستزاد یہ وضاحت مفید ہو کہ جن احادیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جب

مسلمانانِ عرب پر شدید مصائب کا دور آئے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک مومن و متقی اور باہمت و باصلاحیت قائد عطا فرمائے گا، جو دشمنوں کے مقابلے میں ان کی سپہ سالاری کے فرائض باحسن وجوہ سرانجام دے گا، ان ہی میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ وہ قائد موعود نبی اکرم ﷺ کی عترت یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوگا۔ جب کہ میں تو اپنے بارے میں اب سے چھ سات سال قبل اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ'' (صفحات 109۔112) میں صراحت کر چکا ہوں کہ اگرچہ میری والدہ مرحومہ صدیقی یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھیں، لیکن میرا ددھیال خالص ہندی الاصل ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے بارے میں علامہ اقبال کا وہ شعر بھی نقل کیا تھا جو انہوں نے ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ یعنی:

میں اصل کا خاص سومناتی

آباء مرے لاتی و مناتی

لہٰذا میرے لیے تو یہ دروازہ بند ہے ہی، میرے نزدیک تو آج تک جس ''غیر فاطمی'' نے بھی مہدیٔ موعود ہونے کے خواب دیکھے یا دعویٰ کیا وہ صریح تضاد کا شکار ہوا کہ اس نے حضرت مہدیؒ کی بشارت تو احادیث نبوی ﷺ سے اخذ کی، لیکن ان کے خصائص اور حسب نسب کی ان تفاصیل کو سرے سے نظرانداز کر دیا جو خود ان احادیث ہی میں وارد ہوئی ہیں۔ رہا عقل و منطق کا معاملہ تو حضرت مہدیؒ کے بارے میں جو خیالات اہل سنت کے ہیں کم از کم ان میں تو کوئی بات نہ عقل کے نزدیک محال ہے، نہ عام قوانین طبعی کے خلاف، بلکہ اس قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے کہ جب فتنہ و فساد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بالآخر وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ علیہ السلام طلسم سامری!

اس لیے کہ اگر خونِ اسرائیلؑ میں اتنی حرارت تھی تو خونِ اسماعیلؑ اتنا سرد اور عترتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بانجھ کیوں ہو جائے گی کہ عظیم فتنہ و فساد کے وقت کوئی ہادی و مہدی پیدا نہ کر سکے!

بہرحال، راقم کے نزدیک تو ایمان بالرسالت کا تقاضا یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد شدہ تمام خبروں کو تسلیم کیا جائے، خواہ وہ عام عقل انسانی اور اب تک کے دریافت شدہ قوانین طبعی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، لہٰذا حضرت مہدیؒ کے بارے میں کسی شک یا شبہ کا کیا سوال، جب کہ ان کے ضمن میں تو کوئی خلافِ عقل یا مخالفِ قوانین طبعی بات کم از کم احادیث نبویہ ﷺ میں موجود نہیں ہے... تاہم حضرت مہدیؒ کے معاملے میں راقم کی اصل دلچسپی اس حدیث کی بنا پر ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بلادِ مشرق سے ان کی مدد کے لیے فوجیں جائیں گی۔ یَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ یوطئون للمھدی یعنی سلطانه. رواہ ابن ماجہ عن عبداللہ بن الحارثؓ)... تو کاش کہ راقم اور اس کے ساتھی اور جمیع مسلمانانِ پاکستان اپنا تن من دھن اس ارضِ پاکستان میں

جو بلادِ عرب کے مشرق میں واقع ہے' اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کھپا دیں' تاکہ نہ صرف اس سرزمین میں جہاں سے ''میر عرب ﷺ'' کو بقولِ اقبال ٹھنڈی ہوا آئی تھی' خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے' بلکہ پھر یہیں سے مسلمانانِ عرب کی مدد کا سامان فراہم ہو سکے... اور اس طرح اگر ہماری مساعی ان لشکروں کا راستہ صاف کرنے میں کام آ جائیں جو حضرت مہدی کی مدد کے لیے جائیں گے تو ہماری سعادت اور فوز و فلاح کے لیے یہی کافی ہے... اور جیسا کہ بعد میں تفصیل سے واضح کیا جائے گا' اسرائیل کے وجود میں آنے سے ایک سال قبل پاکستان کا خالص معجزانہ طور پر قیام مشیت ایزدی میں یقیناً اسی کی تمہید ہے...!!

جہاں تک پہلے منفی تاثر کا تعلق ہے تو مختصر ترین الفاظ میں گزارش ہے کہ پیشین گوئیاں صرف احادیث نبوی ﷺ ہی میں بیان نہیں ہوئیں' خود قرآن میں بھی وارد ہوئی ہیں' لیکن ان سے وہ مطلب نکالنا جو پروفیسر ابراہیم صاحب نے نکالا ہے' کسی طرح درست نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اہم ترین اور نمایاں ترین پیشین گوئی وہ تھی جو سورۃ الروم کے آغاز میں وارد ہوئی' یعنی:

﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ③ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ط لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ط وَ یَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ④ بِنَصْرِ اللّٰهِ ط یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ط وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ⑤﴾

''ال م۔ قریب کی سرزمین (یعنی شام) میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں' اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر دوبارہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کل معاملہ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس روز اہل ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے طفیل فرحاں وشاداں ہوں گے۔ اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے، اور وہ زبردست (اور) رحم فرمانے والا ہے۔'' (آیات 1 تا 5' زمانۂ نزول لگ بھگ 614ء)

چنانچہ یہ اعجازِ قرآنی کا بہت عظیم مظہر ہے کہ نو ہی سال بعد یعنی 623ء میں ایک جانب قیصر روم ہرقل کو ایرانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی بدر میں کُفارِ مکہ پر عظیم فتح حاصل ہوئی اور اس طرح یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔ لیکن ذرا پروفیسر ابراہیم صاحب غور فرمائیں کہ کیا آج سے چودہ سو سال قبل بھی کسی شخص نے قرآن کی ان آیات سے یہ مطلب نکالا ہوگا کہ ان کے ذریعے قرآن ایک جانب رومیوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو' بلکہ ایرانیوں کی خدمت میں دست بستہ ''سر تسلیم خم'' کیے رکھو؟ اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کر رہا ہے کہ کفر اور اہل کفر کے مقابلے کی کوئی سعی کرو نہ جانفشانی اور سرفروشی سے کام لو' بلکہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو اور صرف اللہ کی مدد کا انتظار کرتے رہو؟ اور اگر بفرضِ محال کسی نے ان آیاتِ مبارکہ سے یہ مطلب اخذ کیا ہو تو کیا اس کا کوئی الزام

قرآن پر آئے گا؟

اسی طرح اگر نبی اکرم ﷺ نے مکی دور کے بھی آغاز ہی میں یہ "خوش خبری" دے دی تھی کہ اے مسلمانو! عنقریب قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں تلے ہوں گے' تو کیا اس سے مراد یہ تھی کہ تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہو' یہ انقلاب عظیم از خود اور خود بخود رونما ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس "پیشین گوئی" سے یہ مطلب اخذ کرنا نہ اس وقت درست تھا نہ آج درست ہے!

کاش کہ پروفیسر ابراہیم صاحب اور ان کی طرز پر سوچنے والے تمام حضرات کو معلوم ہو کہ ع "میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو" کے مصداق راقم کی تو پوری زندگی کی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہی یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو: ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

کے مصداق اپنی حالت بدلنے پر آمادہ کرے' لیکن اس کے لیے ظاہر ہے کہ یہ لازم ہے کہ موجودہ حالات کا صحیح اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور ملت کے امراض کی صحیح تشخیص کی جائے' تا کہ صحیح اور مفید و مؤثر علاج تجویز کیا جا سکے۔ اور ایسا نہ ہو کہ پوری توجہ کو صرف ظاہری علامات ہی کے ازالے پر صرف کر کے قیمتی وقت ضائع کر دیا جائے اور اس طرح مہلتِ اصلاح ختم ہو جائے اور بالآخر سوائے ناکامی و نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ آ سکے۔ چنانچہ جس طرح کبھی علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اور: ؎

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

یعنی "اے اُمت مسلمہ! تُو ذلیل و خوار تو اس سبب سے ہوئی ہے کہ تُو نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے' لیکن تُو شکوہ گردشِ دوراں کا کر رہی ہے!" اور "اے وہ قوم جو شبنم کے مانند زمین پر پڑی ہوئی ہے! (اور دشمن تجھے پاؤں تلے روند رہے ہیں) تیری بغل میں وہ کتابِ زندہ موجود ہے (جو تجھے اس ذلت و رسوائی سے رستگاری عطا کر سکتی ہے!)"... اسی طرح ان گزارشات کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہم اِس وقت در حقیقت اس جرم کی پاداش میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہیں کہ ہم دنیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نمائندے اور اس کے دینِ حق کے علمبردار ہونے کے مدعی ہو کر اپنے عمل کے ذریعے ان سب

کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اور ؎

فلک کا جورِ مسلسل جواب دے اس کا
ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟

کے سوال کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ اس عذابِ الٰہی سے نجات کے حصول کا راستہ صرف یہ ہے کہ ہم ابتداءً کم از کم کسی ایک خطۂ ارضی میں اللہ کے کامل دینِ حق اور اس کے معتدل اور متوازن نظامِ عدلِ اجتماعی کو بلا کم و کاست قائم کر کے اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کر دیں اور اس طرح شہادت علی الناس کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں جس کے لیے ہمیں بحیثیت اُمت برپا کیا گیا تھا۔ اور ع "گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!" کے مصداق اگر ہم اس بنیادی جرم سے باز نہیں آتے اور اس اصل کوتاہی کی تلافی نہیں کرتے تو نہ امریکہ کی کاسہ لیسی ہمارے امراض کا ازالہ کر سکتی ہے نہ کوریا کی نقالی ہماری ترقی اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ: ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ!

کے مطابق اُمتِ مسلمہ کا معاملہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نہیں، بلکہ ہر اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے۔

اب اس سے پہلے کہ کتب حدیث کے "ابواب ملاحم" یعنی تاریخ انسانی کے آخری دور میں پیش آنے والی عظیم اور تباہ کن جنگوں کے سلسلے کے تذکرہ پر مشتمل ابواب کی چند اہم احادیث اور ان میں سے خاص طور پر ایسی احادیث کا تذکرہ کیا جائے جن میں واردشدہ پیشین گوئیوں کا عالمِ واقعہ میں ظہور بالکل ایسے انداز میں شروع ہو چکا ہے جیسے صبح طلوع ہوتی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ عالمِ مادّی میں وہ عظیم جنگیں جن اسباب کی بنا پر ظہور میں آئیں گی ان سے قطع نظر مشیت ایزدی میں ان کی غرض و غایت کیا ہو گی؟

یہ بات ان احادیث سے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہی ہے کہ ان جنگوں کا میدان مشرقِ وسطیٰ بنے گا، عالمی حالات اور واقعات بھی ایک عرصہ سے اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ آئندہ جنگ عظیم یعنی اس صدی کی تیسری عالمگیر جنگ یورپ میں نہیں مشرقِ وسطیٰ میں لڑی جائے گی۔ اس لیے بھی کہ یورپ دو عالمگیر جنگوں کی تباہی برداشت کر کے اب اتنا "سمجھ دار" ہو گیا ہے کہ تیسری جنگ کا میدان اپنے علاقے کو نہیں بننے دے گا، اور اس لیے بھی کہ عہد حاضر کی سب سے زیادہ قیمتی متاع یعنی تیل کے عظیم ترین ذخائر اسی علاقے میں ہیں جسے بجا طور پر سیال سونا کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس علاقے میں موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی اُمتِ محمد ﷺ کا افضل تر حصہ یعنی "اُمیین" یا عرب مسلمان تو چودہ سو برس سے آباد ہیں ہی، اس صدی کے آغاز سے سابقہ اور معزول شدہ اُمتِ مسلمہ یعنی

یہودیوں کی بھی ازسرنو آبادکاری زور وشور کے ساتھ شروع ہوگئی تھی' جوعنقریب اپنے کلائمیکس کو پہنچ جائے گی اور پوری دنیا سے تمام یہودی کشاں کشاں یہیں آ کر آباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان عظیم جنگوں یا سلسلۂ ملاحم کے ذریعے ہولناک تباہی کی صورت میں اللہ کے قانونِ عذاب کے مطابق شدید ترین کوڑے ان ہی دونوں پر پڑیں گے' لیکن ان کے مابین بالآخر ایک عظیم فرق و تفاوت ظاہر ہو گا۔ یعنی سابقہ معزول' مغضوب اور ملعون اُمت یعنی یہود پر تو اللہ کے اس ''عذابِ اکبر'' کے فیصلے کا نفاذ ہو گا جس کی مستحق وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کفر اور آنجناب علیہ السلام کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھوا دینے کی بنا پر اب سے دو ہزار برس قبل ہو چکی تھی' لیکن جس کے نفاذ کو ایک خاص سبب سے مؤخر کر دیا گیا تھا' چنانچہ اب اسے ان ہی حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے اور مسلمانوں کے ہاتھوں نسیاً منسیاً اور نیست و نابود کر دیا جائے گا' بالکل جیسے حضراتِ نوح' ہود' صالح' لوط اور شعیب علیہم السلام کی اقوام اور آلِ فرعون اپنی اپنی جانب بھیجے جانے والے رسولوں کی نگاہوں کے سامنے ہلاک کیے گئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس چونکہ موجودہ اُمتِ مسلمہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی اُمت ہے اور آنحضور ﷺ کے قول کے مطابق خود آخری اُمت کی حیثیت رکھتی ہے' مزید برآں وہ صرف ایک نسل پر مشتمل نہیں بلکہ ''ملٹی نیشنل'' اُمت ہے' لہٰذا اسے اس کے جرائم کے بقدر سزا دینے کے بعد توبہ کی توفیق اور اصلاح کا موقع عنایت کر دیا جائے گا جس سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور دینِ حق کے غلبے کا دورِ ثانی شروع ہو گا' جو اس بار پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی کو محیط ہو گا' جس کی صریح اور واضح خبریں دی ہیں جناب صادق و مصدوق ﷺ نے' اور جس کی کوئی ادنیٰ جھلک اور دھندلی تصویر دیکھ لی تھی چودھویں صدی ہجری کے نابغہ اور وِژنری علامہ اقبال نے جس پر وہ خود بھی حیرت واستعجاب کی تصویر بن کر رہ گئے تھے کہ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اور

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اور یہ غالباً صرف اس افضل ترین اُمت کے بھی افضل تر حصے کی سزا میں ایک انگریزی محاورے کے مطابق ''تکلیف پر توہین کے اضافے'' (To add insult to injury) کی غرض سے ہوا ہے کہ ایک مغضوب وملعون اور "Condemned" قوم کو دو ہزار سال تک باقی بھی رکھا گیا اور پھر عارضی طور پر سنبھالا بھی دیا گیا (اگرچہ اس کے لیے یہ مرنے والے مریض کے آخری سنبھالے یا بجھنے والی شمع کی آخری بھڑک کی حیثیت رکھتا ہے)' تاکہ موجودہ اُمتِ مسلمہ کے افضل ترین حصے کو اس کے ہاتھوں پٹوا کر گویا وہ صورت پیدا کر

دی جائے جو یوپی کے دیہات میں اختیار کی جاتی ہے' یعنی یہ کہ کسی شخص کی سزا میں توہین و تذلیل کا عنصر شامل کرنے کے لیے اسے کسی چمار کے ہاتھوں جوتے لگوائے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم!

خلیج کی جنگ: ''جنگوں کی ماں؟''

آج سب سے پہلی تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ جمعہ کے کالم میں حضرت مہدی کے نام کے ساتھ ہر جگہ ''علیہ السلام'' کی مخفف علامت '' '' درج ہوئی ہے۔ یہ ادارہ نوائے وقت کے کسی کارکن کے حسن عقیدت کی مظہر ہے' جو میرے مسودے میں موجود نہیں تھی۔ میرے نزدیک اگرچہ خالص لغوی اور لفظی اعتبار سے تو جب ہم مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' کہتے ہیں تو یقیناً کسی زندہ یا فوت شدہ مسلمان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ قرآن حکیم میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ﴾ (الاحزاب: 43) یعنی اے اہل ایمان! ''اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہتا ہے'' تو اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی بھی حاضر و موجود مسلمان سے ''صلی اللہ علیک'' اور فوت شدہ یا غیر موجود مسلمان کے لیے ''صلی اللہ علیہ'' کے دعائیہ الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اُمت کے تعامل یا دستور اور روایت کے تحت ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لیے' ''علیہ السلام'' بقیہ جملہ انبیاء اور رسولوں کے لیے' ''رضی اللہ عنہ'' صحابہ کے لیے' ''رحمۃ اللہ علیہ'' بقیہ جملہ بزرگانِ دین اور ائمہ علم و ہدایت کے لیے اور ''مرحوم'' عام مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں' اور ان کے استعمال کے معاملے میں ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!'' کے پیشِ نظر احتیاط لازمی ہے۔ اس معاملے میں اہل تشیع کا اپنا جداگانہ معمول ہے جو اُن کے عقائد پر مبنی ہے۔ وہ چونکہ ائمہ اہل بیت کو ''معصوم'' قرار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کا رتبہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بہت قریب ہو جاتا ہے' لہٰذا وہ ان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ''مہدیٔ موعود'' سے مراد اُن کے بارہویں امام یعنی حضرت حسن عسکریؒ کے صاحبزادے محمد المہدیؒ ہیں' جن کی ولادت تیسری صدی ہجری میں ہوئی تھی اور جو ان کے قول کے مطابق اس وقت سے تاحال روپوش (غائب) ہیں اور قیامت کے قریب ''ظاہر'' ہوں گے' لہٰذا وہ ان کے نام کے ساتھ ''علیہ السلام'' لکھتے ہیں۔ جب کہ اہل سُنّت کے نزدیک حضرت مہدی اگرچہ ہوں گے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہی میں سے' لیکن ان کی پیدائش قیامت کے قریب عام انسانوں کی طرح عبداللہ نامی شخص کے گھر میں ہوگی' اور وہ ''سلسلۂ ملاحم'' کے پُرآشوب دَور میں مسلمانانِ عرب کی رہنمائی اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اور اب آیئے اصل مضمون کی طرف۔ اس دنیا کے خاتمے سے قبل عالمی غلبۂ اسلام اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کو میں نصوصِ شرعیہ میں سے قرآن حکیم سے دلالت نص کی بنیاد پر' اور

احادیث نبویہ ﷺ سے صراحت نص کی اساس پر ثابت کر چکا ہوں۔ مزید برآں علامہ اقبال کے ''وژن'' کے علاوہ اس کی عقلی اور سائنسی دلیل بھی علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے سب سے بڑے شارح اور اقبال اکیڈمی کے اوّلین ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے نظریۂ ارتقاء سے استشہاد کے حوالے سے بیان ہو چکی ہے۔ رہا ان عظیم واقعات وحوادث کا معاملہ جن کی خبریں اس سے متصلاً قبل کے دور کے ضمن میں احادیث نبویہ ﷺ میں وارد ہوئی ہیں' تو ان میں سے بھی سوائے ایک یعنی نزولِ مسیح علیہ السلام کے اور کوئی بات نہ خلافِ عقل وقیاس ہے نہ مخالف قوانین طبعی۔

چنانچہ جب اس بیسویں صدی عیسوی کے دوران اس سے قبل دو عظیم جنگیں ایسی واقع ہو چکی ہیں جن کا سلسلہ کئی کئی سال تک جاری رہا' اور جن سے بڑے بڑے ملک بھی تہس نہس ہوئے اور کروڑوں کی تعداد میں انسان بھی قتل یا معذور ہوئے' تو کون سی قابلِ تعجب اور خلافِ عقل بات ہو گی اگر ایک تیسری عظیم جنگ بھی واقع ہو جس کا میدان مشرقِ وسطی کے عرب ممالک بنیں' اور اس کا سلسلہ بھی کئی سالوں کو محیط اور کئی ادوار پر مشتمل ہو' اور اس کے نتیجے میں جہاں عظیم تعداد میں عرب مسلمان بھی قتل ہوں وہاں ان یہودیوں کا تو بالکل ہی قلع قمع ہو جائے جو دنیا کے کونے کونے سے وہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔

اسی طرح تاریخ انسانی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی قوم یا ملک کے حالات انتہائی ابتر ہو جاتے ہیں تو

خونِ اسرائیلؑ آ جاتا ہے آخرؑ جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!

کے مصداق بظاہر مردہ اور از کار رفتہ قوم میں سے بھی دفعۃً کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر آتی ہے جو قوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دیتی ہے اور ع ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے!'' کے مصداق نحیف و ناتواں اور کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں کو بھی عظیم قوتوں سے مقابلے کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں ''خونِ اسمٰعیلؑ'' بھی جوش میں آ جائے اور ؎

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!

کے مطابق اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شاخ پر کوئی گل سرسبد کھل اٹھے؟

تاہم آج سے ساڑھے بارہ سال قبل جب میں نے پندرہویں صدی ہجری کے متوقع حوادث وواقعات کے موضوع پر تقریر کی تھی تو خود مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سلسلہ اس قدر جلد شروع ہو جانے والا ہے۔ مزید برآں جس حدیث نبوی ﷺ کی بنیاد پر میں نے یہ بات کہی تھی کہ قیامت کے قریب پیش آنے والی عظیم جنگوں کا پہلا دور اس طور سے شروع ہو گا کہ مسلمان اور عیسائی متحد ہو کر کسی تیسری قوت کے خلاف جنگ کریں

گے جس میں انہیں فتح حاصل ہوگی' وہ سنن ابی داؤد کی کتاب الملاحم میں حضرت ذومخبر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: ''عنقریب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے بھرپور صلح کرو گے اور پھر وہ اور تم متحد ہو کر ایک ایسے دشمن کے خلاف جنگ کرو گے جو تمہارے عقب میں واقع ہوگا۔ پھر تمہاری مدد ہوگی' چنانچہ تم غنیمت حاصل کرو گے اور خود سلامت رہو گے!'' اور اس وقت گمانِ غالب یہ تھا کہ اس جنگ میں ایک جانب امریکہ کی سربراہی میں یورپ کی جملہ عیسائی حکومتیں اور اکثر مسلمان ملک خصوصاً عرب حکومتیں ہوں گی اور دوسری جانب روس اور اس کے طفیلی ممالک ہوں گے۔ اور اس وقت یہ خیال تک نہ ہو سکتا تھا کہ اس وقت سوویت یونین تو ''یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری!'' کا نقشہ پیش کر رہی ہوگی' اور وہ تیسری طاقت عین جزیرہ نمائے عرب کے ''عقب'' میں واقع ہوگی' یعنی صدام حسین کی سربراہی میں عراق کی بعثی حکومت! حالانکہ نہایت مستند احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ عراق میں سونے کا خزانہ یا پہاڑ برآمد ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہاں نہایت خون ریز اور خوفناک جنگ ہوگی' لیکن چونکہ ان احادیث کے متن میں کوئی لفظی تعلق قیامت سے قبل کے سلسلۂ ملاحم کے ساتھ موجود نہیں ہے' لہٰذا ان میں وارد خبر کو ایک جداگانہ اور مستقل بالذات معاملہ سمجھا گیا۔

لیکن اب جب کہ الفاظِ قرآنی ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ کے مصداق وہ واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے' ان احادیث نبویہ ﷺ کی عظمت بھی اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ: (1) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک خزانہ برآمد ہو جائے گا!'' اور (2) صحیح مسلم میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہو جائے گا۔ چنانچہ جب لوگ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تو جو لوگ اس کے پاس ہوں گے وہ سوچیں گے کہ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساری دولت لے جائیں گے۔ پھر اس پر جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ ہلاک ہو جائیں گے!'' (ان احادیث کو پڑھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ قدیم زمانے میں ملکوں اور علاقوں کو دریاؤں یا پہاڑوں یا بڑے شہروں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج عام تھا!) تو ذرا غور فرمائیں کہ کیا یہ بات محض ''اتفاقی'' ہے اور عظمت حدیث کی دلیل نہیں کہ آج تیل کی دولت کو ''سیال سونا'' قرار دیا جا رہا ہے؟ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خلیج کی جنگ کا اصل باعث یہی تیل کی دولت ہے؟ مزید برآں کیا یہ امر قابل توجہ نہیں ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے اس جنگ کو ''اُمّ المحارب'' یعنی جنگوں کی ماں یا جنگوں کے سلسلے کا نقطۂ آغاز قرار دیا؟ (واضح رہے کہ صدام حسین خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں دینی اعتبار سے کتنی ہی ناپسندیدہ شخصیت' اور مسلمانوں اور اسلام کے حق میں اسم بامسمّٰی یعنی ''صد+دام'' یعنی سو داموں یا جالوں کی حیثیت رکھتا ہو' بہرحال

عرب ہونے کے ناتے قرآن سے بھی واقف ہے اور حدیث نبوی ﷺ سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر 1990ء میں مَیں نے اس کا جو طویل انٹرویو لاس اینجلس میں سی این این پر دیکھا تھا' جو ایک نہایت ماہر و شاطر شخص جان رادر نے لیا تھا' اس کے موقع پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کی پشت پر جو طغریٰ آویزاں تھا وہ سورۃ الانبیاء کی آیت 18 کے اس حصے کا تھا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ یعنی ''ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں جو اس کے دماغ کا بھرکس نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے!'')

رہی یہ بات کہ ننانوے فیصد کی ہلاکت کی بات صحیح ثابت نہیں ہوئی' تو اوّلاً اس کا بھی امکان ہے کہ وہ الفاظ کسی خاص محاذ سے متعلق ہوں' مثلاً' جیسے کہ سب کو معلوم ہے' کویت سے پسپا ہونے والی عراقی فوج کا جو حشر ہوا اس پر تو یہ الفاظ پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اور ثانیاً ابھی عراق کا معاملہ ختم کہاں ہوا ہے؟ ابھی تو صدام حسین امریکہ اور اس کے حواریوں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بنا ہوا ہے کہ نہ اُگلی جائے نہ نگلی جائے! (اس لیے کہ اس کے خاتمے کا مطلب اس پورے علاقے کو ایران کے حلقۂ اثر میں دے دینا ہوگا!) تو کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر کسی آئندہ راؤنڈ میں امریکہ اور اس کے اتحادی دو سال قبل کی وحشیانہ بمباری سے بھی سو گنا زیادہ پیمانے پر بمباری کریں اور کسی خاص شہر یا علاقے میں تباہی اس درجہ کی ہو جائے جس کا نقشہ حدیث نبوی ﷺ میں سامنے آتا ہے! اس لیے کہ خلیج کی جنگ سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ان کے کسی ایک سپاہی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے خواہ دشمن کا بچہ بچہ ہلاک ہو جائے۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت یوحنا کے مکاشفات میں بھی' جو بائبل کے عہد نامہ جدید کی آخری کتاب میں درج ہیں' عراق کی ایسی ہی شدید تباہی کا ذکر بتکرار و اعادہ موجود ہے۔ ان مکاشفات میں عراق کو ''بڑے شہر بابل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے' اور سب سے حیران کن امر یہ ہے کہ اس ''شہر'' کے تین ٹکڑے ہو جانے کی نہایت واضح الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔ (دیکھئے کتاب ''مکاشفات'' کے باب 16 کی آیات 18' 19) اور آج یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ عراق بالفعل تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ شمال میں کردستان تقریباً خود مختار ہو چکا ہے اور جنوبی علاقے کو ''نوفلائی زون'' قرار دے کر عملاً عراق کی حکومت کے کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا ہے' اور صرف بقیہ درمیانی علاقے پر حکومت بغداد کی واقعی عملداری باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح آج سے ساڑھے بارہ سال قبل خود میرے لیے یہ بات ناقابل قیاس تھی کہ دنیا میں پھر کوئی ''صلیبی جنگ'' چھڑ سکتی ہے اور سند کی بنیاد پر حدیث نبوی ﷺ پر اعتماد کے باوجود مغربی دنیا کے عام سیکولر مزاج کے باعث یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جن ''ملاحم'' یعنی جنگوں کی احادیث میں خبر دی گئی ہے ان کا دوسرا دور

''مذہبی'' اساس پر ہوگا۔لیکن اب یہ حقیقت چشم سر کے سامنے موجود ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا سے ایک ''صلیبی جنگ'' کا بالفعل آغاز ہو چکا ہے۔ یاد ش بخیر' یہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی ایک عظیم الشان سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور ایک چھوٹے سے ملک ترکی کے سوا دنیا کے نقشے سے اس کا نام ونشان مٹ گیا' اور اختتام پر بھی ایک عظیم سلطنت یعنی سوویت یونین نسیامنسیا ہوگئی۔ اسی طرح اس کی پہلی دہائی میں بھی ایک جنگِ بلقان ہوئی تھی جو پہلی عالمگیر جنگ کی تمہید بنی تھی اور آخری دہائی میں بھی دوسری جنگ بلقان شروع ہو چکی ہے جو احادیث نبوی ﷺ میں وارد پیشین گوئی کے مطابق تیسری عالمگیر جنگ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگی۔ واللہ اعلم!

اہلِ مغرب سیاسی نظریے کی حیثیت سے سیکولرزم کے ساتھ اپنی تمام تر وابستگی اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے اپنی مبینہ رواداری اور وسیع المشربی کے باوجود تا حال جذباتی اور نفسیاتی سطح پر جس مذہبی عصبیت ہی نہیں تعصب میں مبتلا ہیں اس کا ایک نمایاں مظہر تو یہ ہے کہ ترکی اپنے آپ کو مغربی تہذیب وتمدن میں پوری طرح رنگ دینے اور سیکولرزم کو نہ صرف عملاً اختیار کرنے بلکہ دستور وآئین کی سطح پر اسے مضبوط ترین تحفظات عطا کرنے اور اس طرح گویا ع ''میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!'' پر پوری طرح عمل پیرا ہو جانے کے باوجود تا حال یورپ کی ''مس کامن مارکیٹ'' کو ع ''ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!'' پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اور دوسرا اہم مظہر' جس کی جانب اکثر مسلمانوں کی توجہ اس بنا پر نہیں ہوئی کہ وہ خود اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں' یہ ہے کہ سال 1992ء کو پوری مغربی دنیا نے ''اسپین کا سال'' قرار دے کر جوش وخروش سے منایا۔ چنانچہ پورا ملک دلہن کی طرح سجایا گیا اور ورلڈ اولمپک وہاں رکھ کر پوری دنیا کو وہاں آنے کی دعوت دی گئی' تاکہ دنیا بھر کے لوگ ان کے جشن مسرت میں شریک اور ان کی مسرت وشادمانی کی شدت کا مشاہدہ کر سکیں... اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ چونکہ 1492ء سقوطِ غرناطہ کا سال تھا' لہٰذا 1992ء میں سپین سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کو پورے پانچ سو سال مکمل ہو گئے تھے! اس سے بھی بڑھ کر قابلِ غور بات یہ ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد عرب اسرائیل مذاکرات کے لیے میڈرڈ کو کیوں منتخب کیا گیا' جہاں اس سے قبل کبھی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا ممکن ہے کہ عربوں کو اسرائیل کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے کی ''ذلت'' کے ساتھ ساتھ بقولِ اقبال ''تہذیب حجازی کے مزار'' کی زیارت کرانی مقصود تھی؟

اور اس ''صغریٰ'' پر اضافہ کر لیجیے اس ''کبریٰ'' کا کہ کمیونزم کے زوال اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد پوری مغربی دنیا نے ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کو اپنے لیے خطرہ نمبر ایک قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ مغربی آقاؤں کی زیر ہدایت مصر اور الجزائر میں تو احیائے اسلام کے علمبرداروں پر تعذیب وتشدد کی بھٹی دہک ہی چکی ہے' سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی تحقیق وتفتیش اور دارو گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے' اور کوئی عجب

نہیں کہ اس پر ردِ عمل کے طور پر دینی مزاج کے حامل عرب نوجوان بالخصوص وہ جن کے احیائی جوش اور جذبے کو جہادِ افغانستان نے زبردست مہمیز دے دی ہے' مشتعل ہو کر بے قابو ہو جائیں اور کوئی عظیم ہنگامہ برپا ہو جائے' جس کی گرما گرمی میں کسی مقام پر وہ واقعہ بھی پیش آ جائے جس کا ذکر سنن ابی داؤد کی محولہ بالا روایت میں ہے' یعنی: (عیسائیوں کے ساتھ مل کر ایک مشترک دشمن کے خلاف جنگ اور اس پر فتح حاصل ہونے کے بعد) ''پھر تم واپس آؤ گے اور ایک ٹیلوں والے نخلستان میں پڑاؤ کرو گے تو نصرانیوں میں سے ایک شخص اُٹھ کر صلیب بلند کرے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آ گئی۔ اس پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضب ناک ہو کر صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ اس پر رومی (عیسائی) صلح ختم کر دیں گے اور بڑی جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے!'' واضح رہے کہ اس قسم کے واقعات بسا اوقات بارود کو چنگاری دکھانے کے مترادف بن جایا کرتے ہیں... اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نجد کے شمال مشرقی علاقے میں' جو امریکہ کے فوجی اڈے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' کسی بھی وقت رونما ہو سکتا ہے۔

قصہ مختصر' ایک عظیم ''صلیبی جنگ'' کے لیے میدان تیزی کے ساتھ ہموار ہو رہا ہے' جو احادیث نبویہ ﷺ کے مطابق بہت طویل ہو گی اور جس کے کئی مراحل ہوں گے' جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ البتہ ایک بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے دوران ایک جنگ جسے ''الملحمة العظمٰی'' قرار دیا گیا ہے' نہایت عظیم اور حد درجہ خوفناک ہو گی۔ (اس موضوع پر ایک نوجوان محقق قاضی ظفر الحق نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تحقیق کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون گزشتہ سال آٹھ اقساط میں ''ندائے خلافت'' میں شائع کیا گیا تھا جو ہنوز نامکمل ہے۔ مکمل ہونے پر اسے اِن شاء اللہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔) تاہم اس کا اصل حاصل اور لُبِّ لباب یہ ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں اُمتِ مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب کو اُن کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی جس کا ارتکاب انہوں نے دینِ حق کے نظامِ عدل و قسط کو ایک کامل نظامِ زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔ ان جنگوں میں ایک مرحلے پر ''دارالاسلام'' صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے ''دروازوں'' تک پہنچ جائے گا۔ لیکن پھر رحمتِ خداوندی جوش میں آئے گی' مسلمانانِ عرب ایک نئی ہیئتِ اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد و امیر محمد بن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر ''بیعت'' کر کے جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔

اس موقع پر بھی یہ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہو گا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ کا ذکر موجود ہے جو حق اور باطل کے مابین ہو گی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے جن مکاشفات کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ان ہی میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے' بلکہ یہ صراحت بھی ہے

کہ اس میں حصہ لینے کے لیے ''مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں'' بھی آئیں گی! مکاشفات میں اس جنگ کے دن کو ''خدائے اعظم و قادر کا دن'' کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ''آرمیگاڈان'' بتایا گیا ہے۔ (دیکھئے ''مکاشفات'' باب 16' آیات 12 تا 16) گویا حدیث نبوی ﷺ کا ''المَلحَمۃُ العُظمٰی'' اور بائبل کا ''آرمیگاڈان'' ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں!

احادیثِ نبویہ ﷺ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگا' اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران اس صورتِ حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روکے رکھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کی۔ (چنانچہ اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل شوارزکوف نے تو بعد میں ؎

نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا!

کے مصداق یہ ''اَن کہنی'' بھی کہہ ہی دی کہ ''ہم نے یہ جنگ اسرائیل کے تحفظ ہی کے لیے لڑی تھی!'')---- تاہم جب حضرت مہدیؒ کی قیادت میں اور مشرق سے آنے والی کمک کی مدد سے مسلمانانِ عرب کامیابیاں حاصل کرنی شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ ''المَسِیحُ الدَّجّال'' کے خروج کا ہوگا---- جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہوگا' بلکہ پوری قومِ بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذابِ استیصال نازل ہو جائے گا جس کے مستحق وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار کر کے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اگرچہ ابتداءً مسیح الدجال کے ہاتھوں ''عظیم تر اسرائیل'' وجود میں آ جائے گا' تاہم بالآخر وہی ''عظیم تر اسرائیل'' سابقہ معزول و مغضوب اُمت مسلمہ کا ''عظیم تر قبرستان'' بن جائے گا۔

جہاں تک دجالی فتنے' دجالِ اکبر اور مسیح الدجال کی شخصیت (یا شخصیتوں) کا تعلق ہے' واقعہ یہ ہے کہ ان کا ذکر احادیث نبویہ ﷺ میں جن مختلف پیرایوں میں آیا ہے ان کے بعض پہلو کم از کم راقم الحروف کے علم و فہم کی حد تک تا حال عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں' جن کے حل کے لیے کسی عظیم اور محقق محدث ہی کا انتظار کرنا ہو گا۔ البتہ اس مسئلے کے چند پہلو بالکل واضح بھی ہیں' بالخصوص ''ملاحم'' کے سلسلے میں جس مسیح دجال کے خروج کا ذکر آتا ہے اس کا معاملہ اپنی جگہ بھی بالکل واضح ہے' اور دنیا کے موجودہ حالات جو رُخ اختیار کر چکے ہیں ان کے پیش نظر تو بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ظہور و خروج کے لیے سٹیج بھی بالکل تیار ہو چکا ہے۔

دجالی فتنے کے بارے میں اب سے کوئی ساٹھ برس قبل سورۃ الکہف کے حوالے سے ایک نہایت مفصل اور

عالمانہ تحریر ایک ایسے عالم و فاضل شخص کے قلم سے نکلی تھی جو معقول و منقول اور شریعت و طریقت چاروں کے جامع بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک میں نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے کے حامل بھی' یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ راقم کو ان کے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق ہے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان مباحث کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے سورۃ الکہف کے دروس میں بیان کیا ہے' جو بحمد اللہ آڈیو کیسٹس کی صورت میں محفوظ ہیں۔

ان مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ دجالی فتنے سے مراد عہد حاضر کی مادہ پرستانہ تہذیب ہے جس کے پورے تانے بانے اور تمام تر رگ و پے میں یہ نقطۂ نظر سرایت کیے ہوئے ہے کہ اصل اہمیت کی حامل اور توجہ والتفات کے قابل یہ کائنات ہے نہ کہ خالق کائنات کی ذات' اور مادّہ اور اس کے خصائص و قوانین ہیں نہ کہ روح اور اس کی کیفیات' اور یہ حیاتِ دُنیوی اور اس کی فلاح و بہبود ہے نہ کہ حیاتِ اُخروی اور اس کی فوز و نجات۔ چنانچہ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ خالق نے انسان کو علم کے حصول کے جو دو ذرائع عطا کیے تھے' یعنی (1) حواسِ ظاہری اور ان سے حاصل شدہ معلومات سے استدلال اور استنباط کے لیے عقل کا استعمال؛ اور (2) مافوق الطبیعی حقائق تک رسائی اور عملی ہدایت کے لیے وحی آسمانی کی پیروی' ان میں سے انہوں نے مؤخر الذکر سے بالکل صرفِ نظر کر لیا ہے اور ساری توجہ کو صرف مقدم الذکر پر مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو بے پناہ ترقی ہوئی لیکن اخلاق اور انسانیت کا دیوالہ نکل گیا۔ اس اعتبار سے اگر تہذیب حاضر کو ''یک چشمی'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی مادّی آنکھ تو چوپٹ کھلی ہوئی ہے جب کہ روحانی آنکھ بالکل بند ہو چکی ہے۔ بہر حال اس دجالی فتنے نے اگرچہ اس وقت پورے کرۂ ارضی اور تمام عالم انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے' لیکن زیادہ افسوس اور ملامت و ماتم کے قابل ہے اُمتِ مسلمہ اور اس کا بھی افضل اور برتر حصہ یعنی مسلمانانِ عرب' کہ وہ بھی قرآن حکیم ایسی کامل اور محفوظ کتابِ ہدایت کے حامل اور اس پر ایمان کے مدّعی ہونے کے باوجود اس فتنے میں پوری شدت کے ساتھ' بلکہ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہی مبتلا ہیں۔ چنانچہ کتاب الملاحم کی احادیث میں بھی ایک ایسے فتنے کا ذکر ہے جس سے ''عرب کا کوئی گھر نہیں بچے گا'' اور بظاہر احوال وہ یہی مادہ پرستی اور اس کے لازمی نتیجے یعنی عیاشی و فحاشی کا فتنہ ہے جو اِن کے معاشرے میں اس لیے زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے یہاں سیّال سونے کے باعث دولت کی شدید ریل پیل ہو گئی ہے۔

بہر حال' نبی اکرم ﷺ نے جس دجالی فتنے کے اثرات سے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے سورۃ الکہف اور خصوصاً اس کی ابتدائی اور آخری آیات کو اکسیر کی سی تاثیر کی حامل اور تیر بہدف قرار دیا ہے وہ یہی مادہ پرستی' دنیا پرستی' زر پرستی اور شہوات پرستی کا فتنہ ہے!

اور اب آیئے دجال یا دجالوں کی جانب' تو ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے بعد

نبوت کا دعویٰ کرنے والے تمام اشخاص کو ''دجال'' قرار دیا ہے' اور ایک حدیث میں ان کی تعداد بھی بیان فرما دی ہے' یعنی تیس۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا کم از کم راقم کے لیے مشکل ہے کہ آیا وہ ''دجالِ اکبر'' جس کے فتنے سے آنحضور ﷺ سمیت جملہ انبیاء علیہم السلام نے خود بھی اللہ کی پناہ مانگی اور اپنی اُمتوں کو بھی خبردار کیا' جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور جملہ اہل ایمان کے ایمان کے لیے شدید امتحان بن جائے گا' اور وہ مسیح الدجال جس کا ذکر کتاب الملاحم میں آخری زمانے کی جنگوں کے سلسلے میں آتا ہے' ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دو جدا اشخاص ہوں گے۔ البتہ جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے اس کا معاملہ بالکل واضح اور بآسانی سمجھ میں آ جانے والا ہے۔

دراصل یہود کی روایات اور عہد نامۂ قدیم میں مذکور انبیاء کرام ؑ کی پیشین گوئیوں میں ایک ایسے ''مسیحا'' کی خبر تواتر کے ساتھ وارد ہوئی تھی جو بنی اسرائیل کو ''ذلت'' اور ''مسکنت'' سے نجات دلا کر انہیں ارضِ مقدس کے علاوہ اس پورے علاقے پر از سر نو غلبہ اور تمکن عطا کر دے گا جہاں تاریخ کے کسی بھی دور میں انہیں حکومت یا بالادستی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مکابی سلطنت کے زوال کے بعد جب بنی اسرائیل پر پہلے یونانیوں اور پھر رومیوں کی محکومی مسلط ہوئی تو وہ اپنے ''مسیح موعود'' کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن جب وہ مسیح موعود عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی صورت میں تشریف لے آئے تو یہود کی انتہائی بدبختی کہ انہوں نے بحیثیت مجموعی ان کا انکار کیا اور انہیں صرف ردّ ہی نہیں کیا' بلکہ کافر اور مرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دے دیا اور اپنے بس پڑتے تو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنجناب علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہود کے یہاں ''مسیح'' کی جگہ تاحال خالی ہے اور وہ اپنے مسیحا کا اب بھی انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے بعد سے اب تک یہودیوں پر جس ذلت و مسکنت اور نکبت و اِدبار کے سائے رہے' اُن کے مختلف اَدوار کی تاریخ کسی گزشتہ صحبت میں بیان ہو چکی ہے۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ ایک سو سال قبل (1897ء میں) بعض نہایت ذہین لیکن عیار اور سازشی مزاج کے یہودیوں نے اپنی عظمت گزشتہ اور سطوتِ پارینہ کی بازیافت کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا جس پر عمل کے نتیجے میں انہیں پہلی کامیابی 1917ء میں ''اعلانِ بالفور'' کی صورت میں حاصل ہوئی' جس کے ذریعے ارضِ فلسطین پر ان کا ''حق'' بھی تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری اور بڑی کامیابی 1948ء میں حاصل ہوئی جب فلسطین میں ان کی ایک آزاد ریاست قائم ہو گئی اور اسرائیل کا خنجر عالم عرب کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ پھر ایک اور کامیابی 1967ء میں حاصل ہوئی جب چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کی حدود میں وسعت اور رقبے میں اضافے پر مستزاد بیت المقدس یعنی یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ حال ہی میں ایک اور کامیابی انہیں خلیج کی جنگ کے بعد حاصل ہوئی' اور وہ یہ کہ فلسطینیوں سمیت تمام عرب ممالک نے اسرائیل کو اس حد تک تو تسلیم کر ہی لیا کہ اس کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ان

کی آخری منزلِ مقصود ع "دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا!" کی مصداقِ کامل بن چکی ہے' اور وہ ہے عظیم تر اسرائیل کا قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو۔ اس آخری منزل تک پہنچنے کے لیے یہود کا سازشی ذہن ایسی تدابیر اختیار کرے گا کہ "مسلم فنڈا منٹلزم" کا ہوا دکھا کر مغرب کی عیسائی دنیا کو مسلمانوں خصوصاً عربوں سے لڑوا دے۔ چنانچہ یہی سلسلۂ "ملاحم" کا اصل پس منظر ہوگا' اور اس کے ضمن میں جب اسرائیلی یہودی دیکھیں گے کہ حضرت مہدیؑ کی قیادت میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا ہے تو کوئی اسرائیلی لیڈر "اَنَا المَسِیح" کا نعرہ لگا کر میدان میں کود جائے گا' چنانچہ یہی "اَلمَسِیحُ الدَّجَّال" ہوگا جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو شدید ہزیمت اٹھانی پڑے گی اور ایک بار تو عظیم تر اسرائیل قائم ہو ہی جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ اصل حضرت مسیح علیہ السلام کو بھیج کر یہودیوں کا قلع قمع کر دے گا اور وہی عظیم تر اسرائیل ان کا عظیم تر قبرستان بن جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!!

ان تمام امور میں ظاہر ہے کہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے کوئی ایک بات بھی نہ خلافِ قیاس ہے نہ عام عادی قوانین طبعی کے متضاد! البتہ عہد حاضر کے دجالی فتنے یعنی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے غلبے کے باعث خود مسلمان' بالخصوص ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقات اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جو فتنۂ قادیانیت اور فتنۂ انکارِ حدیث سے متاثر ہیں' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی ہی کے قائل نہیں رہے تو نزول کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں! تاہم اس معاملے میں کسی ایسے شخص کو کوئی اشکال لاحق نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتا ہو کہ جملہ قوانین طبعیہ اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کے باعث اس کے ہاتھ بندھ نہیں گئے ہیں' بلکہ "يَدٰهُ مَبْسُوطَتٰنِ" (المائدۃ:64) "اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔" کے مصداق وہ جب چاہے ان قوانین طبعیہ کو معطل یا ساقط کر سکتا ہے۔ اسی طرح جملہ اشیاء میں تمام خواص و صفات اور کُل تاثیرات اُس ہی کی ودیعت کردہ ہیں' وہ جب چاہے انہیں سلب کر سکتا ہے۔ مزید برآں وہ مادی اسباب و وسائل کا محتاج نہیں' بلکہ جملہ مادی اسباب و ذرائع اس کے "اِذن" کے منتظر رہتے ہیں! الغرض یہ معاملہ ایک قادرِ مطلق اور "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" خدا پر ایمان بالغیب اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ پر یقین کامل کا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا حصہ وافر عطا فرمائے ----- آمین!

جیسے کہ گزشتہ صحبت میں عرض کیا جا چکا ہے' ان مباحث میں سے اکثر کی اہمیت صرف علمی اعتبار سے ہے۔ چنانچہ ان پر گفتگو یہیں ختم ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے عملی اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ بحیثیت پاکستانی مسلمان ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ارضِ مشرق کے مکین ہونے کے ناطے ہماری کیا خصوصی ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ آئندہ اسی مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

اگر چہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کُل تعداد پونے دو ارب تک پہنچ چکی ہے، تاہم محتاط اندازوں کے مطابق بھی یہ تعداد سوا ارب کے لگ بھگ یعنی ایک سو بیس اور ایک سو تیس کروڑ کے مابین ضرور ہے۔

سورۃ الجمعۃ کی دوسری اور تیسری آیات کی رو سے تو یہ اُمت صرف دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی ایک ''اُمّی'' عرب جن کو بقیہ تمام مسلمانوں پر مطلق فضیلت اوّلاً اس بنا پر حاصل تھی کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی ان ہی میں سے تھے، اور ثانیاً اس بنا پر کہ ان ہی کی جانب آپ ﷺ کی خصوصی بعثت تھی۔ چنانچہ ان ہی کی زبان میں اللہ کا آخری پیغام اور کامل ہدایت نامہ نازل ہوا۔ اور دوسرے ''آخرین'' یعنی بقیہ تمام نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جو وقتاً فوقتاً اُمتِ محمد ﷺ میں شامل ہو کر اس کی عمومی فضیلت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ اُمت تین حصوں میں منقسم قرار دی جا سکتی ہے، یعنی:

(1) مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان ممالک کے لوگ جن کی مادری زبان عربی بن چکی ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ بیس کروڑ، گویا کل اُمت کا چھٹا حصہ ہیں۔

(2) سابق برعظیم ہند، اور موجودہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مسلمان، جن کی مادری زبانیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں لیکن سب کی ''لنگوا فرینکا'' کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ چالیس کروڑ یعنی کل اُمت کا تیسرا حصہ ہیں۔

(3) باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان جن کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے، اور اس طرح وہ پوری اُمت کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کے لگ بھگ تو صرف انڈونیشیا اور ملائیشیا میں آباد ہیں، باقی دو تہائی میں ترکی، ایران اور افغانستان ایسے خالص اور قدیم مسلمان ممالک کے علاوہ مغربی اور وسطی افریقہ کے ممالک اور سابق روسی ترکستان اور چینی ترکستان میں آباد مسلمان شامل ہیں۔

ان ایک ارب کے قریب غیر عرب مسلمانوں میں ایک اضافی درجۂ فضیلت گزشتہ چار سو سال سے برعظیم پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کو حاصل رہا ہے، جس کی بنا پر ع ''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!'' کے مصداق اللہ کے دین اور محمد ﷺ کی رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا، جسے تاریخ کی ایک کروٹ نے پورے کا پورا مسلمانانِ پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے، جس کا صحیح فہم و شعور ع ''اپنی خودی پہچان، او غافل افغان!'' کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ فضل یا فضیلت خالص وہبی شے ہے اور عالم انسانی میں فضیلت کی اصل اساس نبوت رہی ہے۔ چنانچہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی اس عظیم فضیلت کی بنیاد، جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی دو

آیات (47اور 122) میں ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: ﴿وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''مَیں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرما دی تھی'' یہی تھی کہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پورے چودہ سو برس نبوت کا سلسلہ اس طور سے جاری رہا کہ کبھی یہ تار ٹوٹا ہی نہیں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مسلسل چھ سو سال ''فترتِ اولیٰ'' کا زمانہ ہے جس کے دوران نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے بعد نبوت و رسالت کا ماہِ کامل یا خورشید جہاں تاب محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں طلوع ہوا' جن کے سرِ مبارک پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کا تاج رکھا گیا۔ چنانچہ ایک جانب آپ ﷺ خود ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل:87) یعنی ''یقیناً اللہ کا فضل آپ ﷺ پر تو نہایت ہی عظیم و کبیر ہے!'' کے مصداقِ کامل قرار پائے تو دوسری جانب آپ ﷺ کی اُمت میں شامل ہونے والے بھی' خواہ وہ ''اُمّی'' عربوں میں سے تھے' خواہ ''آخرین'' میں سے' آپ ﷺ کے اس فضلِ عظیم کے وارث قرار پائے' بفحوائے: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۝﴾ (الجمعۃ:4) یعنی ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے' اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے!'' اس لیے کہ اگرچہ آپ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم اور منقطع ہو گیا تاہم حسبِ ذیل آیات کی رو سے آپ ﷺ کی رسالت کے فرائض کی عالمی سطح پر اور تا قیامِ قیامت ادائیگی مجموعی طور پر آپ ﷺ کی اُمت ہی کے حوالے کی گئی:

(1) ﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران:110)

''تم بہترین اُمت ہو جسے جملہ انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے' تمہارا کام ہی یہ ہے کہ نیکی کا حکم دو' برائیوں سے روکو اور خود اللہ پر پختہ ایمان رکھو!''

(2) ﴿وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ...... لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:78)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو' جتنا اور جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے... تاکہ رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں اور تم پوری نوعِ انسانی پر حجت قائم کرو!''

(3) ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا﴾ (البقرۃ:143)

''اور اُس نے تمہیں ایک اُمت وَسط بنایا ہی اس لیے ہے کہ تم تمام لوگوں پر حجت قائم کرو اور ہمارے رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں۔''

اس فریضۂ رسالتِ محمدی ﷺ کی ادائیگی اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری اگرچہ اُمت محمد ﷺ پر بحیثیت مجموعی ڈالی گئی ہے' تاہم ع ''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!'' اور ۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

کے مصداق' اور اللہ تعالیٰ کے اس ابدی قانون کے مطابق کہ ''اللہ ہر ایک پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی وسعت کے مطابق ہی ڈالتا ہے!'' جو قرآن حکیم میں متعدد بار بیان ہوا ہے (جیسے مثلاً سورۃ البقرۃ: 233 اور 286' سورۃ الانعام: 152' سورۃ الاعراف: 42 اور سورۃ المومنون: 62) اس عظیم ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہے جن کی مادری زبان عربی ہے' لہٰذا انہیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے کسی اضافی محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے! اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ہی نبوت کے اس سلسلے کا اصل قائم مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ختم اور منقطع ہو چکا ہے۔

تاہم ختم نبوت سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کی ایک اضافی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت یہ اختیار فرمائی کہ ایک جانب مجدّدین کا سلسلہ جاری فرمایا جو وقتاً فوقتاً دین کی اصل تعلیمات اور اللہ کی اصل ہدایت کو ازسرِ نو نکھار کر پیش کرتے رہے۔ اور دوسری جانب یہ ضمانت دے دی کہ ''اس اُمت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔'' (بخاری و مسلم' عن معاویہ ؓ) اور یہ دونوں امر اس اعتبار سے باہم لازم و ملزوم ہیں کہ بالکل فطری اور منطقی طور پر ہر مجدد کی تعلیمات اور مساعی کے نتیجے میں لامحالہ ایک حلقہ یا گروہ ایسا وجود میں آتا رہا جو دینِ حق کی اصل تعلیمات کا علمبردار اور اپنے وجود کے اعتبار سے کم از کم ذاتی زندگی اور انفرادی سیرت و کردار کی حد تک اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ اور آئینہ دار بن گیا۔ اگرچہ دنیا کے اس طبعی قانون کے مطابق کہ ہر جوانی پر لازماً بڑھاپا بھی آ کر رہتا ہے اور ہر کمال کو بالآخر زوال سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے' یہ حلقہ یا گروہ یا جماعت دوسری یا تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی نسل تک پہنچ کر لازماً ایک تقلیدی اور موروثی ''فرقہ'' بن جاتا رہا' اور اس طرح ایک نئے مجدد کی ضرورت پیش آتی رہی جس کے زیر اثر ایک نئی جمعیت یا جماعت وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں مجددین کے ضمن میں سو سو سال کے وقفے کا ذکر ہے' یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ہر سو سال کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے (یعنی اسے تازہ کرتے رہیں گے۔)''

بہرحال ان مجددین اُمت اور ان کے تلامذہ اور متبعین کی مساعی کے نتیجے میں دینِ حق کی تعلیمات گزشتہ چودہ سو سال کے دوران اسی طرح منتقل ہوتی چلی آئیں جس طرح اولمپک ٹارچ (مشعل) ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کو منتقل ہوتی رہتی ہے' یا شیر شاہ سوری کے زمانے میں ڈھاکہ سے پشاور تک ڈاک کے تھیلے ہر

تیس میل کے بعد ایک گھڑ سوار سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے!

اور اب اس پس منظر میں مشاہدہ فرمایئے اس عظیم حقیقت کا کہ پورے ایک ہزار برس تک مجددین کا یہ سلسلہ عالم عرب ہی میں جاری رہا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ پورے سات سو برس کے عرصے میں تمام مشاہیر علماء ائمہ ہدایت اور مجددین اُمت عالم عرب ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ لیکن فتنۂ تاتار کے دوران جب کہ وسطی اور مغربی ایشیا شورش و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے اسلام کی علمی اور روحانی وراثت تدریجاً سرزمین ہند کو منتقل ہوتی چلی گئی تا آنکہ جیسے ہی اُمت کی تاریخ کے ''الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا تجدید دین کا اصل مرکز ہندوستان بن گیا۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری کے عظیم ترین مجدد شیخ احمد سرہندیؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جن کے مرقد کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ع ''وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار'' اور جن کی ذات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ع ''جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار!'' پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے' جو تنہا اپنی ذات میں جملہ علومِ اسلامی ہی کے مجدد نہیں فکر اسلامی اور حکمت دینی کے بھی مجددِ اعظم تھے۔ پھر تیرہویں صدی ہجری میں سید احمد بریلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جو بلا شبہ سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور جہادِ اسلامی کے مجددِ اعظم تھے اور اُن کا اور اُن کے ساتھی شہداء کا خون سرزمین بالاکوٹ میں جذب ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

اسی طرح چودہویں صدی ہجری میں بھی جو اعاظم رجال سرزمین ہند میں پیدا ہوئے ان کی نظیر پورا عالم اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ طبقۂ علماء میں سے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسی عظیم شخصیت اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے علامہ اقبال ایسا مفکر ملت اور حکیم اُمت' پھر مولانا محمد الیاس ایسا عظیم مبلغ اور مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا! ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (الجمعة:4) ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

الغرض گزشتہ پوری چار صدیوں کے دوران اگر دین کے علم و فکر ہی نہیں دعوت و جہاد کی تجدید کا مرکز بھی ہندوستان بنا رہا تو ظاہر ہے کہ یہ مشیت ایزدی کے تحت ہی ہوا اور جس طرح علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ع ''برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر!'' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ''الف ثانی'' کی ان تجدیدی مساعی نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے سر پر ایک عظیم دستارِ فضیلت باندھ دی ہے جس کی بنا پر

اس کی ذمہ داری بھی بقیہ پوری اُمت مسلمہ کے مقابلے میں نہایت عظیم، گراں اور دہ چند ہی نہیں سوگنا بن گئی ہے!

اور اب توجہ فرمایئے تاریخ کی اس ''کروٹ'' کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ کروٹ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان سے عبارت ہے' جس کا اعلانیہ مقصد اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام اور پورے عالمِ انسانیت کے سامنے اسلام کے ''اصولِ حریت واخوت و مساوات کا ایک نمونہ'' پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر و مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ الٰہ آباد (1930ء) میں فرمایا تھا کہ: ''مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیرِ مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپیریلزم) کے دَور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!'' اور بانی و معمارِ پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کی صورت میں غالب اور جارح ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی: ؎

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

کے مصداق اس سے بالکل بے پروا ہو کر کہ تقسیم ہند کے بعد اُن پر کیا بیتے گی' تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ ہی نہیں اصل فیصلہ کن کردار ادا کر کے گویا مذکورہ بالا چار صد سالہ تجدیدی مساعی کی وراثت کے ناطے جو عظیم ذمہ داری جملہ مسلمانانِ ہند پر عائد ہوتی تھی اس میں سے اپنے حصے کا ''فرضِ کفایہ'' ادا کر دیا' جس کی قیمت وہ تا حال مسلسل اپنے جانی ضیاع اور مالی نقصان کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ بنا بریں اب اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر ہے' اور اس کی قسمت یا بدقسمتی بالکلیہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے!

اور یہ بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی مسلمان کے لیے اہم ''لمحہ فکریہ'' ہے کہ (1) اگر وہی بنی اسرائیل جو ''ہم نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کر دی تھی!'' کے مصداقِ کامل تھے' اللہ کے ساتھ کیے جانے والے قول و قرار اور عہد و میثاق سے انحراف اور اللہ کے دین اور شریعت کی غلط نمائندگی کے باعث ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' کی تصویر بن گئے' اور (2) مسلمانانِ عرب بھی اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود ان ہی جرائم کی پاداش میں اللہ کے بے لاگ عدل کے باعث معزول و معتوب ہوئے' چنانچہ اوّلاً اب سے ساڑھے سات سو سال قبل یعنی 1258ء میں سقوطِ بغداد اور خلافتِ بنو عباس کے خاتمے پر قرآن مجید میں وارد شدہ پیشگی تنبیہ ﴿اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ﴾ (محمد:38) ''اگر تم پیٹھ پھیر لو گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا!'' کے مطابق اُمت مسلمہ کی قیادت و سیادت سے معزول

کر دیے گئے تھے اور اب بھی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں مسلسل پٹ رہے ہیں' جس کی شدت نبی اکرم ﷺ کی ان پیشین گوئیوں کے مطابق جن پر مفصل گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے' مستقبل قریب میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جانے والی ہے! ---- تو ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ﴾ (المزمل: 17) ''پھر تم کیونکر بچو گے اگر تم نے انکار کیا؟'' کے مصداق ہم اللہ کے قانونِ عذاب اور اصولِ مکافاتِ عمل سے کیسے بچ سکیں گے!

چنانچہ ان سطور کے راقم کو پوری شدت کے ساتھ یہ احساس لاحق ہے کہ ہم بحیثیت ملتِ اسلامیہ پاکستان اللہ کے قانونِ عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں' اور اس عظیم قانون کی اس دفعہ کے مطابق جو سورۃ السجدۃ کی آیت 21 میں وارد ہوئی ہے' یعنی: ''ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں گے' شاید کہ یہ لوٹ آئیں!'' ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کا ایک شدید کوڑا 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلبِ ماہیت' اور سب سے بڑھ کر ایک ذلت آمیز اور عبرتناک شکست کی صورت میں پڑ چکا ہے' جس کے نتیجے میں ترانوے ہزار پاکستانی ان ہندوؤں کے قیدی بنے تھے جن پر مسلمانوں نے کہیں ہزار برس' کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس حکومت کی تھی! ---- اور چونکہ ہم نے اس کے بعد سے آج تک اللہ اور اس کے دین کی جانب ''رجوع'' کا کوئی ثبوت نہیں دیا' لہٰذا اب ''بڑے عذاب'' کا کوڑا بھی ہمارے سروں پر اسی طرح تانا جا چکا ہے جس طرح کبھی حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذابِ استیصال کے آثار شروع ہو گئے تھے! (اگرچہ وہ عذاب قوم کی اجتماعی توبہ کے باعث ٹل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے قومِ یونس علیہ السلام کی مثال اسی خیال سے دی ہے کہ شاید اللہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی اس ہی کے مانند اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین یا ربّ العالمین!) اور میری تشویش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے عذاب سے قبل بھی پچیس برس کی مہلت دی تھی (سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قیامِ پاکستان پر قمری حساب سے پچیس برس بیت چکے تھے!) اور اب پھر قمری حساب سے دوسرے پچیس برس کی مہلت کے ختم ہونے میں کُل پونے تین سال باقی رہ گئے ہیں! الغرض' معاملہ وہی ہے کہ:

حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اور:

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی مِلّت کے گناہوں کو معاف!

اور:

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو' زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

پاکستان کا مستقبل

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک تو یہ ہے کہ ''موت کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو' جو تمام لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی ہے۔'' (ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ۔ عن ابی ہریرہ ؓ) اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان مبارک یہ بھی ہے کہ موت کا تذکرہ اور قرآن کی تلاوت کثرت کے ساتھ کیا کرو۔ چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسانوں کے دلوں پر بھی زنگ لگ جایا کرتا ہے جیسے کہ لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑتا رہے!'' اس پر جب آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ: ''حضور ﷺ! یہ فرمایئے کہ پھر ان کو از سر نو جلا کیسے دی جائے؟'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو کام کثرت کے ساتھ کیا کرو: ایک موت کا ذکر اور دوسرے تلاوت قرآن!'' (سنن بیہقی) لیکن آج کل کے ''مترفین'' یعنی مرفہ الحال لوگ اور اصحابِ دولت و ثروت موت کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک دوست نے جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں' یہ بتایا تھا کہ جب سعودی ائیر لائنز کے دیکھا دیکھی پی آئی اے کی پروازوں کے آغاز میں بھی سفر کی اس دعا کا اہتمام کیا جانے لگا جو قرآن حکیم میں وارد ہوئی ہے' تو بہت سے لوگوں نے باضابطہ احتجاج کیا اور زور دیا کہ اس دعا کا صرف پہلا حصہ پڑھا جائے' یعنی: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ﴾ (الزخرف:13) ''پاک ہے وہ ہستی جس نے ہمارے لیے اس (سواری) کو مسخر فرما دیا' ورنہ ہم تو ہرگز اس لائق نہ تھے کہ اس پر قابو پا سکتے!'' لیکن دوسرا حصہ نہ پڑھا جائے جس میں موت کا تذکرہ ہے' یعنی: ﴿وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (الزخرف:14) ''اور ہم سب بالآخر اپنے ربّ ہی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں!'' اس لیے کہ بقول ان کے اس طرح تو پی آئی اے گویا پرواز کے آغاز ہی میں تمام مسافروں کو موت کی جھلک دکھا دیتی ہے' جس سے قلوب اور اعصاب پر ''منفی'' اثر پڑتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ!

میں نے ابھی تک تو اس روایت کو بس ایک لطیفے ہی کے درجہ میں سمجھا تھا' لیکن حال ہی میں جب ایک اچھے بھلے معروف دانشور کی یہ بات سامنے آئی کہ قیامت کا ذکر منفی سوچ کا مظہر ہے تو ع ''ہمیں یقین ہوا' ہم کو اعتبار آیا!'' کے مصداق پہلی بات کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہو گیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر صدمہ کی کیفیت زیادہ ہوئی یا حیرت اور تعجب کی، کہ ایک مسلمان یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے جب کہ قرآن مجید کا تو شاید کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہ ہو جس میں قیامت کا ذکر پورے شدّ و مدّ کے ساتھ نہ آیا ہو۔ بالآخر دل کو تسلی دی تو اس خیال کے ذریعے کہ شاید موصوف کی کسی لمبی تحریر کی تلخیص کسی صاحب نے کی ہو اور اس کی بنا پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم!

بہرحال' راقم الحروف اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے اس امر کا تو یقینِ کامل حاصل ہے ہی کہ قیامت آ کر رہے گی' جس کے نتیجے میں موجودہ عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا' بلکہ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ

اس کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد (جس کی مدت کا علم صرف اللہ کو ہے!) ایک نئے عالم یعنی عالمِ آخرت کی بساط بچھائی جائے گی' چنانچہ تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور پھر حشر ونشر اور حساب کتاب کا معاملہ ہوگا' اور بالآخر جزا و سزا یعنی جنّت یا دوزخ کے فیصلے صادر ہوں گے! جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس نہایت ابتدائی دور کے خطبے میں وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا جو آپ ﷺ نے اپنے پورے خاندان یعنی بنو ہاشم کے مجمع میں دعوتِ طعام کے بعد' اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دیا تھا کہ: ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ (الشعراء:214) ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کرو!'' چنانچہ آپ ﷺ کے الفاظِ مبارک یہ تھے:

ترجمہ: ''خدا کی قسم! تم سب پر موت وارد ہو کر رہے گی جیسے کہ تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو' پھر تم سب کو لازماً دوبارہ اٹھا لیا جائے گا جیسے کہ تم روزانہ صبح کو بیدار ہو جاتے ہو' پھر یقیناً تم سب سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو' اور پھر تمہیں لازماً بدلہ مل کر رہے گا' بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا' اور وہ یا تو جنت ہوگی ہمیشہ کے لیے یا پھر دوزخ کی آگ ہوگی ہمیشہ کے لیے!'' (ماخوذ از ''نہج البلاغۃ'')

البتہ اس قیامِ قیامت اور بعث بعد الموت کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین حاصل ہے کہ قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دینِ حق کا غلبہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کے نظام کا قیام لازماً واقع ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس کے مفصل دلائل بھی میں قرآن حکیم کی آیات سے ''دلالت'' کی بنیاد پر' اور احادیثِ نبویہ ﷺ سے ''صراحت'' کی اساس پر دے چکا ہوں۔ اور ؏ ''سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف'' کے مصداق قرآن وحدیث ہی بندۂ مومن کی دو آنکھیں ہیں!

متذکرہ بالا دو امور کے بارے میں تو بحمد اللہ مجھے ''حق الیقین'' کی کیفیت حاصل ہے' البتہ اپنی ایک تیسری رائے کے ضمن میں مَیں صرف گمانِ غالب اور امید واثق کے الفاظ استعمال کر سکتا ہوں۔ (اگرچہ اس کی سرحدیں بھی ''یقین'' کے بالکل ساتھ جا ملتی ہیں!) اور وہ یہ کہ غلبۂ دینِ حق اور قیامِ نظامِ خلافت کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت، اِن شاء اللہ العزیز' اسی ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہوگی جسے ماضی میں ''خراسان'' کہا جاتا تھا! میرے اس ''یقین کی حد کو پہنچنے والے گمان'' کی بنیاد جہاں بعض احادیثِ نبویہ ﷺ بھی ہیں جن کی بنا پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

میرِ عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے!

(مثلاً سنن ابن ماجہ کی حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ''مشرق کی جانب سے ایسے لوگ برآمد ہوں گے جو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے مہدی کی مدد یعنی ان کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پہنچیں گے''۔ اور جامع ترمذی کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''خراسان کے علاقے سے سیاہ جھنڈے برآمد ہوں گے اور انہیں کوئی طاقت واپس نہیں پھیر سکے گی' یہاں تک کہ وہ ایلیا یعنی بیت المقدس میں نصب کر دیے جائیں گے''۔ او کما قال ﷺ!) وہاں اِس کی اصل اور محکم اساس گزشتہ چار سو سال کی تاریخ پر قائم ہے' جو گواہی دیتی ہے کہ پچھلی چار صدیوں کے دوران میں تجدید دین کا سارا کام برعظیم پاک و ہند میں ہوا اور اس عرصے میں تمام مجددین اعظم اسی خطے میں پیدا ہوئے ---- جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کوئی طویل المیعاد منصوبہ اس خطۂ ارضی کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر سب جانتے ہیں کہ سرزمین افغانستان کا ہمیشہ سے برعظیم پاک و ہند کے ساتھ یہ ''دوطرفہ تعلق'' قائم رہا ہے کہ تمام فاتحین تو افغانستان سے ہندوستان کی جانب آتے رہے' لیکن صرف ایک استثناء یعنی اسلام کی اوّلین آمد کے علاوہ تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کا سفر ہمیشہ ہندوستان سے افغانستان کی جانب رہا۔ چنانچہ ماضی میں بدھ مت بھی ہندوستان سے افغانستان گیا تھا' اور گزشتہ چار صدیوں کے دوران میں اسلام کی جملہ تجدیدی مساعی کے اثرات کے اعتبار سے بھی افغانستان برعظیم پاک و ہند کے ''تابع'' رہا۔ جس کی نہایت نمایاں مثال یہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین کے ساتھ تو سلسلۂ چشتیہ افغانستان سے ہندوستان آیا تھا لیکن پھر الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کے اثرات کی صورت میں اوّلاً سلسلۂ مجددیہ پہلے افغانستان اور پھر پورے ترکستان تک پہنچا اور پھر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے مدرسۂ فکر کا اثر و نفوذ بھی وسعت اور سرعت کے ساتھ ارضِ خراسان تک ممتد ہو گیا۔ اور اِس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے (بشرطیکہ اس میں قرآن اور حدیث کا ''سرمہ'' لگا ہوا ہو!) کہ ''وقت کے بہتے دریا'' نے ایک جانب برعظیم پاک و ہند کی پوری چار صدیوں کی تجدیدی مساعی کی وراثت ارضِ پاکستان میں جمع کر دی ہے' اور دوسری جانب ارضِ خراسان میں اللہ تعالیٰ نے سپر پاورز کی باہمی کشاکش کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سوئی ہوئی مارشل اسپرٹ کو بیدار کر دیا ہے اور قدیم جذبۂ حریت کو مزید مہمیز دے دی ہے' بلکہ جذبۂ جہاد فی سبیل اللہ کو بھی قابل لحاظ حد تک قوی بنا دیا ہے' تو پھر کون سے تعجب کی بات ہو گی اگر تاریخ کی کوئی کروٹ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی' ذہنِ ہندی' نطقِ اعرابی!

کے مصداق ایک جانب سے مجددین ہند کا علم و حکمت اور فکر و فہم اور دوسری جانب سے مسلمانانِ افغانستان کا جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد دریائے سندھ اور دریائے کابل کے مانند باہم مل کر احیاءِ اسلام، غلبۂ دین اور عالمی

نظامِ خلافت کے قیام کا نقطۂ آغاز بن جائیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

میری ان باتوں پر بھی کوئی ’’دانشور‘‘ اگر چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ کسی افیمی کے خواب یا مجذوب کی بڑ کی پھبتی چست کر سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی خود میں بھی اس کیفیت سے دو چار ہو جاتا ہوں کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

تاہم مجھے یہ اطمینان ہے کہ میری ان باتوں کو کم از کم ’’منفی سوچ‘‘ کی مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

البتہ اس تیسری بات کے سلسلے میں دو سوالات کے جواب کے بارے میں مَیں نہایت متردّد بھی ہوں اور ان میں سے ایک کے بارے میں میرا ایک اندیشہ بھی قوی سے قوی تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جسے قنوطیت اور یاس پسندی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور منفی سوچ کا مظہر بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ﴿مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى﴾ (المومن: 29) ’’میں تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں!‘‘ کے مصداق میں اپنے حقیقی احساسات بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

ان دو سوالوں میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ ﴿مَتٰى هُوَ﴾ (بنی اسرائیل: 51) کے مصداق غلبۂ اسلام کا یہ مرحلہ کب شروع ہوگا؟ اور دوسرا یہ کہ اگر اس کا آغاز پاکستان ہی سے ہونا ہے تو ع ’’کب کھلا تجھ پر یہ راز‘ انکار سے پہلے کہ بعد؟‘‘ کے مصداق آیا پاکستان میں دین حق کا غلبہ اور نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے یا اس سے بھی عظیم تر سانحے اور حادثے کے بعد ہوگا؟ یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی ’’رضا کارانہ توبہ‘‘ کے ذریعے ہو جائے گا؟

جہاں تک ’’مَتٰى هُوَ‘‘ یعنی ’’یہ کب ہوگا؟‘‘ کا تعلق ہے، ہمیں قرآن حکیم سے بھی اس سوال کے دو جواب ملتے ہیں، چنانچہ پہلا جواب تو وہی ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کی اسی آیت (51) میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: ﴿قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا﴾ یعنی ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ عین ممکن ہے کہ وہ بالکل ہی قریب آ گیا ہو!‘‘ بالکل اسی طرح کی ایک بات سورۃ المعارج میں بھی وارد ہوئی ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷﴾ یعنی ’’یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں جب کہ ہم اسے بالکل قریب دیکھ رہے ہیں!‘‘ اور دوسرا وہ عمومی جواب ہے جو قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے، یعنی یہ کہ: ﴿وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: 109) یعنی ’’(اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے کہ) میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی دور ہے!‘‘ اور ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْۤ اَمَدًا﴾ (الجن: 25) یعنی ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ عنقریب پیش آنے والی ہے یا ابھی میرا ربّ اس کے ضمن میں کچھ تاخیر فرمائے گا!‘‘

بہرحال سورۃ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کے مطابق میری رائے بھی یہی ہے کہ پہلے پاکستان اور افغانستان' اور پھر کل روئے ارضی پر دین محمد ﷺ کا غلبہ اب زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ (اگرچہ دونوں مؤخر الذکر آیات کے مطابق اس کا حتمی علم صرف اللہ کو ہے) تاہم میرے تردّد کی بنیاد یہ ہے کہ تاحال اس کے آثار کہیں دور دور تک بھی نظر نہیں آ رہے۔ بلکہ ہم بحیثیت قوم وملّت روز بروز سورۃ آل عمران کی آیت 167 میں وارد اِن الفاظ کے زیادہ سے زیادہ مصداق بنتے چلے جا رہے ہیں: ﴿ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ﴾ (وہ اس روز ایمان کے مقابلے میں کفر سے قریب تر تھے!) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے سامنے حیاتِ نبوی ﷺ اور سیرتِ مطہرہ کا ایک خاص مرحلہ نہ ہوتا تو ع ''اُڑتے اُڑتے دور اُفق پر آس کا پنچھی ڈوب گیا!'' کے مصداق میری اُمید کب کی دم توڑ چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میں بحمد اللہ خوب اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں کہ سن دس نبوی ﷺ میں جناب ابو طالب کے انتقال کے بعد عالم اسباب کے اعتبار سے مکہ مکرمہ میں نبی اکرم ﷺ کے لیے واحد امان اُٹھ گئی اور کُفارِ مکہ کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قتل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی' چنانچہ آپ ﷺ اپنی دعوت اور تحریک کے لیے کسی متبادل مرکز کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں آپ ﷺ کو ایک دن میں وہ سختی جھیلنی پڑی جس کا سامنا اس سے قبل مکہ میں پورے دس سال کے دوران میں ذاتی طور پر آپ ﷺ کو کبھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ واپسی پر آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر وہ دلدوز فریاد بھی آئی جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے' اور پھر اسی مایوسی کے عالم میں جب آپ ﷺ مکہ واپس تشریف لائے تو سردارانِ قریش میں سے کسی کی امان حاصل کیے بغیر مکہ میں داخلہ ممکن نظر نہ آیا۔ چنانچہ دو اشخاص کی جانب سے آپ ﷺ کی فرمائش کا کورا جواب ملنے کے بعد بالآخر ایک کافر و مشرک لیکن شریف النفس انسان مطعم بن عدی اپنے چھ ہتھیار بند بیٹوں کے ہمراہ مکہ سے باہر آیا اور آپ ﷺ کے لیے اپنی امان کا اعلان کرتے ہوئے آپ ﷺ کو ساتھ لے کر مکہ میں داخل ہوا ---- تو اس وقت نہ آپ ﷺ کی دعوت کے پنپنے کا کوئی امکان کسی کو نظر آ سکتا تھا' نہ آپ ﷺ کی کامیابی کے لیے امید کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کرن کسی کو دکھائی دے سکتی تھی! اس کے باوجود کُل دس سال کی مدت میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا اور چشم گیتی نے وہ نظارہ دیکھ لیا کہ آپ ﷺ 10 رمضان المبارک سن 8 ہجری کو اسی مکہ مکرمہ میں اپنے دس ہزار ساتھیوں کے جلو میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ گویا اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ چنانچہ صرف اسی کے فضل و کرم کے سہارے اور اُسی کی قدرتِ کاملہ کی بنا پر میری یہ امید قائم ہے کہ اِن شاء اللہ' اُسی سر زمین پاکستان و افغانستان سے اس عمل کا آغاز ہو گا' جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ع ''شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے'' اور ع ''یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!'' کی کیفیت پیدا ہو کر رہے گی! (واضح رہے کہ مطعم بن عدی حالتِ کفر ہی میں فوت ہو گیا تھا' لیکن آنحضور ﷺ کو اُس کے احسان کا اس درجہ پاس تھا کہ آپ ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد قریش کے ستر قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''اگر آج مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو

میں ان سب کو بغیر کسی فدیے اور تاوان کے رہا کر دیتا!'')

اس ''گمانِ غالب'' یا اُمیدِ واثق (جس کی سرحدیں ''یقین'' سے جا ملتی ہیں) کے اظہار کے بعد کہ اِن شاء اللہ العزیز' اسلام کے عالمی غلبے اور کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کا نقطۂ آغاز ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کا وہ علاقہ بنے گا جو ماضی میں خراسان کہلاتا تھا' اب آیئے اس دوسرے سوال کی جانب جس کے جواب کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں بہت متردّد ہوں' یعنی یہ کہ آیا پاکستان میں یہ عظیم انقلاب ''کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے یا اس سے بھی عظیم تر سانحے یا حادثے کے بعد ہوگا' یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی رضا کارانہ توبہ کے ذریعے ہو جائے گا؟'' تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے حقیقی احساسات اور خدشات کے اظہار اور انہیں نوکِ زبان یا نوکِ قلم پر لانے سے شدید خوف محسوس ہوتا ہے' اس لیے کہ تلخ حقائق کو تو تسلیم کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے' کجا ان کا مواجہہ کرنا (یعنی انہیں ''face'' کرنا) کہ وہ تو بہت ہی دل گردے کا کام ہے۔ جب کہ عام طور پر لوگوں کا طرزِ عمل اس روایتی کبوتر ہی کا ہوتا ہے جو بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ اس سے خطرہ تو نہیں ٹل جاتا اور حقیقت تو نہیں بدل جاتی!) لہٰذا شدید اندیشہ ہے کہ میرے خیالات کو قنوطیت اور یاس پسندی سے تعبیر کیا جائے گا اور بہت سے دانشور انہیں ''منفی سوچ'' کا مظہر قرار دیں گے۔ تاہم ع' مجھے ہے حکم اذاں' لا الٰہ الا اللہ'' ! کے مصداق میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم بحیثیت ملک و قوم عذابِ الٰہی کے دوسرے اور شدید تر کوڑے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اور ؎

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!

کے مصداق ہم اپنے اعمال کے اعتبار سے تو ''عذابِ اکبر'' کے قطعی مستحق ہو چکے ہیں' یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل و کرم کے طفیل ہمیں قومِ یونس علیہ السلام کی سی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ (اللہ سے دعا ہے کہ ایسا ہی ہو!)

کچھ عرصہ قبل انہی کالموں میں ''قرآن کا قانونِ عذاب'' کے موضوع پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے' جس کے سلسلے میں سورۃ السجدۃ کی آیت 21 کا حوالہ بھی آیا تھا' جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ کسی قوم پر آخری ''عذابِ استیصال'' سے قبل یعنی اس عذاب سے پہلے جس کے ذریعے اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے' چھوٹے عذاب نازل فرماتا ہے' تاکہ اگر وہ ہوش میں آ سکتی ہو تو آ جائے اور توبہ و انابت کی روش اختیار کر کے ''عذابِ اکبر'' سے بچ جائے۔ مزید برآں اس عذابِ استیصال کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ چونکہ یہ صرف اُن قوموں پر نازل کیا جاتا رہا ہے جن کی جانب اللہ کے رسول مبعوث ہو کر

اتمامِ حجت کا حق ادا کر چکے ہوں' (سورۃ بنی اسرائیل' آیت 15 اور سورۃ القصص' آیت 59) لہٰذا نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کے سلسلے کے ختم ہو جانے کے بعد اس نوع کا عذاب کسی ''نئی'' قوم پر نہیں آئے گا' بلکہ یہ حتمی اور کلی طور پر صرف سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود پر آئے گا جو اوّلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جوان کی جانب مبعوث کیے گئے تھے' ردّ کرنے کے باعث اس کے مستحق ہو گئے تھے' اور ثانیاً جب نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت انہیں ایک ''رحم کی اپیل'' کا موقع (سورۃ بنی اسرائیل' آیت 7 و 8) دیا گیا تو اسے بھی ضائع کرنے کے باعث حتمی اور قطعی طور پر ذلت و مسکنت' لعنت خداوندی اور غضب الٰہی کے مستوجب ہو گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ' جیسے کہ اس سے قبل تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے' ان کی اس آخری اور ''استیصالی'' سزا کی تنفیذ اس لیے مؤخر کر دی گئی کہ موجودہ اُمتِ مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب پر عذاب اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں نازل کیا جائے تاکہ درد و الم پر توہین و تذلیل کا اضافہ ہو جائے۔ (جس کا آغاز 1948ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت سے ہو چکا ہے اور جس میں ''کتاب الملاحم'' میں وارد شدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل میں حد درجہ شدت پیدا ہونے والی ہے!)

رہی موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی اُمتِ محمد ﷺ تو اس پر کلی اور مجموعی حیثیت سے تو یہ نام و نشان مٹا دینے والا عذاب ہرگز نہیں آ سکتا' اس لیے بھی کہ یہ آخری اُمت ہے اور اسے تا قیامِ قیامت باقی رہنا ہے۔ (جیسے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو!'') اور اس لیے بھی کہ اس کا اصل جرم بے عملی یا بدعملی ہے' رسول ﷺ کی رسالت کا انکار نہیں! تاہم اس بے عملی و بدعملی اور بدعہدی و بے وفائی کی پاداش میں کسی مخصوص خطے اور علاقے سے اس کا نام و نشان مٹا دیا جانا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ ہسپانیہ کی تاریخ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی' وہاں سے ع' مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے!'' کے مصداق اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹے پورے پانچ سو برس ہو گئے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِی الْاَبْصَار!

ان سطور کے ناچیز راقم نے اب سے ساڑھے چھ سال قبل (جنوری 1987ء میں) اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ'' شائع کی تو اس کے ذیلی سرورق پر یہ الفاظ تحریر کیے تھے:

''93ھ مطابق 712ء میں اسلام بیک وقت برِعظیم ہند میں براستہ سندھ' اور براعظم یورپ میں براستہ سپین داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں۔ کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟''

آگ ہے' اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟''

اور آج (1993ء) راقم گہرے درد و رنج کے ساتھ یہ عرض کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہے کہ ان ساڑھے چھ سال کے دوران وقت کے دریا میں جو مزید پانی بہہ گیا ہے اس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برعظیم پاک و ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں! اس لیے کہ ایک جانب اس تلخ حقیقت سے اختلاف کی کسی بھی شخص کے لیے ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے کہ ہم نے 1971ء کے ''عذابِ ادنیٰ'' سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور ڈھاکہ کے سقوط' ملک کے دولخت ہونے' مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلب ماہیت' اور ان سب پر مستزاد ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک اور ذلت آمیز شکست اور ترانوے ہزار مسلمانوں کی اسیری جن پر کہیں چھ سو' کہیں آٹھ سو اور کہیں ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی (جس پر اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!'') کے نتیجے میں نہ ہماری قومی اور اجتماعی روش میں کوئی تبدیلی آئی' نہ ہی افراد کی ترجیحات یا مشاغل میں سرِ مُو فرق واقع ہوا' بلکہ بحیثیتِ مجموعی ہم ہر اعتبار سے زوال اور اضمحلال ہی کی جانب رواں دواں ہیں۔ چنانچہ ہمارا داخلی انتشار ہے کہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے' تا آنکہ حالیہ سیاسی بحران کے دوران میں بعض دوسرے سیاسی اور قومی رہنماؤں کے اسی نوع کے بیانوں کے علاوہ خان ولی خان کا یہ ''عریاں'' بیان بھی شائع ہو چکا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ختم ہو چکا ہے!'' اسی طرح معیشت ہے کہ تباہی کے آخری کنارے کو پہنچا چاہتی ہے۔ قوم کے منتخب نمائندوں کو اب ''بکاؤ گھوڑوں'' سے بڑھ کر ''لوٹوں'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالیہ چپقلش کے ضمن میں صدرِ مملکت کو سرِ عام گالیاں دی گئیں اور ان کے نت نئے کارٹون اور کیری کیچر شائع ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر عدلیہ پر کھلے بندوں فقرے چست کیے گئے' حتیٰ کہ اعلیٰ عدالتوں پر پتھراؤ بھی ہوا۔ الغرض واقعتاً ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم قومی اور ملکی اعتبار سے:

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ دنیا دو سپر پاورز کی کشاکش کی آماجگاہ ہونے کی بجائے ایک ''سول سپریم پاور'' کے حیطۂ اقتدار میں آ چکی ہے۔ چنانچہ اب کمزور قوموں اور چھوٹے ملکوں کے options بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اور اِدھر ہم جس کی دوستی کا دم بھرتے رہے اور جس کی حمایت کے سہارے جیتے رہے' بلکہ جس کے گھڑے کی مچھلی بنے رہے (یعنی امریکہ) وہ نہ صرف یہ کہ ؏ ''آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند!'' کا مصداقِ کامل بن گیا ہے' بلکہ اب ہر اعتبار سے بھارت کو ترجیح دینے کی پالیسی کے ناطے ؏ ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!'' کا مظہرِ اتم بن گیا ہے۔ اور صرف ہمارے لیے ہی نہیں' پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے خطرناک

ترین اور خوفناک ترین امر یہ ہے کہ اس ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' کی پالیسیوں کی تشکیل اور فیصلوں کی تعیین میں یہودیوں کو فیصلہ کن اثر ونفوذ حاصل ہے' جس کے نتیجے میں ''نیو ورلڈ آرڈر'' فی الواقع ''جیو ورلڈ آرڈر'' بن گیا ہے!

تیسری جانب بھارت میں متعصب ہندو ذہنیت کا جارحانہ احیاء ہے' جس کی شدت نے دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لگ بھگ پچیس برس تک بھارت میں ہندومت کے احیاء کے کوئی آثار نہیں تھے' بلکہ بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی پر انڈین نیشنل کانگریس کو فیصلہ کن غلبہ حاصل تھا' جس میں اگرچہ متعصب اور کٹر ہندو بھی یقیناً شامل تھے' تاہم اس کی قیادت میں فیصلہ کن عمل دخل سیکولر مزاج کے حامل لوگوں کو حاصل تھا۔ لیکن 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے باعث اس کے رعب اور دبدبے میں جو کمی آئی اس سے بھارت میں عوامی سطح پر ہندو قوم پرستی کے جذبے کو تقویت ملی اور نہ صرف بھارت میں ہندو راشٹر کے قیام بلکہ پراچین بھارت کی عظمتِ رفتہ اور سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کی امنگ پیدا ہوئی۔

اس جلتی پر تیل کا کام اس حادثے نے کیا کہ جب اسی کی دہائی کے آغاز میں جبری نس بندی کے ردّعمل میں مسلمان ووٹ بحیثیتِ مجموعی کانگریس کے خلاف پڑا تو اس پر ''جوابِ آں غزل'' کے انداز میں اگلے انتخابات میں اندرا گاندھی نے ''ہندو دیوی'' کا روپ دھار کر خالص ہندو ووٹ کے ذریعے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ اور اس طرح بھارت میں ریاستی اور حکومتی سطح پر اور بالخصوص ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہندو فنڈامنٹلزم کو فروغ حاصل ہوا' جس کا نتیجہ سامنے ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) جو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سیاسی فرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے' بھارت میں عظیم قوت بن کر ابھری ہے اور پوری ہندی بیلٹ (راجپوتانہ' ہریانہ' اتر پردیش' مدھیہ پردیش اور گجرات) میں تو غالب سیاسی طاقت بن ہی چکی ہے' اب جنوبی بھارت میں بھی قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اِدھر خود آر ایس ایس کا حال یہ ہے کہ ایک جانب اب سے لگ بھگ دس برس قبل شکاگو سے جو ایک ضخیم تصنیف اس کے بارے میں ''Brotherhood in Saffron'' کے نام سے شائع ہوئی تھی اس میں اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس پر اس عرصے میں جو اضافہ ہوا ہو گا اس کا اندازہ خود لگا لیجیے!) دوسری جانب اس کی مستقل مزاجی کا عالم یہ ہے کہ ستر برس کے لگ بھگ عرصہ اس کے قیام کو ہونے کو آیا' لیکن اس نے کبھی انتخابات میں شریک ہو کر ''پاور پالیٹکس'' میں وقت ضائع کرنا ہرگز گوارا نہیں کیا' بلکہ ساری توجہ کو پوری تندہی کے ساتھ اپنے کارکنوں کی تنظیم' تربیت اور سماجی خدمت کے کاموں پر مرکوز رکھا۔ (واضح رہے کہ یہ جماعت قائم بھی خاکسار تحریک کے ردّعمل ہی میں ہوئی تھی۔) اور تیسری جانب اس کے کارکنوں کے نظم وضبط کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر 1992ء کے پہلے ہفتے میں ان کے تین لاکھ کارکن بابری مسجد کو گرانے کے لیے ایودھیا میں جمع ہوئے' اور ظاہر ہے کہ وہ بھارت کے کونے کونے سے طویل سفر طے کر کے آئے تھے' لیکن مسجد کے شہید کیے

جانے تک کہیں ان کے کارکنوں کے مشتعل ہو کر کسی مسلمان کی جان‘ مال یا عزت پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور مستقبل کے اندیشوں کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ شنید ہے کہ اس عظیم تنظیم کے رہنما (گورو) دیورس نے حال ہی میں ایک گشتی مراسلہ بھارت کی تمام ہندو سیاسی‘ سماجی اور مذہبی تنظیموں کو ارسال کیا ہے‘ جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ:

”اب ہمیں بھارت کی پاک زمین سے مسلمانوں کی نجاست کو حتمی طور پر ختم کرنے کا آخری فیصلہ کر گزرنا چاہیے۔ اور میں آپ سب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس پر کچھ معمولی سا ردّعمل پاکستان اور بنگلہ دیش میں تو ہو سکتا ہے‘ جس کی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں‘ باقی پوری دنیا کے مسلمانوں سے کسی ناموافق ردّعمل کا کوئی اندیشہ نہیں ہے!“

اندریں حالات بھارت کا مسلمان تو مسلسل خوف کی حالت سے دوچار ہے ہی‘ (اس لیے کہ اُسے تو مسلسل یہ نعرہ سننا پڑتا ہے کہ ”مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان!“) لیکن جگر کے اس شعر کے مصداق کہ: ؎

آسودۂ ساحل تُو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں‘ خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!

ہم مسلمانانِ پاکستان کو بھی کسی مغالطے میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک جانب بھارت کے ہندو فنڈا منٹلزم کا علاقائی عملداری کا دعویٰ انڈونیشیا سے افغانستان تک‘ معاشی استحصال کی امنگیں اس سے بھی آگے ایران و عرب تک‘ اور بحری بالادستی کا عزم پورے بحر ہند پر یعنی آسٹریلیا سے افریقہ تک ہے۔ اور دوسری طرف بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ اور ہنود و یہود کا اشتراکِ عمل بڑی تیزی کے ساتھ رسمی اور روایتی سفارتی تعلقات سے بہت آگے بڑھ رہا ہے! اور اسرائیل اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے توسیعی عزائم یعنی عظیم تر اسرائیل کے قیام کی راہ میں واحد مسلمان ملک جو مزاحم ہو سکتا ہے وہ صرف پاکستان ہے‘ جس کے ایٹمی دانت یا نکل چکے ہیں یا نکلنے کا اندیشہ ہے! اور تیسری جانب امریکہ وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستوں کے سیاسی‘ معاشی یہاں تک کہ سماجی روابط بھی مغرب میں اسرائیل اور سیکولر ترکی اور مشرق میں بھارت کے ساتھ استوار کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ الغرض‘ ان جملہ داخلی و خارجی عوامل کا ”حاصل جمع“ اقبال کے الفاظ میں یہ ہے کہ ع ”تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!“ اور ہم بحیثیتِ ملک و قوم اس وقت بالکل اسی صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں جس کے پیش نظر بخت نصر کے ہاتھوں عظیم سلطنت اسرائیل اور مقدس شہر یروشلم کی کامل تباہی سے قبل انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوموں کو ان الفاظ میں متنبہ کرتے رہے تھے کہ: ”ہوش میں آ جاؤ‘ ورنہ جان لو کہ درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا جا چکا ہے!“

ہماری نجات کا واحد ذریعہ

جو کچھ گزشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا اس کے پیشِ نظر اس انگریزی مقولے کے مطابق کہ ''امید تو بہترین کی کرو لیکن تیار بدترین کے لیے رہو!'' اس خطۂ ارضی کے مستقبل کے بارے میں' جس میں پاکستان واقع ہوا ہے' بہترین سے بدترین تک تین ممکنہ صورتیں نظر آتی ہیں:

- پہلی صورت جو نہایت خوش آئند اور تابناک ہے' یہ کہ:

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کو قومِ یونس علیہ السلام کی سی توبہ کی توفیق مل جائے۔ چنانچہ اوّلاً افراد و اشخاص کی ایک معتد بہ تعداد اللہ کے حضور میں سچی اور خالص توبہ کرے' اور ایک جانب اپنے عقائد کی تصحیح کرے اور توحید خالص کا دامن از سرِ نو مضبوطی کے ساتھ تھامے' دوسری جانب فسق و فجور کو ترک کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو حرام اور منکر سے پاک کرے' اور تیسری جانب غلبۂ اسلام اور قیامِ نظامِ خلافت کی منظم جدوجہد کے لیے تن من دھن وقف کر دے۔ ثانیاً اس طرح جو منظم قوت وجود میں آئے وہ ملکی سیاست اور اقتدار کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے اپنی جملہ مساعی اور تمام تر توانائیوں کو مزاحمتی تحریک کے لیے وقف کر دے' اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضمن میں فطری تدریج کے ساتھ "بِاللِّسان" یعنی زبان اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع سے تدریجاً آگے بڑھ کر "بِالْیَد" یعنی قوت کے ساتھ مزاحمت کی راہ اختیار کرے' اور اس طرح ارضِ پاکستان پر اللہ کے دین کو غالب اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف یہ کہ قیامِ پاکستان کے لیے جو قربانیاں مسلمانانِ ہند نے دی تھیں وہ رائیگاں نہیں گئیں' بلکہ الف ثانی کی جملہ چار سو سالہ تجدیدی مساعی بھی بار آور ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ارضِ پاکستان کو فوری طور پر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی غلبۂ اسلام کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کی دلی خواہش بھی یہی ہو گی کہ ایسا ہو جائے' اور اسی کی دعا بھی ہر قلب کی گہرائی سے بلند ہو گی' اور ''جب تک سانس تب تک آس!'' کے مطابق ہمیں آخری دم تک کوشش بھی اسی کی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کے کچھ ناگزیر لوازم و شرائط ہیں جن کا اجمالی ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور کسی قدر وضاحت سے آگے دوبارہ ہو گا۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ چونکہ سرزمین مشرقی پاکستان ہم مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی نگاہوں سے دور تھی' اور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق 1971ء کے ''عذابِ ادنیٰ'' کے شدائد کو ہم نے براہِ راست محسوس نہیں کیا' لہٰذا شاید کہ ہماری آنکھیں کھولنے اور ہمیں توبہ اور رجوع پر آمادہ کرنے کے لیے ایک

مزید ''عذابِ ادنیٰ'' کی ضرورت ہو۔ چنانچہ جس عذاب کے سائے افق پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں وہ عذابِ ادنیٰ ہی کا ایک اور کوڑا ہو۔ اور اگرچہ اقبال کا یہ شعر کہ:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے!
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

تاحال ترکوں پر تو صادق نہیں آ سکا' لیکن کیا عجب کہ ہم پر صادق آ جائے!

تیسری اور آخری' اور حد درجہ قابلِ حذر صورت' جو بحالاتِ موجودہ ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے' یہ ہے کہ' خاکم بدہن' ہمیں اپنے کرتوتوں اور فروگزاشتوں کی پاداش میں اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں عبرتناک سزا دلوائی جائے' جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ [قرآن کے الفاظ ﴿لِيَسُوْءُا وُجُوهَكُمْ﴾ (بنی اسرائیل: 7) کے مطابق] ہمارے حلیے بگڑ جائیں بلکہ اس علاقے کا جغرافیہ ہی بدل جائے' اور عظیم سلطنت عثمانیہ اور عظیم سوویت یونین کے مانند' اور ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!'' کے مصداق ''سلطنتِ خداداد پاکستان'' کا نام ونشان بھی دنیا کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے!

اللہ نہ کرے ایسا ہو' اور اگرچہ قرائن اور شواہد کے اعتبار سے تو اب معاملہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق ''امید کے خلاف امید'' (Hoping against hope) کا ہے' تاہم مجھے اب بھی امید ہے کہ اِن شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تب بھی میری یہ ''امید واثق'' اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ عالمی غلبۂ اسلام اور کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام' جو تقدیر مبرم کے مانند اٹل ہے' اسی خطۂ ارضی سے شروع ہوگا۔ اس لیے کہ:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

کے مصداق تاریخ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے۔ اور جس طرح اب سے لگ بھگ سات آٹھ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تاتاریوں کے ہاتھوں پٹوایا' اور پھر خود اُن کو اسلام کی توفیق عطا کر کے عالم اسلام کی قیادت سونپ دی' اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہمارا کوئی دشمن ہمیں فتح کر لے لیکن پھر خود اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو جائے! اس لیے کہ بعض ایسے حضرات جن کی نگاہ ایک جانب تاریخ اور رفتارِ زمانہ پر بھی ہے' اور دوسری جانب قرآن اور دیگر کتبِ سماویہ کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں پر بھی' یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کی قیادت جو اوّلاً عربوں کو عطا کی گئی تھی' جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت سام کی نسل سے تھے' پھر ترکوں کو منتقل کر دی گئی تھی جو حضرت نوح علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت یافث کی نسل سے تھے' اب جنوبی ایشیا کے اُن لوگوں کو منتقل ہونے والی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے تیسرے بیٹے یعنی حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ واللہ اعلم!

بہر صورت، جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا، ہمارا فرض یہ ہے کہ: ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

کے مصداق دامن امید کو حتی الامکان مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی کوشش کریں، اور ''پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!'' کے مطابق چمن پاکستان میں ''چمن سے روٹھی بہار'' کو واپس لانے کی ہر ممکن سعی کریں اور اس سلسلے میں قومِ یونس علیہ السلام کی مثال ہمارے لیے بہت ہمت افزا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس کی آیات 96 تا 98 میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون تو یہی ہے کہ جس طرح کسی انسان پر موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی قوم پر آخری اور بڑے عذاب کے آثار شروع ہونے کے بعد اس کے ایمان لانے یا توبہ کرنے سے عذاب نہیں ٹالا جاتا، لیکن اس قاعدۂ کلیہ میں ایک استثناء کا معاملہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا کہ ان کی توبہ عذابِ استیصال کے آثار شروع ہونے کے بعد بھی قبول کر لی گئی۔ تو اگرچہ قومِ یونس علیہ السلام کے ضمن میں تو اس استثناء کا سبب کچھ اور تھا، تاہم چونکہ ہم پر فی الوقت کسی رسول کے ذریعے اتمامِ حجت نہیں ہوا ہے، لہٰذا ہم بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری سے استغاثہ کرنے کے مستحق ہیں، اور توقع کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سچی توبہ (توبۂ نصوح) کا حق ادا کر دیں تو آنے والا عذاب ٹل سکتا ہے۔

البتہ کسی قوم کو دنیا میں اس ''رسوا کن عذاب'' سے نجات پا کر ایک نئی ''مہلتِ حیات'' کی حق دار قرار دینے والی ''توبہ'' کے کچھ لوازم و شرائط ہیں، جن کا فہم و ادراک ضروری ہے:

1) اوّلاً یہ کہ اگرچہ ''اجتماعی توبہ'' کا نقطۂ آغاز لامحالہ انفرادی توبہ ہی ہوتی ہے، لیکن انفرادی توبہ کے ذریعے صرف اُخروی عذاب سے نجات کی ضمانت مل سکتی ہے، اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ وہ واقعی ''توبۂ نصوح'' ہو جس کی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ ﷺ کی روشنی میں جو شرائط معین کی گئی ہیں وہ حقوق اللہ کے ضمن میں ہونے والی تقصیرات کے معاملے میں تو تین ہیں، لیکن حقوق العباد سے متعلق گناہوں کے معاملے میں چار ہیں۔ یعنی ان دونوں قسم کے گناہوں کے ضمن میں تو یہ تین شرائط مشترک ہیں کہ: (i) ایک یہ کہ حقیقی اور واقعی ندامت موجود ہو، بقول اقبال: ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے!

(ii) دوسرے یہ کہ آئندہ کے لیے عزمِ مصمم ہو کہ اس گناہ کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گا۔ (iii) تیسرے یہ کہ بالفعل بھی اس گناہ کو واقعتاً ترک کر دے۔ اور ان پر مستزاد حقوق العباد کے ضمن میں ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ شخص متعلق کا جو حق تلف یا غصب کیا تھا اس کی تلافی کرے، یا بصورتِ دیگر اس سے معافی حاصل

کرے!(ورنہ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی یا مظلوم کی برائیاں ظالم کے حساب میں شمار ہوں گی۔)

2 یہ "انفرادی توبہ" خواہ کتنی ہی سچی ہو اور انسان ذاتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی متقی و صالح اور عابد و زاہد کیوں نہ بن جائے' اگر قوم کی مجموعی حالت تبدیل نہ ہو اور وہ بحیثیت مجموعی عذاب خداوندی کی مستحق بن جائے تو جس طرح چکی میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے' اسی طرح جب کسی قوم پر دنیا میں اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس کی لپیٹ میں بدکاروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگ بھی آجاتے ہیں' جیسے کہ سورۃ الانفال کی آیت 25 میں فرمایا:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾

"اور ڈرو اس عذاب سے جو تم میں سے صرف بدکاروں اور گناہ گاروں ہی پر نہیں آئے گا' اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!"

(اس قاعدۂ کلیہ میں بھی ایک استثناء موجود ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اس سے بھی زیادہ قابلِ حذر معاملہ وہ ہے جو ایک حدیثِ مبارک میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہیں کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹ دو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ (اپنی تمام تر ذاتی نیکی اور پارسائی کے باوصف' اس کی دینی بے حمیتی کا حال یہ ہے کہ میرے دین و شریعت کی حمایت و حفاظت میں کوئی عملی سعی و جہد تو در کنار) میری غیرت کے باعث کبھی اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہیں ہوا!" (سنن بیہقی)

3) دنیا میں کسی قوم کے اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت "اجتماعی توبہ" ہے۔ اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معاشرے کے صد فی صد لوگ تو کسی بھی دور میں درست نہیں ہوئے۔ (یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی آخر دم تک کچھ نہ کچھ تعداد میں منافق ضرور موجود رہے' تا بہ دیگراں چہ رسد؟) تاہم اگر کسی قوم کے افراد اتنی معتدبہ تعداد میں سچی توبہ کر لیں کہ پھر اپنی دعوت و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے قوم کے اجتماعی دھارے کا رُخ تبدیل کر دیں' یعنی بالفاظِ دیگر ایک اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں' تو اس قوم کی جانب سے "اجتماعی توبہ" کا حق ادا ہو جائے گا' اور وہ "دنیا کی زندگی میں رسوا کن عذاب" سے نجات پا کر "نئی زندگی" حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

4) چنانچہ کسی قوم پر اجتماعی عذاب نازل ہونے کی صورت میں اس کے نیک اور صالح افراد کے بچا لیے جانے کی وہ واحد استثنائی صورت جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا' اور جس کی امید قرآن حکیم میں سورۃ الاعراف کی آیت 165 میں دلائی گئی ہے' یہی ہے کہ قوم کے اجتماعی فساد کی صورت میں جو لوگ آخر دم تک "نہی عن السُّوء" کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہیں' اور گویا سورۃ التوبہ کی آیت 112 کے ان الفاظِ مبارکہ کے مصداق بن جائیں: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط﴾ (یعنی "توبہ کرنے والے' بندگی کا حق ادا کرنے والے' اللہ کی حمد کرنے والے' لذاتِ دُنیوی سے کنارہ کش رہنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے والے") تو اگر ان کی جملہ مساعی کے باوجود قوم بحیثیت مجموعی صحیح رُخ پر نہ آئے اور اعراض و استکبار ہی پر مُصر رہنے کے باعث عذابِ الٰہی کی مستحق ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے ایسے "نہی عن المنکر" کا حق ادا کرنے والے بندوں کو دنیا کے رسوا کن عذاب سے بچا کر اپنے دامن رحمت میں لے لیتا ہے۔

5) کسی مسلمان فرد یا قوم میں بے عملی یا بدعملی کا اصل سبب یقین والے ایمان کی کمی یا فقدان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا علاج بھی ع "علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!" کے مصداق یہی ہے کہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ:۔

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

اُمت میں یقین والا ایمان از سرِ نو پیدا کیا جائے۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح تعبیر فرمایا کہ توبہ گویا از سرِ نو ایمان لانے کا کام ہے جس کا لازمی نتیجہ عمل کی اصلاح ہے۔ (از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط﴾ (الفرقان: 70) "سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کی' اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بالفعل اچھے عمل کیے' تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا!") لہٰذا قوم کی "اجتماعی توبہ" کے لیے اصل اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ تجدید ایمان کی عمومی تحریک برپا کی جائے۔ اور الحمد للہ کہ برعظیم پاک و ہند میں ایک بڑے پیمانے اور عوامی سطح پر' اگرچہ غیر علمی اور غیر فکری انداز میں' تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک "تبلیغی جماعت" کے تحت چل بھی رہی ہے' تاہم ضرورت ہے کہ اُمت کے ذہین اور فہیم عناصر میں ایسے شعوری ایمان کی افزائش کا سامان کیا جائے جس کا گہرا اور محکم رشتہ ان کے "فکر" کے ساتھ قائم ہو' اس لیے کہ اس کے بغیر قوم کی اجتماعی صورت حال کا بدلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے احساس کے تحت علامہ اقبال نے اب (1993ء) سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل "فکر اسلامی کی

تشکیل جدید" کے عنوان سے اپنے مشہور زمانہ "خطبات" ارشاد فرمائے تھے' اور اسی ضرورت کے احساس کے تحت اب سے لگ بھگ تیس سال قبل حضرت علامہ ہی کے ایک ادنیٰ خوشہ چین کی حیثیت سے راقم الحروف نے "رجوع الی القرآن" کی تحریک شروع کی تھی۔ اس لیے کہ وہ بات جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نہایت سادہ الفاظ میں کہی تھی' یعنی

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

وہ فی الواقع ایک نہایت عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اُمت مسلمہ کے جملہ امراض کا اصل سبب قرآن سے دوری کو قرار دیا اور اس کا اصل علاج "رجوع الی القرآن" تجویز کیا۔ چنانچہ سادہ ترین الفاظ میں تو "جوابِ شکوہ" میں ارشاد فرمایا:۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اور نہایت پُرشکوہ الفاظ میں ان فارسی اشعار میں بیان کیا کہ:۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی!

اور:۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

یعنی "اے اُمتِ مسلمہ! درحقیقت تو خوار اور زبوں حال صرف اس لیے ہوئی کہ قرآن حکیم سے اپنا تعلق توڑ بیٹھی۔ گردشِ دوراں کے شکوے خواہ مخواہ کر رہی ہے۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے (چنانچہ اغیار واعداء تجھے پامال کر رہے ہیں) اب بھی اس "کتابِ زندہ" کی جانب رجوع کر لے جو تیری بغل میں موجود ہے تو تیرے تمام امراض وعلل کا مداوا ہو جائے گا اور جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔)" گویا جس طرح جبران خلیل جبران نے کہا تھا: "عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبہ کے تحت حرکت کرو!" اسی طرح ہماری "اجتماعی توبہ" کا نسخہ یہ ہے کہ: "قرآن سے ایمان حاصل کرو اور ایمان کے روغن سے جُہد وعمل کی شمعیں روشن کرو!"

6) ایمانِ حقیقی کے لازمی اور منطقی نتیجے کو قرآن اکثر و بیشتر تو صرف "عمل صالح" کی نہایت جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے' لیکن کہیں اس کے مضمرات اور متضمنات کو کھول بھی دیتا ہے۔ جیسے سورۃ العصر میں عمل صالح کے دو لوازم کو نمایاں طور پر بیان کر دیا' یعنی "حق کی علمبرداری اور دعوت و اشاعت" اور "باہم ایک

دوسرے کو صبر و مصابرت کی تلقین و نصیحت۔'' اور اس طرح گویا ضمنی طور پر ایک جماعتی زندگی کی اہمیت کو بھی اجاگر کر دیا۔ اسی طرح کہیں قرآن ایمان کے جملہ عملی تقاضوں کو صرف ایک جامع اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے تعبیر فرما دیتا ہے' تو کہیں اس کی تفصیل دس اصطلاحات کے ذریعے کرتا ہے' جیسے کہ سورۃ التوبہ کی آیت 112 میں تو وہ نو اوصاف بیان ہوئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' اور اس سے قبل آیت 111 میں اضافی اصطلاح ''قتال فی سبیل اللہ'' کے ذریعے "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" کے مصداق دس اوصاف کی تکمیل فرما دی۔ اس معاملے میں بھی اس حقیقت کا اعتراف و اظہار ضروری ہے کہ بحمد اللہ سورۃ التوبہ کی آیت 112 میں بیان شدہ نو اوصاف میں سے بھی پہلے سات کا اہتمام تو بعض تصوّف کے حلقوں کے علاوہ تبلیغی جماعت کے احباب بھی کر رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری!

کے مصداق یہ سب حضرات آخری دو اصاف یعنی ''بدی سے روکنے اور حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے'' کا بھی اہتمام کریں اور پھر اگر "نہی عن المنکر بِاللِّسان" سے آگے بڑھ کر "نہی عن المنکر بِالیَد" کی عوامی تحریک کا مرحلہ بھی آ جائے اور ضرورت داعی ہو تو نقد جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور اللہ کے دین کی غیرت و حمیت' اور حمایت و محافظت میں جانیں قربان کر دینے ہی کو حاصل زندگی اور مقصد حیات سمجھ کر میدان میں آ جائیں' اور اس طرح ''اجتماعی توبہ'' کا وہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں جو اس عذابِ الٰہی کے سایوں کو دور فرما دے جو وطن عزیز کے افق پر گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے... آمین!

(سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے چند مزید باتیں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولِہِ الکریم ۔۔۔ امّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا فَاَتْبَعَہُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ ج فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ ج اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ ط ذٰلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ج فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ○ سَآءَ مَثَلاَ نِالْقَوْمُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاَنْفُسَھُمْ کَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ○﴾ (الاعراف:175_177)

﴿وَمِنْھُمْ مَّنْ عٰھَدَ اللّٰہَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَکُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ بَخِلُوْا بِہٖ وَتَوَلَّوْا وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○﴾ (التوبۃ:75_76)

﴿فَلَوْلَا کَانَتْ قَرْیَۃٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَھَآ اِیْمَانُھَآ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ط لَمَّآ اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰھُمْ اِلٰی حِیْنٍ ○﴾ (یونس:98)

آج کے موضوع پر گفتگو سے قبل میں اپنے گزشتہ ہفتے کے خطاب کا خلاصہ بطورِ تمہید آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میری آج کی گفتگو دراصل اسی سابقہ خطاب کا تسلسل ہے۔ پچھلے خطاب میں موجودہ عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ اس معاملے کی تین سطحیں ہیں۔ سب سے اُوپر اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ' جسے ہم عام طور پر امریکہ کہہ دیتے ہیں' اس وقت روئے ارضی پر واحد سپریم طاقت ہے۔ دنیا یک قطبی ہو چکی ہے اور امریکہ ٹیکنالوجی اور اپنی عسکری قوت کے اعتبار سے اس وقت' معاذ اللہ' یہ کہنے کے لیے حق بجانب ہے کہ ''لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ''یعنی آج کس کے ہاتھ میں اختیار ہے؟ قیامت کے دن تو جواب دیا جائے گا کہ ﴿لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ﴾ ''اللہ ہی کے لیے جو تنہا ہے اور قہار ہے!'' لیکن آج دنیا کی سطح پر اس کا جواب یہی ہے کہ ''امریکہ!''

دوسرے یہ کہ ایک تہذیب نے عالمی سطح پر اس پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی تین سطحیں ہیں اور یہ تہذیب بے خدا ہی نہیں' خلافِ خدا ہے۔ پہلی سطح سیاسی ہے' یعنی سیکولرازم کہ ہمارے اجتماعی معاملات میں' ریاست اور حکومت کے معاملات میں' قانون سازی کے معاملات میں کسی خدا' کسی آسمانی ہدایت' کسی وحی' کسی شریعت کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سیکولرازم آج پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔

دوسری سطح مالیاتی ہے اور پوری دنیا میں سود کی بنیاد پر بینکنگ سسٹم رائج ہے۔ یہ سود ہماری پوری معیشت کے اندر تانے بانے کی طرح بُنا ہوا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن جوا ہے' جو ہمارے ہاں تو بہت ہی زیادہ پھیل گیا ہے۔ ہر شے کو بیچنے کے لیے لاٹری کا پراسیس ہے۔ ویسے بھی دنیا کے اندر سٹاک ایکسچینج اور دولت کے الٹ پھیر کی بنیاد یہی جوا ہے۔ اس نظام کا تیسرا ستون انشورنس ہے!

سماجی سطح پر بے حیائی' عریانی' فحاشی' آزاد جنس پرستی ہے۔ چاہے وہ جنس پرستی مرد و عورت کے درمیان (heterosexual) ہو' چاہے وہ دو عورتوں (lesbians) کے درمیان ہو اور چاہے دو مردوں (gays) کے درمیان ہو' اس کی کھلی اجازت ہے۔ خاندانی نظام تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ مغرب میں تو یہ نظام بتمام و کمال وجود میں آچکا ہے' جبکہ مشرق کی طرف بھی یہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک سیلاب کی شکل میں امڈا آرہا ہے۔ اسی کلچر' اسی تہذیب کو ہماری ساری نسل دیکھ رہی ہے اور ظاہر بات ہے اس میں چمک دمک ہے' جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

یہ جھوٹے نگینے ہیں' لیکن چمکدار تو بہت ہیں۔ یہ نظام زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس تہذیب کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی سطح پر بڑی عظیم کانفرنسیں ہو چکی ہیں' جن کا حوالہ میں دے چکا ہوں۔ عریانی و فحاشی کا یہ جو سیلاب آرہا ہے' جسے اب یونائیٹڈ نیشنز اسمبلی نے سوشل انجینئرنگ (سماجی تعمیر) کا نام دیا ہے' اس کا ہدف بھی شمالی افریقہ اور خاص طور پر ایشیا کے مسلمان ممالک ہیں جہاں بحیثیت مجموعی خاندانی نظام ابھی کچھ برقرار ہے' شرم و حیا کی کچھ نہ کچھ وقعت اور قیمت ہے' عفت و عصمت کی کوئی قدر ہے۔

تیسری سطح پر ایک مذہبی کشاکش ہے۔ یہ کشاکش ذرا خفیہ سی ہے' اسے عام لوگ نہیں جانتے۔ اس مذہبی کشاکش میں اس وقت سب سے مؤثر کردار یہودیوں کا ہے' جو اس وقت عالم انسانیت کی عظیم ترین سازشی قوت ہے۔ سازشیں کرنا (conspiracies) اور طویل المیعاد پروگرام بنا کر ان کو پورا کرنا' اس میدان میں اس قوم کے مدمقابل کوئی نہیں آسکتا۔ اور ان کا پروگرام یہ ہے کہ پوری دنیا پر ان کا اقتصادی قبضہ ہو جائے۔ براہِ راست فوجی قبضہ نہیں' بلکہ اقتصادی قبضہ۔ مزید برآں مشرقِ وسطیٰ کے اندر ایک بڑی ریاست گریٹر اسرائیل قائم کرنا' مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو گرانا اور اس کی جگہ پر اپنا تھرڈ ٹمپل تعمیر کرنا اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر رکھ دینا۔ یہ ہے ان کا پروگرام اور اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔ دوسری طرف تمام عیسائی قوتیں ان کے تابع ہو چکی ہیں۔ البتہ بعض عیسائی' خاص طور پر پروٹسٹنٹ' ان میں بھی خاص طور پر Baptists اور ان میں بھی اخص الخواص کے اعتبار سے Evengelists یہودیوں کے مکمل آلہ کار ہیں۔ اور نوٹ کر لیجیے کہ صدر بش

Evengelist ہے۔عیسائی دنیا' خاص طور پر یورپ کے کیتھولک عیسائی' جن کی فرانس' جرمنی' سپین اور اٹلی میں اکثریت ہے' یہ اصل میں فلسطین میں ایک عیسائی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔گویا مسلمانوں کے خلاف دونوں ہیں۔اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیسے دوسرے ملینیم کے شروع میں کروسیڈز (صلیبی جنگیں) شروع ہوئی تھیں' اب یہ فائنل کروسیڈ ہونے والا ہے۔''کروسیڈ'' کا یہ لفظ بش کی زبان پر بھی آ گیا تھا۔ پہلے والے کروسیڈ کا مقصد یہ تھا کہ ارضِ مقدس پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ یہ علاقہ یہودیوں کے لیے بھی ارضِ مقدس ہے' عیسائیوں کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی۔ البتہ یہودیوں کی پشت پناہی کر کے عیسائی وہاں یہودی مملکت کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اسے ذرا سمجھ لیجیے! ان کا عقیدہ ہے کہ جب گریٹر اسرائیل بن جائے گا' بڑی عظیم جنگ'' آرمیگاڈان'' ہوگی، عربوں کا خون خرابہ کیا جائے گا' مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ گرا دیے جائیں گے' وہاں پر معبدِ سلیمانی بن جائے گا اور وہاں تختِ داؤد علیہ السلام لا کر رکھ دیا جائے گا تب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں نازل ہوں گے اور اس تختِ داؤد علیہ السلام پر بیٹھ کر دنیا میں حکومت قائم کریں گے۔لہٰذا ان کی یہ خواہش ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں جلد از جلد آئیں۔وہ چاہتے ہیں کہ یہ سارے واقعات جلد از جلد واقع ہو جائیں۔

ایک بات مزید نوٹ کر لیجیے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا مشترک دشمن اسلام اور مسلمان ہیں اور ان کا سب سے بڑا ٹارگٹ پاکستان ہے۔ اِس وقت (2004ء) کی عالمی صورت حال یہ ہے اور بحالاتِ موجودہ اسلام کے بحیثیت دین' ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے نافذ ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہاں اسلام صرف ایک مذہب کی حیثیت سے زندہ رہ سکتا ہے۔صرف ہمارے عقائد' عبادات اور سماجی رسومات جو انفرادی زندگی تک محیط ہیں' مغرب کو گوارا ہیں۔ باقی سیاسی نظام' معاشی نظام اور سماجی نظام وہ ہوگا جو تین سطحیں میں نے گنوائیں۔اس کے علاوہ کسی نظام کو وہ دنیا میں برداشت نہیں کر سکتے۔اور اس معاملے میں اس وقت سب سے بڑا گٹھ جوڑ امریکہ اور یہودیوں کا ہے۔

مجھے آج ''پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات اور بچاؤ کی تدابیر'' کے حوالے سے گفتگو کرنی ہے۔ بحمد اللہ' میرا معاملہ یہ رہا ہے کہ میں ہمیشہ سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں پُرامید رہا ہوں۔لیکن نائن الیون کے بعد ہم نے جو راستہ اختیار کیا اور جس کے ہولناک نتائج اب سامنے آ رہے ہیں' اس کے پیش نظر میرے شدتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی (countdown) شروع ہو چکی ہے؟ اور کیا ابھی نجات کا کوئی راستہ کھلا ہے؟

ان دونوں سوالوں کے بارے میں جب میں غور کرتا ہوں اور قیام پاکستان سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ واقعتاً پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع کی جا چکی ہے اور بہتری کی طرف لے جانے والا ہر راستہ بظاہر بند نظر آتا ہے' لیکن قرآن وسُنّت کی جو رہنمائی اللہ نے مجھے بخشی

ہے اس کی بنا پر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ واقعتاً ابھی تک ایک راستہ کھلا ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں اب مہلت بہت کم ہے۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ ع ''دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!''

بات سمجھ لیجئے! کسی مملکت یا سلطنت کے ختم ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ زمین ختم ہو جائے' وہ سرزمین آسمان میں چلی جائے یا پاتال میں دھنس جائے' بلکہ سلطنتوں یا مملکتوں کے خاتمے کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ balkanization ہو جائے' اس کے حصے بخرے ہو جائیں اور سابق نام باقی ہی نہ رہے۔ یعنی پھر دنیا کے نقشے پر اس نام سے کوئی خطہ موجود نہ ہو۔ اور یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ پچھلی یعنی بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بے مثال ہے کہ اس کے آغاز میں ایک عظیم سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی' اس کے حصے بخرے ہوئے' ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور سلطنت عثمانیہ کا نام دنیا میں ختم ہو گیا۔ اب دنیا کے نقشے میں آپ کو سلطنت عثمانیہ کا نام لکھا ہوا کہیں نظر نہیں آئے گا' حالانکہ وہ عظیم سلطنت عثمانیہ (Great Ottoman Empire) تھی' جو عظیم سلطنت روما (Great Roman Empire) کی طرح تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ پورا شمالی افریقہ' پورا مغربی ایشیا اور پورا مشرقی یورپ اس میں شامل تھا۔ لیکن اس عظیم سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے ہوئے' لے دے کے ترکوں کے پاس 'ترکی' نام کا ایک چھوٹا سا ملک رہ گیا۔ اس سلطنت کا نام ختم ہو گیا۔ اب آپ کو ڈھونڈے سے بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کہاں ہوتی تھی۔ اور یہ معاملہ ہوا ہے پچھلی صدی کے آغاز کے بیس سالوں کے اندر اندر' تقریباً دوسری دہائی کے خاتمے پر۔ اس کے برعکس پچھلی صدی کی آخری دہائی میں 1990ء کے قریب یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ریپبلکس (USSR) ختم ہوئی' جو دنیا کی ایک سپر پاور تھی۔ آج دنیا کے نقشے میں USSR نام لکھا ہوا کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تو کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے' ابھی کل پندرہ سولہ برس ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے پاکستان کا بھی امکان ہے کہ یہ صورت حال پیش آجائے۔

مملکتوں کے ختم ہونے کی ایک دوسری شکل بھی ہے۔ وہ یہ کہ لکیر بھی برقرار رہے' نام بھی برقرار رہے' لیکن اس کی کوئی خود اختیاری نہ ہو' اس کے اندر کوئی self-determination نہ ہو' اس میں اپنے اصولوں کے دفاع میں کھڑے رہنے کی طاقت نہ ہو اور وہ کسی دوسری بڑی سلطنت و مملکت کے تابع مہمل کی شکل اختیار کر لے' یا یوں کہیے کہ سیٹلائٹ یعنی طفیلی ملک بن جائے۔ یہ دوسری شکل ہے اور پاکستان کے مستقبل کے لیے یہ امکان بھی ہے کہ پاکستان بھارت کا سیٹلائٹ بن کر رہ جائے اور بھارت چاہے تو ان لکیروں کو قائم رکھے' چاہے تو حصے بخرے کر دے۔ غالباً اس کی مصلحت اسی میں رہے گی کہ زیادہ سردرد مول نہ لے' مختلف صوبے ہوں گے تو ان میں سے ہر ایک سے الگ الگ نپٹنا پڑے گا' اس کے حق میں بہتر یہ ہو گا کہ پاکستان ایک سٹیٹ کی حیثیت سے یکجا رہے اور اس کی حقیقت بس نیپال سے کوئی دس گنا بڑے ملک کی ہو' لیکن اس کی حیثیت

نیپال سے زیادہ نہ ہو۔

اب آپ دیکھیں کہ پاکستان کے بارے میں دنیا میں کیا پیشین گوئیاں ہو رہی ہیں:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا!!

سب سے پہلے میں ایک مسلمان مصنف سید ابوالمعالی کی کتاب کا حوالہ دوں گا۔ پیدائشی طور پر یہ بہار سے تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم کے تقریباً چند دن پہلے پیدا ہوئے تھے۔ وہاں سے والدین کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے' وہاں سے پورا خاندان مغربی پاکستان آ گیا۔ ان کی بیشتر تعلیم کراچی میں ہوئی' پھر یہ مغربی ممالک میں چلے گئے جیسے بہت سے لوگ گئے ہیں۔ وہاں پر انہوں نے پی ایچ ڈی کی ہے اور وہاں کافی بڑے دانشور سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب وینٹیج پریس مین ہٹن نیویارک سے 1992ء میں شائع ہو کر 1993ء میں پاکستان آئی تھی۔ کتاب کا نام "The Twin Eras of Pakistan" ہے۔ یعنی "پاکستان کے جڑواں ادوار"۔ اس میں ہماری سیاسی تاریخ میں آگے پیچھے آنے والے سیاسی اور فوجی ادوار کا تذکرہ ہے۔ مغرب میں دانشور جو گفتگوئیں کرتے ہیں یا وہاں کے سیاسی پنڈت جو پیشین گوئیاں کرتے ہیں درحقیقت انہوں نے اس کا ایک مجموعی تاثر اس کتاب میں دے دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ 2006ء میں پاکستان آٹھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوگا۔ ان میں سے چار آزاد ریاستیں ہوں گی' تین تو خالص پاکستان سے نکلیں گی' جبکہ ایک بھارت اور پاکستان سے کچھ علاقے جوڑ کر بنائی جائے گی۔ انہوں نے جن تین خالص پاکستانی ریاستوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے ایک ریپبلک آف بلوچستان ہو گی اور پورا موجودہ بلوچستان اس میں شامل ہوگا۔ ان کے بقول یہ اس علاقے کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ' سب سے زیادہ خوشحال اور سب سے زیادہ معدنی اور صنعتی طاقت ہو گی۔ دوسری کراچی اور حیدر آباد کو ملا کر اردو بولنے والوں کے لیے لیاقت پور یا لیاقت آباد کے نام سے ایک ریاست بن جائے گی۔ تیسری ریاست سندھو دیش کے نام سے ہو گی۔ یعنی جن علاقوں کا outlet سمندر پر ہے وہ سب ایک آزاد قوم' آزاد ملک' آزاد ریاست بن جائیں گے' جبکہ شمالی علاقہ جات مثلاً گلگت' ہنزہ وغیرہ اور آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر (جس کو ہم مقبوضہ کہتے ہیں اور انڈیا آزاد کشمیر کہتا ہے) ان کو جوڑ کر ایک کشمیری ریاست وجود میں آ جائے گی اور یہ امریکہ کا بڑا پرانا خاکہ ہے۔

آج سے کچھ عرصہ قبل تو امریکہ کی اسسٹنٹ سیکریٹری آف سٹیٹ رابن رافیل نے کھل کر بیان دیا تھا کہ ہم ان دونوں کشمیروں (پاکستانی کشمیر اور بھارتی کشمیر) کے ساتھ پاکستان کے شمالی علاقہ جات شامل کر کے' جو کہ کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کے ماتحت تھے اور مزید یہ کہ لداخ کے جو علاقے پاکستان نے چین کو دے دیے تھے چین سے واپس لے کر ایک آزاد ملک بنائیں گے۔ اس کے بعد بہت عرصے تک یہ آواز نہیں آئی تھی' لیکن اب

امریکہ کے ایک سینیٹر نے یہی بات پھر کہی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ انڈین کشمیر' پاکستانی کشمیر اور شمالی علاقوں سے دونوں ملکوں کی فوجیں واپس چلی جائیں اور یہ علاقہ یونائیٹڈ نیشنز اسمبلی کو دے دیا جائے' وہ یہاں پر اپنے اہتمام میں استصوابِ رائے (plebiscite) کروائے اور اس کے اندر کشمیریوں کے لیے تین اختیارات (options) ہوں کہ آپ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا آزاد و خود مختار کشمیر چاہتے ہیں۔ حالات جس نہج پر جا رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا رخ خود مختار کشمیر کی طرف ہوگا۔ اس لیے کہ وہ پاکستان سے مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان نے ہمیں دھوکہ دے کر ہمارے اتنے لوگ مروا دیے اور اب اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ لہٰذا ان کے options میں پاکستان نہیں آئے گا اور وہ آزادی چاہیں گے' اور یہ آزاد ریاست امریکہ کی سازشوں کا گڑھ بنے گی۔ یہ ایک نیا ''اسرائیل'' بنے گا۔ ایک اسرائیل ایشیا کے مغرب میں ہے اور ایک اسرائیل ایشیا کے بطن میں قائم کیا جائے گا۔ اس لیے کہ آج امریکہ کی Containment of China Policy وہی اہمیت رکھتی ہے جو چالیس برس تک Containment of USSR Policy کی تھی۔ اس کے لیے یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے تو اسے اور کیا چاہیے! وہ ایک ایک کشمیری کو سونے چاندی میں تول سکتا ہے۔ وہ ان کو خوشحال بنانے کے لیے بڑی سے بڑی مراعات اور امداد دے گا' تا کہ اس کا اس علاقے کے اندر عمل دخل قائم ہو جائے۔ بہرحال میں نے اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کر دی ہے کہ یہ امریکہ کی پرانی سکیم ہے جو اَب پھر اٹھ کر سامنے آ رہی ہے۔

چار خود مختار ریاستوں کے قیام کے بعد جو چار حصے پاکستان باقی رہ جائے گا اس میں ایک شمالی پاکستان ہو گا' یعنی چترال سے لے کر مالاکنڈ تک۔ پھر مالاکنڈ کے پہاڑ سے لے کر نیچے پختون علاقے تک مغربی پاکستان ہوگا۔ پھر یہ کہ سندھ میں سے سندھو دیش بناتے ہوئے ایک چھوٹی سی پٹی نکالی جائے گی تا کہ بچے کھچے پاکستان کو بھی سمندر تک رسائی حاصل ہو جائے۔ اس لیے کہ موجودہ کراچی تو لیاقت آباد کے اندر چلا جائے گا۔ پورٹ قاسم جو بنائی جا رہی ہے وہ سندھو دیش کے لیے ہے۔ بہرحال سندھ سے راستہ دے کر بقیہ پاکستان کو سمندر تک پہنچا دیا جائے گا۔ باقی سینٹرل پاکستان ہوگا' اس میں پنجاب کے ساتھ کچھ سرائیکی علاقہ شامل ہوگا' جبکہ کچھ سرائیکی علاقہ بلوچستان میں اور کچھ سندھ میں چلا جائے گا۔ جو باقی ہوگا وہ اس سینٹرل پاکستان میں آ جائے گا۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے جو کسی کافر کی نہیں' کسی یہودی کی نہیں' بلکہ ایک مسلمان دانشور ڈاکٹر ابوالمعالی سیّد کی ہے۔ یہ وحی نہیں ہے' لیکن بہرحال اس میں ان سازشوں کا انعکاس موجود ہے جو فضا کے اندر ہو رہی ہیں۔ گویا

ع ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!''

دوسری پیشین گوئی امریکہ کے سب سے بڑے تھنک ٹینک کی ہے جو امریکہ کی وزارت خارجہ کے پالیسی ونگ کا تھنک ٹینک ہے۔ اس میں سب سے اونچے پندرہ اداروں کے سربراہ شامل ہیں۔ انہوں نے چند سال

پہلے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ 2020ء میں پاکستان کے نام سے کوئی ملک نہیں رہے گا۔ گویا کہ جو حشر سلطنتِ عثمانیہ کا اور سوویت یونین کا ہوا تھا وہ پاکستان کا بھی ہو جائے گا۔ سب سے پہلے یہ رپورٹ بھارت کے ایک جریدے ''آؤٹ لک'' میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اسے روزنامہ جنگ نے اپنی 16 ستمبر 2000ء کی اشاعت میں شائع کیا اور ساتھ لکھ دیا کہ اسے کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھا جائے' بلکہ اسے سنجیدگی سے نوٹ کیا جانا چاہیے۔

تیسری بات رابرٹ کیلان نے کی۔ ''The End of the Earth'' کے عنوان سے ان کا مضمون 20 ستمبر 2000ء کو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا تھا۔ وہ اس میں لکھتے ہیں: ''Pakistan is a failed state'' یعنی پاکستان ہر اعتبار سے ناکام ریاست ثابت ہو چکی ہے' جلد ہی اس میں خانہ جنگی شروع ہو گی اور انتشار اور انارکی پیدا ہو جائے گی۔ اس مضمون میں ایک خاص بات یہ کہی گئی ہے کہ پاکستان اور افغانستان گویا ایک یونٹ کی شکل میں ہوں گے۔ یہ چند حوالے ہیں جو میں نے آپ کو دیے ہیں۔

اس دردناک انجام کے اسباب: پہلا بنیادی اور داخلی

اب آیئے اس کے اصل اسباب کی طرف کہ ایسا کیوں ہو گا؟ جبکہ میں بھی کہہ رہا ہوں اور میرا یہ موقف ہے کہ واقعتہً پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ میں ان اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک ہے اصل اور بنیادی' اور داخلی اور خود کردہ' اور دوسرا فوری اور خارجی۔ اس ''خود کردہ'' کے بارے میں کسی نے کہا ہے''خود کردہ را علاجے نیست''۔ کسی اور نے آپ کی ساتھ کوئی برائی کی ہو تو شاید اس کا کوئی مداوا ہو سکے' لیکن اگر آپ نے خود کی ہو تو اس کا کوئی مداوا نہیں۔ پاکستان کے قیام کا جو اصل مقصد تھا اس کو ہم نے ترک کیا۔ اب یہ ایک بے مقصد ملک ہے۔ گویا یہ ایسا تیر ہے جس کا کوئی ہدف ہی نہیں۔ ع ''آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف''۔ اقبال اور جناح جو مؤسسین پاکستان تھے' انہوں نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں' تاکہ ایک لائٹ ہاؤس وجود میں آ جائے' یہ پورے عالمِ انسانیت کے لیے روشنی کا ایک مینار ثابت ہو۔ اس لیے کہ دنیا میں اندھیرا ہے' انسان کو نظامِ عدلِ اجتماعی کی تلاش ہے' لیکن مل نہیں رہا۔ اس نے بڑی قلابازیاں کھائی ہیں۔ وہ فرانس کے انقلاب کے ذریعے ملوکیت اور جاگیرداری کے دور سے نکلا تو سرمایہ داروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ پہلے جاگیردار مسلط تھا' اب بدترین شکل میں سرمایہ دار مسلط ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے ردِعمل میں کمیونزم آیا' وہ بھی ختم ہو گیا۔

اب انسان پھر انتظار میں کھڑا ہے اور امریکہ اور اُس کے اتحادی سب یہی چاہتے ہیں کہ ان کا نظام سیکولرازم ہی پوری دنیا میں قائم و دائم رہے' سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط برقرار رہے اور مغربی تہذیب

پوری دنیا پر چھا جائے جس میں شرم و حیا اور عفت و عصمت کے تمام تقاضے ختم ہیں۔ اس کے مد مقابل اگر کوئی نظام نہ آیا' یعنی اسلام سامنے نہ آیا تو پھر کمیونزم سے ملتی جلتی کوئی شکل دوبارہ وجود میں آ جائے گی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انسان نے بغاوت کی تھی تب ہی تو کمیونزم آیا تھا' اور آج جب یہ سرمایہ دارانہ نظام گلوبل ہو رہا ہے تو اس کے خلاف پھر بغاوت ہو رہی ہے۔ جہاں کہیں بھی گلوبلائزیشن کے لیے کوئی میٹنگ ہوتی ہے تو مخالف مظاہرے ہوتے ہیں' سیٹیل میں ہنگامے ہوئے' توڑ پھوڑ ہوئی اور کرفیو لگا۔ واشنگٹن میں ہوئے' ڈیووس میں ہوئے۔ دنیا میں کتنی جگہوں پر بڑے عظیم مظاہرے ہوئے ہیں۔ مغرب والوں کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔ پہلے بھی اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت مغرب میں ہوئی تھی' اس لیے کہ روس مغرب کا حصہ شمار ہوتا ہے' اگرچہ مشرقی ملک بھی ہے' اور اب عین کیپٹل ازم کے گھر کے اندر بغاوت اٹھ رہی ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ امریکہ اور اس کی تمام اتحادی قوتیں زور لگا کر چاہیں گی کہ اس بغاوت کو کچل دیں' Nip the evil in the bud کے مصداق اٹھنے سے پہلے ہی اس کا سر کچل دیا جائے۔

مؤسسینِ پاکستان اقبال اور جناح کے افکار میں تو زیادہ زور اسلام کے نظامِ اجتماعی پر تھا' یعنی اسلام کا سیاسی' اقتصادی اور سماجی نظام (System of Social Justice Given by Quran) لیکن تحریک پاکستان کی علماء و مشائخ نے جو حمایت کی تھی ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اس خطے میں اسلامی قوانین اور اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔ بے شمار علماء و مشائخ نے اس تحریک کی حمایت کی تھی۔ پیر جماعت علی شاہ' پیر صاحب مانکی شریف اور وقت کے تقریباً تمام مشائخ مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ اگرچہ جمعیت علمائے ہند اور مولانا حسین احمد مدنی ؒ قیامِ پاکستان کے مخالف تھے' لیکن علماء کی بہت بڑی تعداد تحریک پاکستان کے ساتھ تھی۔ خود شبیر احمد عثمانی ؒ علمائے دیوبند سے ٹوٹ کر آ گئے تھے! جمعیت علمائے ہند سے کٹ کر جمعیت علمائے اسلام بنی تھی اور اس نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی سزائیں اور اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں۔ یہ دونوں پہلو سامنے رکھیے' جو ایک دوسرے سے قدرے مختلف لیکن درحقیقت لازم و ملزوم ہیں۔ قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کے نزدیک اسلام کا نظامِ اجتماعی تھا جو انسان کو عدل دیتا ہے' جبکہ علماء و مشائخ کے نزدیک اسلامی قوانین و شریعت خصوصاً حدود و تعزیرات کا نفاذ تھا جو اس نظام کو سہارا دیتے ہیں۔ لیکن ہوا کیا ہے؟ ساڑھے چھپن سال گزر گئے اور ان میں سے کسی ایک جانب بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا تھا' اس کے خلاف بھی ہمارے ہاں بغاوت ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے آپ کا سارا elite طبقہ سراپا احتجاج بنا ہوا ہے' خواتین کی لیڈر کھڑی ہو گئی ہیں کہ اس کو ختم کیا جائے۔ اور ویسے بھی وہ اس پورے معاشرے میں غیر مؤثر ہے' اس کی بالکل کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ نافذ کی گئی تو سود میں سے کمیشن لے لیا' اللہ اللہ خیر سلا۔ اس طرح زکوٰۃ بدنام ہو گئی' حالانکہ دعویٰ یہ تھا

کہ نظامِ زکوٰۃ نافذ کیا جائے گا۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ نظامِ زکوٰۃ کے ذریعے سوشل سکیورٹی کا مکمل نظام نافذ کیا جائے' تاکہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی گارنٹی دی جا سکے۔ مغرب نے سوشل سکیورٹی کا نظام مسلمانوں کے نظامِ زکوٰۃ سے ہی اخذ کیا ہے کہ ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت کے ذمہ ہے۔ اگر کوئی کسی مل یا دفتر میں کام کر رہا ہے وہ تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہے' لیکن اگر کسی کو کوئی ملازمت نہیں مل رہی تو حکومت کے ذمہ ہے کہ اس کو اتنی رقم دے کہ وہ اپنا ضروری خرچ چلا سکے۔ کسی کے پاس مکان نہیں ہے تو حکومت اسے مکان مہیا کرے۔ انہوں نے poor houses بنائے ہوئے ہیں اور بے گھروں کو مکان کی چابی مل جاتی ہے۔ دعویٰ تھا کہ یہاں بھی یہ سب کچھ زکوٰۃ کے ذریعے ہو جائے گا۔ لیکن زکوٰۃ نافذ ہوئی بھی تو لولی لنگڑی' اس لیے کہ یہ تو زکوٰۃ کے نام پر سیاسی استحصال تھا۔

اب اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے بھی دو نتیجے ہیں۔ ایک نتیجہ خالص عقلی اعتبار سے ہے کہ پاکستان اپنی وجہ جواز کھو چکا ہے۔ جو اِس کا مثبت مقصد تھا ساڑھے چھپن سال کے اندر بھی اس کی طرف پیش رفت نہیں کی گئی۔ کسی بھی شے کے وجود کے لیے کوئی وجہ جواز ہوتی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ کوئی شے جب اپنی وجہ جواز کھو بیٹھے تو اب وہ ایک ایسی کشتی کے مانند ہے جس کا لنگر ہی نہیں' لہٰذا کوئی لہر آئے گی تو اسے اِدھر لے جائے گی' کوئی اور زوردار لہر آئے گی تو اُدھر لے جائے گی۔ ہم اِس وقت بے بنیاد ہیں۔ اس وقت زمین پر ہمارا کوئی قدم نہیں ہے' ہوا میں معلق ہیں۔ اس وقت ہم پر قرآن مجید کی وہ آیت راست آتی ہے جو یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے کہی گئی تھی:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط﴾ (المائدۃ:68)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! (اے یہودیو اور عیسائیو!) تم کسی شے پر قائم نہیں ہو (تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے' تمہاری کوئی جڑ نہیں ہے) جب تک تم تورات' انجیل اور جو کچھ تمہاری طرف (زبور اور دیگر صحیفے وغیرہ) نازل کیا گیا ہے قائم نہیں کرتے۔''

اسے میں یوں کہا کرتا ہوں کہ ہمارا منہ ہی نہیں ہے کہ ہم اللہ سے دعا کریں' ہماری دعا ہمارے مُنہ پر دے ماری جائے گی' کہ کس منہ سے دعا کرتے ہو؟ تم نے ہمارے قانون' ہماری ہدایت کو تو نافذ کیا ہی نہیں۔ پاکستان کو اِس وقت یہی صورت حال درپیش ہے۔

مذہبی اعتبار سے نتیجہ یوں نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ سے ہم نے وعدہ خلافی کی۔ ہم نے کہا تھا اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے۔ اس لیے کہ ہم پر انگریز کی غلامی کے ساتھ ہندو کی غلامی بھی تھی۔ ہم ہندو کی معاشی غلامی میں مبتلا تھے۔ ہندو بنیا ایک گاؤں میں بیٹھا ہوتا تھا اور وہ سود پر رقمیں دے کر

مسلمانوں کی زمینیں ہتھیا لیتا تھا۔ ہندوستان میں پورا کاروبار، پوری صنعت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ بہت سے دانشور جب پاکستان کی برکات بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پورے انارکلی بازار میں مسلمانوں کی صرف ایک دکان تھی، جبکہ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تو ہمارے اوپر دو غلامیاں مسلط تھیں، ایک غلامی انگریز کی جو کہ عسکری، سیاسی اور ریاستی غلامی تھی، اور ایک ہندو کی معاشی اور سماجی غلامی۔ ہم ہندوؤں کے سماجی غلام بھی تھے۔ ہم ہندوؤں کے رسوم ورواج اور تہوار مناتے تھے، اور آج بھی مناتے ہیں۔ تو ہم نے اللہ تعالیٰ سے ان سے نجات کی دعائیں مانگی تھیں۔ میں خود اس کا عینی شاہد ہوں۔ اس وقت میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک کارکن اور رہنما بھی تھا۔ اس لیے کہ میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ وہاں صرف ہائی سکول کی فیڈریشن تھی، اس لیے کہ کالج تو پورے ضلع میں تھا ہی نہیں۔ صرف بھوانی نامی قصبے میں ایک کالج تھا جو ہندو سیٹھوں کا قصبہ تھا۔ ہم نے جلوس نکالے، نعرے لگائے: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' ہم نے جمعہ اور عیدین کے اجتماعات میں دعائیں مانگیں: اے اللہ! ہمیں ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی سے نجات دے، تاکہ تیرے دین کا بول بالا کریں، تیرے نبی ﷺ کا دیا ہوا نظام قائم کریں۔ اللہ نے تو وعدہ پورا کر دیا، لیکن ہم نے اللہ سے وعدہ خلافی کی۔

سورۃ الاعراف کی آیت 129 میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب کچھ اسرائیلیوں نے کہا تھا: اے موسیٰ علیہ السلام! آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں ستایا جاتا تھا اور اب بھی ستایا جا رہا ہے، یعنی آپ کی تشریف آوری سے ہماری حالت میں تو کوئی فرق نہیں آیا، تو انہیں موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا تھا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّهۡلِكَ عَدُوَّکُمۡ﴾ ''قریب ہے تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے''۔ فرعون اور اس کے لاؤلشکر کو تباہ کر دے۔ ﴿وَیَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ ''اور زمین میں تمہیں خلافت عطا کرے (حکومت اور طاقت دے)''۔ ﴿فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ﴾ ''پھر وہ دیکھے گا تم کیا کرتے ہو!'' اسی امتحان میں ہم ساڑھے چھپن برس گزار چکے ہیں اور ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہم نے اللہ سے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس وعدہ خلافی کا نتیجہ کیا ہے؟

جب کوئی قوم اجتماعی طور پر اللہ سے کوئی وعدہ کر کے وعدہ خلافی کرے تو دنیا میں اس کی یہ سزا ملتی ہے کہ اس قوم کے اندر اجتماعی طور پر نفاق اور منافقت کا مرض پیدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ نفاق اور منافقت اللہ کو کفر سے بھی زیادہ ناپسند ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء :145) ''منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے''۔ اس لیے کہ انہیں حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ (آیت 80) میں ارشاد ہوا: ﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ط اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ط﴾ ''ان کے لیے آپ ﷺ خواہ استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپ ﷺ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

سورۃ التوبہ کی آیات 75 تا 77 ملاحظہ کیجیے: ﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ﴾ ''اور ان (مدینے کے منافقوں) میں ایک قسم اُن کی ہے جنہوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا'' ﴿لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ﴾ (75) ''کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا (غنی اور دولت مند کر دے گا) تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے''۔ ﴿فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ﴾ ''پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے بخل سے کام لیا''۔ اپنی تجوریوں کے دروازے مقفل کر دیے۔ ﴿وَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ﴾ (76) ''وہ اپنے عہد سے پھر گئے اور اللہ سے اعراض کیا''۔ ﴿فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ﴾ ''تو اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری پیدا کر دی قیامت کے دن تک کے لیے بسبب اس خلاف ورزی کے جو انہوں نے اللہ سے وعدہ کرنے کے بعد کی''۔ یہاں ''اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ'' کے الفاظ بہت خطرناک ہیں' لرزہ طاری کر دینے والے ہیں۔ ﴿وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ﴾ (77) ''اور بسبب اس کے جو وہ جھوٹ بولتے رہے''۔ اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے کہ ہم ایسا کریں گے۔ تو پاکستانی قوم اِس وقت اس اعتبار سے اجتماعی منافقت کا شکار ہو چکی ہے۔ صرف کچھ افراد ہیں جو اِس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ بھٹکی ہوئی قوم اپنی راہ اور منزل کو دوبارہ یاد کر لے۔ ع ''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!'' تو ایسے لوگ مستثنیٰ ہیں۔ استثناءات سے تو قانون بالکل ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ Exceptions prove the rule وہ قانون یہ ہے کہ آج ہم بحیثیت مجموعی دنیا کی منافق ترین قوم ہیں۔

ہمارے ہاں دو قسم کے نفاق پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک قومی نفاق ہے۔ پہلے ہم ہندوؤں کے مقابلے میں ایک قوم تھے۔ ہم نے اپنی تحریک کے لیے ''دو قومی نظریہ'' کو بنیاد بنایا۔ آج ہم نفاقِ باہمی کا شکار ہو کر قومیتوں میں تحلیل ہو گئے۔ اب الگ الگ قومیں ہیں۔ چار تو شروع سے تھیں' پنجابی' پٹھان' بلوچی' سندھی' اب اس میں سرائیکی اور مہاجر قومیت کا اضافہ ہو گیا ہے' وہ بھی مدعی ہیں کہ ہماری علیحدہ قومیت ہے۔ الغرض یہ نفاقِ باہمی کے مظاہر ہیں۔

دوسرا نفاق کردار کا ہے' یعنی جھوٹ' وعدہ خلافی اور خیانت۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے' کہیں امین بنایا جائے تو خیانت کرے''۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: ((وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ)) ''چاہے وہ روزہ رکھتا ہو' نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو''۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں عوامی سطح پر تو جس طرح ہیں سب کو معلوم ہے' لیکن قابل توجہ اور قابل حذر بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو جتنا اونچے درجے

پر ہے اتنا ہی جھوٹا' اتنا ہی وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ سینکڑوں ہزاروں تو کیا اب اربوں کی خیانتیں ہوتی ہیں' غبن در غبن ہے۔ گویا ہم اس وقت قومی سطح پر نفاق کے مریض ہیں۔

اس نفاق کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ''عذابِ ادنیٰ'' کی شکل میں 1971ء میں ہم پر نازل ہوا۔ ہمیں زبردست شکست ہوئی' ہمارے 93 ہزار فوجی ہتھیار پھینک کر ہندوستان کی قید میں چلے گئے۔ پاکستان دولخت ہوا۔ ہمارے ٹائیگر جنرل نیازی نے جنرل اروڑہ کو اپنا پستول پیش کر دیا۔ یہ بدترین اور شرمناک ترین شکست تھی۔ یہ عذابِ ادنیٰ ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ السجدۃ کی آیت 21 کے الفاظ ہیں:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○﴾

''ہم انہیں مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔''

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے چھوٹا عذاب بھیجا کرتا ہے' کبھی قحط کی شکل میں' کبھی سیلاب کی شکل میں' شاید کہ لوگ جاگ جائیں' اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ لیکن ہم نے عذابِ ادنیٰ سے' جو ایک حادثہ فاجعہ تھا' کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ پھر اب عذابِ اکبر ہے جو سر پر کھڑا ہوا ہے۔ اور یہ عذابِ اکبر بھی دنیا کا ہے۔ دنیا میں عذابِ اکبر یہ ہوتا ہے کہ کسی قوم کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ یہ دنیا میں مختلف قوموں پر آتا رہا ہے' قومِ نوح' قومِ لوط' قومِ صالح وغیرہ پر یہ عذاب آیا تھا کہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ ''پھر ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی''۔ جڑ اگر برقرار رہے تو وہ پودا دوبارہ اُگ سکتا ہے' لیکن جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اب پودے کے دوبارہ اگنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان اقوام کے لیے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ﴾ ''اب ان کے مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا''۔ قومِ ثمود نے چٹانیں تراش تراش کر جو محل بنائے تھے' ان میں رہنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ اور یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ: ﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا﴾ ''جیسے وہ ان میں کبھی آباد ہی نہیں تھے''۔ نسیاً منسیاً ہو گئے۔ یہ ہے عذابِ اکبر! اور نوٹ کیجئے' میں کم سے کم 1984ء سے اس کا انذار کر رہا ہوں۔ پورے بیس سال ہو گئے ہیں۔ اِس پورے ملک کے اندر میں واحد شخص ہوں جو اس وقت سے کہہ رہا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اسلام قائم نہ کیا تو پاکستان کا وجود نہیں رہے گا۔ یہ اپنی وجہ جواز کھو چکا ہے اور بے جواز چیز قائم نہیں رہا کرتی۔ اب بھی موقع ہے اسے مستحکم کر لو۔ میں نے اس وقت ایک کتاب لکھی تھی ''استحکامِ پاکستان'' جس میں واضح کیا تھا کہ استحکام اس صورت میں آئے گا کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے' اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی بھی قائم کیا جائے اور اسلامی قوانین اور شریعت بھی نافذ کی جائے۔ پھر میں نے اس کتاب کا دوسرا حصہ ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس کتاب کے آغاز میں جلی حروف میں یہ عبارت موجود ہے:

''93ھ مطابق 712ء میں اسلام بیک وقت برعظیم ہند میں براستہ سندھ اور براعظم یورپ میں

براستہ سپین داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں! کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟

آگ ہے‘ اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہے‘ نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

”فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ!“

1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلم سپین کا وجود ختم ہو گیا اور 1602ء تک جزیرہ نما آئبیریا میں ایک مسلمان بھی باقی نہیں چھوڑا گیا۔ یا تو قتل کر دیے گئے یا جلا دیے گئے یا پھر جہازوں میں بھر بھر کر شمالی افریقہ کے ساحل پر پھینک دیے گئے۔ تو میں نے اس کتاب میں لکھا ہے: کیا یہی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟ یہ میری 1986ء کی تحریر ہے۔ بنی اسرائیل جو سابقہ اُمت مسلمہ تھی جب ان پر بخت نصر کے ہاتھوں پہلا عظیم ترین عذاب آنے والا تھا‘ جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہوا معبد (مسجد اقصیٰ) اس طرح مسمار کر دیا گیا کہ اس کی کوئی دو اینٹیں بھی سلامت نہیں رہیں‘ اور چھ لاکھ یہودی موقع پر قتل کیے گئے جبکہ چھ لاکھ کو وہ ہانک کر بابل (Babylonia) لے گیا جہاں وہ سو برس تک حالتِ غلامی میں رہے‘ جسے وہ Era of Captivity کہتے ہیں۔ (اُس وقت عراق کو سلطنت بابل (Babylonia) کہتے تھے اور بخت نصر اُس وقت کا نمرود تھا‘ اس لیے کہ عراق کے بادشاہوں کو نمرود کہا جاتا تھا) تو جب یہ سزا آنے والی تھی اُس وقت بنی اسرائیل کے انبیاء یسعیاہ‘ یرمیاہ اور حزقیل (علیہم السلام) مسلسل اِنذار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ دیکھو درخت کی جڑ پر کلہاڑا رکھا جا چکا ہے! یہ بات غور طلب ہے کہ کلہاڑا تو گرتا ہے رکھا نہیں جاتا‘ لیکن آپ کے علم میں ہو گا کہ جلاد پہلے تلوار گردن پر رکھ کر معین کرتا ہے کہ اسے یہاں ضرب لگانی ہے‘ پھر وہ ضرب لگاتا ہے۔ اسی طرح کلہاڑے کو بھی پہلے لکڑی پر رکھا جاتا ہے کہ یہاں پر کلہاڑا مارنا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے انبیاء آگاہ کرتے رہے کہ اب تو ہوش میں آ جاؤ اور جاگ جاؤ۔ لیکن ع ”یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری!“ کے مصداق کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور انہیں عبرت ناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ حالی کے الفاظ ہیں:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارا ہے دور اور طوفاں بپا ہے
گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی!
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی!!

تواِس وقت یہی ہمارا حال ہے۔قرآن مجید میں بھی اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔سورۃ الاعراف میں ایک شخص بلعم بن باعوراء کا ذکر ہے:﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا﴾ ''(اے نبی ﷺ!) انہیں پڑھ کر سنایئے اس شخص کے حالات جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں''۔بعض لوگوں نے آیات کا ترجمہ ''علم'' کیا ہے' لیکن ایسا نہیں ہے۔آیات معجزوں کو بھی کہتے ہیں اور کرامات کو بھی کہتے ہیں۔اس لیے خرقِ عادت واقعہ نبیوں کے لیے معجزہ ہوتا ہے اور غیر نبی اور اولیاء اللہ کے لیے یہ کرامات ہوتی ہیں۔تو بنی اسرائیل میں کوئی صاحبِ کرامت بزرگ تھا جو بہت بڑا عالم بھی تھا اور زاہد بھی۔فرمایا جا رہا ہے ہم نے اسے اپنی آیات عطا کیں۔﴿فَانْسَلَخَ مِنْهَا﴾ ''تو وہ ان سے نکل بھاگا''۔اُس نے اپنے اس مقام کو چھوڑ دیا۔تورات میں اس کا ذکر آتا ہے کہ وہ ایک عورت کے چکر میں پھنس گیا اور پھر اُس کی ساری نیکی' سارا تقویٰ ختم ہو گیا ﴿فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ﴾ ''تو اب شیطان اس کے پیچھے لگ گیا''۔یہ بڑا اہم مقام ہے' پہلے انسان خود غلط حرکت کرتا ہے تب شیطان اس کے پیچھے لگتا ہے۔پہلا فیصلہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔﴿فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ(175)﴾ ''پھر وہ ہو گیا بہت ہی گمراہ لوگوں میں''۔﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا﴾ ''اور اگر ہم چاہتے تو اسے مزید بلندی عطا فرماتے'' ﴿وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ ''لیکن وہ تو زمین میں دھنستا چلا گیا'' ﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾ ''اور وہ اپنی خواہشات (حیوانی خواہشات) کی پیروی میں لگ گیا''۔﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ ''اس کی مثال کتے کی سی ہے' اس پر اگر تم بوجھ لاد دو گے تب بھی وہ ہانپے گا اور اگر اسے چھوڑ دو گے (کوئی چیز نہ لادو گے) تب بھی وہ ہانپے گا''۔اس کے اندر حرص اتنی زیادہ ہے کہ ہر وقت اس کی زبان باہر نکلی رہے گی اور رال ٹپکتی رہے گی۔اب آگے فرمایا:﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ ''یہی مثال اس قوم کی ہے جو ہماری آیات کو جھٹلا دے''۔﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ(176)﴾ ''آپ یہ واقعہ بیان کر دیجیے' شاید کہ یہ کچھ غور وفکر کریں''۔اگلی آیت میں فرمایا:﴿سَآءَ مَثَلَاْ ِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ(177)﴾ ''بہت ہی بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے''۔

قرآن حکیم کی یہ مثال پاکستان پر صادق آتی ہے۔ پاکستان اللہ کی جانب سے ایک معجزہ تھا اور یہ باکرامت ملک تھا۔ اب دیکھئے پاکستان کی کرامات کیا تھیں۔ پہلے نمبر پر یہ کہ اُمت کی تاریخ کے دوسرے ہزار سال کے آغاز سے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ مجددین عرب سے منتقل کر کے ہندوستان میں جاری کیا۔ مجددِ الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ یہیں کے مجدد ہیں' جن کے بارے میں اقبال نے کہا: ع''وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں! اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار''... ورنہ ہمہ اوستی تصور کے زیر اثر ہندوستان میں اسلام ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس لیے کہ ''دین الٰہی'' کی صورت میں اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جتنے اعاظم رجال ہندوستان میں پیدا ہوئے کہیں اور پیدا نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال جیسے مفکر' مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مصنف' مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ جیسے مبلغ کی ٹکر کا شخص پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ خلافت کی تحریک چلی تو صرف ہندوستان میں۔ حالانکہ خلافت تو پوری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ تھا' لیکن کسی اور ملک کے مسلمانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور یہاں ایسے زور سے چلی کہ مہاتما گاندھی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا اور۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!
ساتھ ہو تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

کی صداؤں سے پورا ہندوستان گونج گیا۔

چوتھی کرامت یہ ہے کہ یہاں آزادی کی تحریک چلی تو مذہب کی بنیاد پر چلی' ورنہ باقی پوری دنیا میں مقامی نیشنل ازم کی بنیاد پر تحریکیں چلیں۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں ملائی نیشنلزم اور عالمِ عرب میں عرب نیشنل ازم کی تحریک چلی ہے' اسلام کی نہیں۔ مصطفی کمال اتاترک نے ترک نیشنل ازم کی بنیاد پر ترکی کو بچایا' سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی لیکن کم سے کم ترکی بچ گیا' ورنہ ترکی کا نام ونشان مٹ جاتا، کیونکہ یورپ والوں میں انتقام کی آگ بھری ہوئی تھی کہ انہوں نے ہم پر 400 برس تک حکومت کی ہے۔ اس لیے کہ پورا مشرقی یورپ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھا۔

پانچویں کرامت یہ کہ پاکستان معجزانہ طور پر بنا ہے۔ اس لیے کہ گاندھی جیسے لیڈر' کانگریس جیسی جماعت اور ہندوؤں کی اکثریت کے علی الرغم پاکستان بن گیا۔ ہندو مسلمانوں سے زیادہ مالدار اور تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے مضبوط طبقات کانگریس کے ساتھ تھے۔ جمعیت علمائے ہند بہت بڑی طاقت تھی۔ پنجاب میں احرار بہت بڑی طاقت تھے۔

سرحد میں سرخ پوش اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان بڑی طاقت تھے اور یہ سب کانگریس کے ساتھ تھے۔ گاندھی نے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے صرف چند ہفتے پہلے کہا تھا کہ ''پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے''۔لیکن پاکستان بن گیا۔ حالانکہ قائداعظم ایک سال پہلے کم ازکم دس سال کے لیے علیحدہ اور آزاد پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے اور انہوں نے کیبنٹ مشن پلان قبول کرلیا تھا جس کی رو سے ہندوستان تین زونوں پر مشتمل ہوتا اور مرکزی حکومت ایک ہوتی۔

ان سب کے علاوہ ایک بڑی کرامت یہ ہے کہ پاکستان 27 رمضان المبارک کولیلۃ القدر میں گویا ''نازل'' ہوا ہے۔ اور ان سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصے کے بعد یہاں قراردادِ مقاصد پاس ہوگئی اور اس میں یہ اعلان ہوگیا کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ یہ گویا سیکولرزم کے خلاف بغاوت تھی کہ ہمارا حاکم اللہ ہے اور ہم اپنے اختیارات کو کتاب وسُنّت کی حدود کے اندر اندر استعمال کریں گے۔ ان ساری کرامات کے ہوتے ہوئے بھی ہم سیکولرزم کی طرف چلے گئے اور آج تک چلے جا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ کے مصداق عالم انسانی کا سب سے بڑا شیطان (یہودی) ہمارے پیچھے لگ گیا۔ قراردادِ مقاصد کے مصنف لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا جس کی جرأت اور مردانگی کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے دورۂ امریکہ کے دوران یہودیوں نے ایک بڑے استقبالیہ میں ان سے کہا کہ اگر آپ اسرائیل کو تسلیم کرلیں تو ہم آپ کو یہ یہ مراعات دیں گے تو انہوں نے جواباً کہا: Gentlemen, our souls are not for sale۔ یعنی ''حضرات! ہماری روحیں بکاؤ مال نہیں ہیں'' اور ان کو اس کا مزہ انہوں نے یہ چکھایا کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔ تو اب شیطان پیچھے لگ گیا۔ 1956ء کے دستور میں کچھ اسلام آنے لگا تھا تو ایوب خان کو بالا کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا گیا کہ 56ء کا دستور بھی ختم کرو اور اس دستور ساز اسمبلی کو بھی ختم کردو' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ سب یہودیوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ آیاتِ الٰہی سے ہمارا نکل بھاگنا تھا جس کی وجہ سے شیطان ہمارے پیچھے لگ گیا اور آج ہم اس جگہ پر آ گئے ہیں کہ پاکستان شاید نسیاً منسیا ہو جائے' یعنی بالکل ختم ہو جائے اور اس کا وجود تک نہ رہے۔ ؏ ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔ یا پھر یہ کہ بھارت کا تابع مہمل بن کر رہ جائے اور سر جھکا کر رہے۔

دوسرا خارجی اور فوری سبب

میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک اصل' بنیادی' داخلی اور خود کردہ سبب ہے' جبکہ دوسرا خارجی اور فوری ہے' جو باہر سے آیا ہے اور یہ فوری سبب ہے۔ اس کے پیچھے اصل قوت یہود اور اسرائیل کی ہے جو پاکستان کا خاتمہ چاہتے ہیں یا کم ازکم یہ کہ اس کا ایٹمی اثاثہ ختم کر دیں' چاہے عسکری حملہ کر کے یا کسی اور ذریعے سے' تاکہ اس کے ایٹمی دانت توڑ کر اسے ہندوستان کے سامنے ڈال دیا جائے اور یہ اس کا تابع مہمل

بن جائے۔ جان لیجئے اس وقت یہودیوں کو خطرہ صرف پاکستان سے ہے۔ میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد' جس میں اسرائیل کو بڑی فتح حاصل ہوئی تھی' یہودیوں نے پیرس میں ایک جشن منایا اور اس میں بن گوریان نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں کسی عرب ملک سے کوئی خطرہ نہیں ہے' ہمیں خطرہ ہے تو صرف پاکستان سے ہے۔ اور یہ بات 1967ء کی ہے جبکہ ابھی پاکستان ایٹمی طاقت نہیں تھا' اس کے باوجود انہیں پتا تھا کہ یہاں کچھ ایسے جذبات ہیں جن کی بنا پر امکان موجود ہے کہ یہاں اسلام ایک سماجی' سیاسی اور معاشی نظام کی حیثیت سے سامنے آ جائے۔ اور بن گوریان ہی وہ شخص ہے جس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

The Golden Era of our Diaspora was Muslim Spain.

کہ ہمارے عہدِ انتشار (جس میں ہمیں فلسطین سے نکال دیا گیا تھا) کا بہترین دَور مسلم سپین کا دور تھا۔ سپین کی فتح میں یہودیوں نے طارق بن زیاد کی مدد کی تھی' اس لیے کہ عیسائی یہودیوں پر سخت ظلم ڈھاتے تھے۔ لہٰذا طارق بن زیاد اور بعد کے مسلمان حکمران یہودیوں کی بہت قدر کرتے تھے اور انہیں وہاں بڑا عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ انہیں خوب اندازہ ہے کہ ان کے خلاف کہاں سے طاقت آئے گی۔ جان لیجئے کہ یہودی انبیاء کی پیشین گوئیوں کو خوب جانتے ہیں۔ حضور ﷺ کی احادیث میں جو پیشین گوئیاں ہیں انہیں ان سے بھی پوری آگاہی ہے۔

امریکہ میں 11 ستمبر کا واقعہ اسرائیل کی ''موساد'' نے ہی امریکہ میں بہت اعلیٰ مناصب پر فائز یہودیوں کے تعاون سے کرایا جو وہاں کی انتظامیہ کے اندر گھسے ہوئے ہیں' ورنہ یہ ناممکن تھا۔ امریکہ کے حکمرانوں میں سے ایک بہت بڑے ذمہ دار شخص نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسامہ کے پاس کوئی ایسا ساز وسامان نہیں ہے کہ وہ 11 ستمبر والا واقعہ کر سکے۔ یہ بات اُس وقت میں نے بھی کہی تھی کہ ایسی مہم جوئی اسامہ کے لیے ممکن نہیں۔ اب تو اس پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں' لیکن وہ ان چیزوں کو منظر عام پر نہیں آنے دیتے۔ اس فیصلے کے اندر امریکی حکومت کے لوگ موساد کے ساتھ شامل تھے۔ جہاز نے جیسے ہی ٹیک آف کیا تھا ایک گیس چھوڑ دی گئی تھی جس سے پائلٹ اور مسافر سب ہلاک ہو گئے اور اس جہاز کے اندر ایک کمپیوٹرائزڈ پروگرام پہلے ہی رکھا جا چکا تھا کہ جیسے ہی پائلٹ ختم ہو وہ کمپیوٹر جہاز کا پورا نظام کنٹرول کرے گا اور اس میں سارا پروگرام کہ جہاز کو کہاں جانا ہے اور کہاں ٹکرانا ہے پہلے سے feed کر دیا گیا تھا۔ بہرحال یہ 11 ستمبر کا سانحہ یہودیوں کا کیا ہوا ہے' لیکن طاقتور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کا رخ فوراً ''القاعدہ'' کی طرف پھیر دیا گیا۔ اور میں نے تو ''القاعدہ'' کا لفظ پہلی بار صدر بش کی زبان سے ہی سنا تھا' ورنہ میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ کون سی تنظیم ہے اور اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے۔

جب 11 ستمبر کا حادثہ پیش آ گیا تو صدر مشرف ایک ہی ٹیلی فون پر بتاشے کی طرح بیٹھ گئے اور ''یوٹرن'' لے لیا۔ گویا ع ''دھمکی میں مر گیا' جو نہ بابِ نبرد تھا!'' اس حادثے کے پانچ دن بعد 16 ستمبر 2001ء کو انہوں

نے علماء ومشائخ کا ایک اجلاس بلایا اور اس میں مجھے بھی دعوت دی گئی' حالانکہ میں نہ تو سکہ بند علماء میں سے ہوں اور نہ مشائخ میں سے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کو میرے ذریعے سے کچھ کہلوانا تھا جس کی ایک شکل پیدا کر دی گئی۔ دراصل صدر صاحب نے ان لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے بلایا تھا جو رائے عامہ ہموار کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ صدر صاحب کی تقریر کے بعد سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ایک حق بات تو سب نے کہی کہ جناب ابھی تک اسامہ اور طالبان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے اور ثبوتِ جرم کے بغیر سزا دینا عدل وانصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔ لیکن اکثر حضرات نے یہ باتیں ذرا دبی زبان میں کہیں' جبکہ کچھ لوگوں نے تو بڑا چاپلوسانہ انداز اختیار کیا' جس سے مجھے غصہ آنا شروع ہوگیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا "دیکھئے صدر صاحب! اگر آپ نے اِس وقت طالبان کے خلاف امریکہ کا آلہ کار بننا پسند کیا تو تین باتیں نوٹ کر لیجئے! اوّلاً یہ عدل وانصاف کے مسلمہ اصولوں سے بغاوت ہوگی' اس لیے کہ ابھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ کہ یہ غیرت اور حمیت کے خلاف ہوگا۔ ہم نے طالبان حکومت کی حمایت کی۔ پاکستان نے طالبان کو بے نظیر کے دورِ حکومت میں وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کے ذریعے سے سپانسر کیا اور خود امریکہ اسے سپانسر کرنے والوں میں شامل ہے' اور ہم نے طالبان حکومت کو تسلیم بھی کیا ہے اور اسلام آباد میں آج بھی اس کا سفارت خانہ موجود ہے' ان کے سفیر ملا ضعیف موجود ہیں۔ بس صرف ایک دھمکی پر آپ ان سے پیٹھ پھیر لیں یہ سراسر غیرت وحمیت کے منافی ہے۔ آخر غیرت بھی کسی شے کا نام ہے۔

غیرت ہے عجب چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا!

لیکن ہمارا حال بحیثیت مجموعی یہ ہو گیا ہے کہ اب کوئی غیرت وحمیت باقی نہیں رہی۔ ع "حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے"۔ اور تیسری بات میں نے یہ کہی کہ یہ اللہ اور اُس کے دین اسلام کے خلاف بغاوت ہو گی۔ اس لیے کہ ایک مسلمان ملک کے خلاف ایک غیر مسلم کی مدد کرنا اسلام سے بغاوت ہے۔"

صدر صاحب نے اپنی تقریر میں تین مصلحتیں بیان کی تھیں کہ "امریکہ کا ساتھ دینے سے (i) ہمارا کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا' امریکہ اسے حل کرا دے گا۔ (ii) ہمارا ایٹمی اثاثہ محفوظ رہے گا۔ (iii) ہم اس وقت کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوں گے"۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ تینوں باتیں ٹھیک ہیں' لیکن یہ عارضی ہیں۔ بہت جلد آپ کی باری بھی آ کر رہے گی۔ اس لیے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے اصل سازش اسرائیل کی ہے' امریکہ کی نہیں ہے اور اسرائیل کا سب سے بڑا ہدف پاکستان ہے۔ اسرائیلیوں کو توقع یہ تھی کہ امریکہ ایک دم افغانستان اور اس کے حمایتی پاکستان پر جھپٹے گا' لہٰذا آپ کی باری تو آ کر رہے گی' یہ نہ سمجھئے کہ آپ بچ جائیں گے۔

اب مجھے قطعاً خوشی نہیں ہے کہ میری پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ مجھے افسوس ہے' لیکن مجھے بھی یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ وہ تمام مصلحتیں ایک

ایک کر کے دامن چھڑاتی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے مسئلہ کشمیر کو لیجئے! اوّلاً یہ کہ بھارت کے مقابلے میں ہمیشہ سے ہمارا موقف یہ رہا ہے کہ پہلے کشمیر پر بات ہوگی پھر کسی اور مسئلے پر! اور یہ بات بہت عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن اب ہم اس سطح پر آ گئے ہیں کہ باقی ساری باتیں ہو رہی ہیں مگر کشمیر کے مسئلہ پر بحث و مذاکرہ کہیں آس پاس بھی نہیں ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ بھی کہہ رہے ہیں یہ کوئی ایک دو دن یا دو چار مہینوں میں حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے۔ کشمیر پر بات کرنے سے قبل بھارت جو Full Normalization چاہتا تھا آج ہم نے اُس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ جس جہاد کو ہم چودہ سال سے سپانسر کر رہے تھے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دے رہے تھے اس سے بھی ہم نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کا ردّعمل کشمیریوں میں یہ ہوا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان نے ہم سے دھوکہ کیا ہے، اس نے ہم کو مروایا ہے۔ میں جہاد کے نام پر کشمیر میں خفیہ مداخلت کا ہمیشہ سے مخالف تھا' اب میں بڑی تلخ بات کہہ رہا ہوں کہ پاکستان نے کشمیریوں سے 1965ء کا بدلہ لیا ہے۔ پاکستان نے 1965ء میں اپنے بہترین کمانڈوز کو اس توقع پر کشمیر میں داخل کر دیا تھا کہ کشمیری مسلمان مدد کریں گے' لیکن کشمیریوں نے کوئی حمایت نہیں کی اور وہ تقریباً سارے کے سارے شہید ہو گئے۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ بھارت پلٹ کر لاہور پر حملہ آور ہو گیا اور ہماری ساری کوشش ناکام ہو گئی۔ کشمیریوں کے جہادِ حریت میں اگرچہ پاکستان سے بھی بہت سوں نے وہاں جا کر جانیں دی ہیں' لیکن مصائب کا اصل پہاڑ تو کشمیریوں پر ٹوٹتا رہا ہے' عصمت دری تو ان کی عورتوں اور بیٹیوں کی ہوئی ہے' انہی کے گھروں کو مسمار کیا گیا ہے' انہی کی آبادیاں تھیں جو تھوک کے حساب سے جلا دی گئیں اور انہی کی دکانیں ختم ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک پاکستان نے کشمیریوں سے گویا 1965ء کا بدلہ لیا ہے جبکہ انہوں نے پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی۔

دوسرے یہ کہ اس وقت ایٹمی پروگرام کی بھی جو صورت بن چکی ہے نہایت مخدوش ہے۔ ہمارے خلاف بھرپور مقدمہ تیار ہو چکا ہے کہ دنیا میں جو بھی ایٹمی پھیلاؤ ہوا ہے پاکستان اس کا مرکز ہے۔ اور ہم نے اپنے ٹیلی ویژن پر اپنے سب سے بڑے ایٹمی سائنس دان سے اقرار کروا کر یہ الزام تسلیم بھی کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایران اور لیبیا نے بھی ہمارے خلاف چغلی کھائی ہے۔ تو اب ہمارے خلاف مقدمہ تیار ہے۔ اور ان کے پاس اس وقت سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پاکستان میں اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ مولوی برسرِاقتدار آ جائیں۔ متحدہ مجلس عمل کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور بڑی بڑی داڑھیوں اور پگڑیوں والے حضرات کی معتدبہ تعداد پاکستان کی پارلیمنٹ میں پہنچ چکی ہے' جبکہ اس سے پہلے صرف دو تین ہوا کرتے تھے' تو اس سے انہیں خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کسی مرحلے پر بھی حکومت غیر مستحکم ہو کر ان کے پاس جا سکتی ہے۔ مشرف کو مارنے کی دو مرتبہ نہیں کئی مرتبہ کوشش کی جا چکی ہے' لہٰذا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ ایٹمی ہتھیار بنیاد پرستوں (ان کے بقول دہشت گردوں) کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ اپنا ایٹمی پروگرام یا تو ہمارے حوالے کر دو یا ہمارا کنٹرول قبول کرو'

تا کہ ہم کسی بھی وقت آ کر معائنہ کر سکیں کہ تم کوئی قابل اعتراض حرکت تو نہیں کر رہے ہو۔ اور اب یہ مطالبہ آئے گا کہ اس کو رول بیک کرو' کیپ کرو' ورنہ تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو افغانستان و عراق کا ہو چکا ہے۔

خود مشرف صاحب نے حالیہ علماء کنونشن میں کہا ہے کہ پاکستان پر حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی ایک بات کی میں ہمیشہ تعریف کرتا رہا ہوں کہ یہ صاف گو انسان ہیں منافق نہیں ہیں' جو اُن کے دل میں ہوتا ہے کھل کر کہہ دیتے ہیں' البتہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں سے واقف نہیں ہیں' وہ پاکستان کی وجہ جواز کو نہیں جانتے' لیکن پاکستان سے مخلص ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ مستحکم رہے۔ اور اس اعتبار سے وہ صاف گو ہیں۔ لہٰذا انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم پر حملہ ہو سکتا ہے' یہ نہ سمجھو کہ یہ کوئی بہت ہی بعید بات ہے۔ البتہ اب انہوں نے ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں جو یہ بات کہی ہے کہ ہم جان دے کر بھی ان کی حفاظت کریں گے' میں نے اس پر جمعۃ المبارک کے خطبے میں انہیں مبارک باد دی اور میں نے دعا بھی کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور پوری فوج کو استقامت عطا کرے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا معروضی حقائق بدل گئے ہیں؟ ہمارے دانشور اور کالم نویس یہ کہتے رہے ہیں کہ احمق لوگ ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ ہمیں ڈٹ جانا چاہیے تھا' جو زمینی حقائق سے واقف ہی نہیں ہیں۔ زمینی حقائق تو اب پہلے سے زیادہ خوفناک ہیں۔ یہ بھی مشرف صاحب کی ہمت ہے کہ اگرچہ خود اُن کا مقصد پورا کر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہوں نے امریکی افواج کو پاکستانی علاقے میں آپریشن کرنے کی اجازت نہیں دی' حالانکہ ان پر شدید دباؤ ہے۔ ایک بڑا امریکی اہلکار تو کہہ کر بھی گیا ہے کہ مشرف ابھی نہیں مانتے' لیکن مسکرا کر کہا کہ ''مان جائیں گے''۔ اس مسکراہٹ میں یہ پیغام مضمر تھا کہ ہم نے ذوالفقار علی بھٹو کو دھمکی دی تھی اور پوری کر کے دکھا دی تھی' لیاقت علی خان نے ہمارے نظام کو چیلنج کرنا چاہا تھا تو اس کا انجام تم خوب جانتے ہو۔ شاہ فیصل شہید نے ہمارے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا تھا' اُن کا حشر بھی تمہیں یاد ہے! تو ذرا ایک اور دھمکی دیں گے۔ ایک دھمکی میں اس نے پہلے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا تھا تو دوسری دھمکی میں یہ بات بھی مان جائے گا۔ ؎ ''دھمکی میں مر گیا' جو نہ بابِ نبرد تھا!'' ... اللہ کرے ایسا نہ ہو' اللہ کرے کہ وہ ثابت قدم رہیں ... لیکن کیا آپ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ زمینی حقائق کو دیکھئے تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی' ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں۔

البتہ نجات کی ایک راہ ابھی کھلی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ط﴾ (الزخرف:84)

''اللہ وہ ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے (معبود ہے' حاکم ہے) اور زمین میں بھی الٰہ ہے۔''

ایسا نہیں کہ زمین کا خدا کوئی اور ہے اور آسمان کا خدا کوئی اور۔ لیکن اِس وقت امریکہ دعوے دار ہے کہ زمین کا خدا میں ہوں۔ گویا یہ دنیا میں نائب دجال کی حیثیت میں آ گیا ہے۔ جیسے امام خمینی نے کہا تھا کہ امام مہدی تو جب آئیں گے آئیں گے' کوئی نائب مہدی بھی کھڑا ہو اور کام کرے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو نائب

امام قرار دیا۔ تو یہ دجال کا نائب ہے جو پوری زمین پر قبضہ کرنے کے ارادے سے سامنے آ گیا ہے۔ لہٰذا چونکہ اللہ ہی آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی تو اس کی مدد کو پکارو' وہ مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ غیر مرئی ذریعوں سے تمہاری مدد ہوگی' فرشتے تمہاری مدد کو آئیں گے' اللہ تعالیٰ معجزے دکھا کر بھی تمہیں بچائے گا' بشرطیکہ ثابت قدم رہو۔ لیکن اللہ کی امداد کے حصول کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور اس کا نام ہے ''توبہ'' کہ پلٹو اللہ کی طرف! تم نے پاکستان کی منزل بھلا دی تھی' اُسے دوبارہ یاد کرو۔ پاکستان کے مقصد کو پورا نہیں کیا تھا، اب اس کا کم سے کم آغاز کر دو! مجھے امید ہے کہ محض آغاز پر بھی اللہ کی رحمت ہمارے شاملِ حال ہو جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام ایک دم نافذ کر دو' پوری شریعت ایک دم نافذ کر دو' میں بھی مانتا ہوں کہ یہ ایک دم ہونے والی بات نہیں ہے۔ لیکن ایک عزمِ صادق کے ساتھ آغاز تو کرو۔

اللہ تعالیٰ توبہ کو reciprocate کرتا ہے۔ یعنی اللہ اور بندے کے مابین توبہ کا معاملہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ بندے بھی تواب بھی ہوتے ہیں اللہ بھی تواب ہے۔ بندے اس کی طرف پلٹتے ہیں تو اللہ بھی پلٹتا ہے۔ بندے اپنے گناہ اور عصیان کی وجہ سے اللہ سے رخ موڑ لیتے ہیں تو اللہ بھی ان کی جانب سے رُخ موڑ لیتا ہے۔ بندے اللہ کی طرف دوبارہ متوجہ ہو جائیں تو اللہ بھی اپنی رحمت کے ساتھ دوبارہ متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی شان کیا ہے؟ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے:

((اِنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَاِنْ اَتَانِي يَمْشِي اَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً)) (متفق علیہ)

''میرا بندہ اگر میری طرف بالشت بھر آئے مَیں ہاتھ بھر آؤں گا' اگر وہ ہاتھ بھر آئے تو میں بازو بھر آؤں گا اور اگر وہ چل کر آئے تو میں دوڑ کر آؤں گا۔''

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوطرفہ معاملہ۔

حکومت کی سطح پر توبہ

اب حکومت کی سطح پر توبہ کا آغاز کیا ہے؟ پاکستان کے دستور میں قراردادِ مقاصد پہلے ایک دیباچے کی شکل میں تھی اور اب وہ دفعہ 2۔الف کی حیثیت سے دستور کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر ایک موقع پر دفعہ 227 آئی تھی جس کے الفاظ ہیں:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and Sunnah."

یعنی ''پاکستان میں قرآن و سُنّت کے خلاف نہ کوئی قانون نافذ رہے گا نہ مزید بنے گا۔''

گویا موجودہ (existing) قوانین بھی اگر خلافِ شریعت ہیں تو انہیں ختم کیا جائے گا اور مزید قانون سازی بھی قرآن و سُنّت کے خلاف نہیں کی جائے گی، لیکن ایک چور دروازہ ایسا کھلا ہوا ہے کہ دونوں آرٹیکل غیر مؤثر (defunct) ہیں۔ قراردادِ مقاصد کو ہمارے جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب نے یہ کہہ کر ردّ کر دیا کہ یہ بھی باقی

دفعات کی طرح دستور کی بس ایک دفعہ ہے' دستور کی باقی دفعات کے اوپر حاکم تو نہیں ہے۔لہٰذا یا تو اس کے ساتھ اضافہ کیا جائے کہ:

Not withstanding anything against it.

یعنی قراردادِ مقاصد (دفعہ 2۔الف) پورے دستور پر حاوی رہے گی۔لیکن ایسا نہیں کیا گیا' بلکہ ایک مزید چور دروازہ فراہم کر دیا گیا کہ دفعہ 227 کو اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ نتھی کر دیا کہ وہ جن قوانین کو خلافِ شریعت سمجھے گی اُن پر مسلسل غور کرتی رہے گی اور مسلسل رپورٹیں پیش کرتی رہے گی۔لیکن اس سے آگے کچھ صراحت نہیں کہ ان رپورٹوں کا حشر کیا ہوگا۔اس کونسل پر مسلمانوں کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے' کیونکہ پاکستانی خزانہ مسلمانوں کا ہی ہے۔اس کونسل نے جتنی سفارشات بھی پیش کیں ان میں سے آج تک ایک کی بھی تنفیذ (implementation) نہیں کی گئی'ان سفارشات اور رپورٹوں کے مسودات سے وزارتِ قانون' وزارت داخلہ' وزارتِ مذہبی امور اور وزارتِ مالیات کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔تو پہلا کام یہ ہو جانا چاہیے کہ دستور میں موجود اِس چور دروازے کو بند کر دیا جائے' تاکہ اصلاح کا مرحلہ شروع ہو جائے۔

ضیاء الحق صاحب نے فیڈرل شریعت کورٹ کے نام سے ایک بہترین ادارہ قائم کیا تھا کہ کسی قانون کے خلافِ شریعت ہونے کے بارے میں عدالت فیصلہ کرے گی۔اس صورت میں ہر شخص عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے کہ فلاں قانون اسلام کے خلاف ہے' اسے ختم کرو۔اب اگر شریعت کورٹ اسے کتاب وسُنّت کے منافی قرار دے دیتی ہے تو اسے اختیار ہوگا کہ وہ اسے ختم کر دے۔البتہ اگر وہ قانون مرکزی حکومت سے متعلق ہوگا تو اسے مہلت دے گی کہ اتنے مہینوں کے اندر اندر اس قانون کا کوئی بدل بنا لو، ورنہ فلاں تاریخ سے یہ دفعہ ساقط ہو جائے گی۔اسی طرح اگر وہ معاملہ صوبائی حکومت سے متعلق ہوگا تو یہ نوٹس صوبائی حکومت کو چلا جائے گا اور مہلتِ مدت گزرنے کے بعد وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔لیکن ضیاء الحق صاحب نے ساتھ ہی شریعت کورٹ کو دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دیں اور دو بیڑیاں بھی ڈال دیں' کہ دستورِ پاکستان اس کے دائرے سے خارج ہے' عائلی قوانین اس کے دائرہ کار سے خارج ہیں' کریمینل اور سول کوڈ بھی اس کے دائرے سے خارج ہیں اور مالی معاملات بھی دس سال کے لیے اس کے دائرے سے خارج ہیں۔دس سال کی مدت چونکہ ٹائم بم کی طرح تھی لہٰذا وہ پھٹ گئی اور ہماری شرعی عدالت نے بینک انٹرسٹ کو''ربا'' قرار دے کر حرام قرار دے دیا۔لیکن دس سال کے بعد اس کا جو حشر ہوا ہے وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔کم سے کم 15 سال کی مشقت اور محنت کو ایک فیصلے نے صفر کر دیا۔وفاقی شرعی عدالت کے ایک جج تقی عثمانی صاحب کو بھی نکال کر باہر پھینک دیا گیا کہ شریعت کے معاملے میں یہ ایک روڑا ہے جو چبایا نہیں جا سکے گا۔اس کے بعد دو جج اور لائے گئے' لیکن گمانِ غالب ہے کہ ان سے پہلے ہی وعدہ لے لیا گیا کہ تم بینک انٹرسٹ کو سود نہیں کہو گے' تب ان سے حلف اٹھوایا گیا (واللہ اعلم!)۔تو پہلے نمبر پر یہ ضروری ہے کہ دفعہ 227 کو قراردادِ مقاصد کے ساتھ نتھی کر دیا جائے' یعنی

2۔اے کے بعد 2۔بی کر دیا جائے' تاکہ معلوم ہو کہ قراردادِ مقاصد میں جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اس کی تنفیذ کا ذریعہ ہے۔ اور اسلامی نظریاتی کونسل (Council of Islamic Ideology) کو چاہے ختم کر دیا جائے چاہے اسے اپنے لیے سفارشات حاصل کرنے کے لیے باقی رکھا جائے' لیکن فیڈرل شریعت کورٹ کی یہ ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں کھول دی جائیں۔ اس لیے کہ اسلام مکمل نظامِ حیات ہے' اس کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔قرآن کریم میں اس طرزِ عمل پر شدید وعید وارد ہوئی ہے:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ﴾ (البقرۃ:85)

"کیا تم کتاب (اور سنت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو رد کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا اُس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور آخرت میں انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔"

کیونکہ اس طرح تو وہ منافق ہوئے! شریعتِ الٰہی کے ایک حصے کو ماننا اور ایک کو نہ ماننا منافقت ہے' اور منافقین کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء:145)

"یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔"

مزید برآں شریعت کورٹ کے ججوں کا سٹیٹس ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے برابر رکھا جائے۔ کسی جج کو معطل نہیں کیا جا سکتا' چاہے ہائی کورٹ کا جج ہو یا سپریم کورٹ کا' ایک دفعہ کوئی جج بن گیا ہے تو چاہے وہ حکامِ بالا کی پسند کے خلاف فیصلہ دے دے اسے نکالا نہیں جا سکتا' اس سے تقی عثمانی جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے فیصلوں کے ضمن میں ریویو کی گنجائش کشادہ رکھی جائے۔ پھر شریعت کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں اور مراعات بھی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے برابر کر دی جائیں۔ یہ کام اگر ہو جائے تو یوں سمجھئے حکومتی اور ریاستی سطح پر "توبہ" کا آغاز ہو جائے گا۔

ہم نے نواز شریف کے زمانے میں سُود کے خلاف ایک مہم چلائی تھی۔ میاں محمد شریف' نواز شریف' شہباز شریف اور عباس شریف چاروں "شرفاء" دو مرتبہ میرے پاس تشریف لائے اور پکا قول و قرار کر کے گئے کہ ہم سُود کو ختم کریں گے۔ میاں شریف صاحب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر سود کو ختم کرو۔ اگرچہ میں نے کہا تھا کہ ایک سال کی مہلت بھی ٹھیک ہے' لیکن انہوں نے کہا نہیں' ہمیں صرف چھ مہینے میں اسے ختم کرنا ہے۔ لیکن ختم کیا کرنا تھا' اس مسئلے کا تو بیڑا ہی غرق کروا دیا۔

عوام کی سطح پر توبہ

دوسری توبہ عوام کی سطح پر ہے۔ عوام انفرادی سطح پر توبہ کریں، حرام سے اجتناب اور حلال پر اکتفا کا فیصلہ کریں، فرائض کی ادائیگی کا فیصلہ کریں، بے حیائی، بے شرمی، فحاشی، عریانی سے بچیں اور اس مغربی تہذیب کو مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ مولانا ظفر علی خان کا بڑا پیارا شعر ہے:

تہذیبِ نو کے مُنہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اِس حرام زادی کا حلیہ بگاڑ دے!

آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو یہ سب کرنے کو تیار ہوں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے ہاں شرعی پردہ نافذ کریں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنی آمدنی کے اندر سے سود کو نکال باہر کریں؟ ... لیکن یہ سب کرنا ہوگا۔ یہ انفرادی توبہ کریں گے تو اللہ سے دعا کرنے کا مُنہ بھی ہوگا کہ اے اللہ! میں توبہ کرتا ہوں، اے اللہ! اس توبہ کو قبول فرما! اے اللہ! میں درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں مہلت دے۔ میرے نزدیک ہمارے پاس اس وقت زیادہ سے زیادہ دو یا اڑھائی سال کی مہلت ہے، فیصلے کی آخری گھڑی آ چکی ہے، درخت کی جڑ پر کلہاڑا رکھا جا چکا ہے۔ ہمارے خاتمے کی اُلٹی گنتی شروع کی جا چکی ہے۔ لیکن ابھی ایک راستہ کھلا ہے، ابھی مہلت ہے، لیکن یہ مہلت توبہ کے بغیر سودمند نہیں ہوگی۔

مزید یہ کہ اس ملک کے عوام اپنے آپ کو اقتصادی پابندیوں (sanctions) کے لیے تیار کریں۔ مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ امریکہ پاکستان پر براہِ راست حملہ کرنے کی جرأت کرے۔ اس لیے کہ امریکہ کی تو فوج خود ہی حکومت کو جواب دے چکی ہے کہ ہمارا معاملہ بہت زیادہ out-stretched ہو گیا ہے اور اب ہم فوری طور پر کسی اور ملک میں فوجی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ امریکہ کو جو اپنے اوپر زعم تھا کہ "We can do it alone!" وہ سب خاک میں مل گیا ہے۔ اب امریکہ دوسرے ملکوں سے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا ہے کہ خدا کے لیے ہمارا ساتھ دو! تم افغانستان میں ہماری مدد کو آ گئے تھے تو اَب عراق میں بھی آ جاؤ۔ اب وہ گویا اپنا تھوکا ہوا چاٹ رہا ہے۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری ایٹمی صلاحیت کو نقصان پہنچائے، اور مشرف نے بھی یہ کہا ہے، کیونکہ اب ان کے علم میں آ چکا ہے کہ یہ ایٹمی ٹیکنالوجی کہاں ہے، ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں وہ جانتے ہیں۔ تو اگر کچھ میزائل صحیح نشانے پر پڑ گئے تو سب ختم ہو جائے گا۔ تقریباً تیس سال پہلے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو اسرائیلی جہازوں نے بمباری کر کے تہس نہس کر دیا تھا۔ اُس کی پشت پر اُس وقت سعودی عرب بھی تھا۔ چنانچہ اسرائیلی جہازوں کو مزید پٹرول سعودی عرب کی فضا میں فراہم کیا گیا تھا۔ بہرحال امریکہ اور اقوامِ متحدہ ہم پر پابندیاں لگائیں گے۔ سختی آئے گی، غربت آئے گی اور فاقے بھی آ سکتے ہیں، لیکن کوئی قوم ان سختیوں سے گزر کر ہی دنیا میں سر اونچا کر کے رہ سکتی ہے، ورنہ ہمیں بھارت کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔

اس ضمن میں خاص طور پر ایک نکتہ اور جان لیجیے کہ بھارت کی طرف سے پچھلے دو تین سالوں سے جو باتیں

سننے کو مل رہی ہیں اس سے قبل کے پچاس سالوں میں وہ باتیں کبھی سننے میں نہیں آئیں۔ کیا کبھی کسی نے کہا تھا کہ یہ لکیر (باؤنڈری) اٹھا دینی چاہیے؟ یا کسی نے کہا تھا کہ کنفیڈریشن بن جانی چاہیے؟ لیکن اب ان کے حوصلے بڑھ رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان اب بین الاقوامی حالات کے شکنجے میں آ چکا ہے' پاکستان کے خاتمے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا اُن کا اب آخری ہتھیار آ رہا ہے کہ دشمن کو گڑ دے کر مارو۔ اب وہ محبت کے راگ الاپ رہے ہیں کہ ہم تو ایک تھے' ہمیں تو انگریزوں نے لڑوایا تھا' لہٰذا ہمیں پھر سے ایک ہو جانا چاہیے۔ مشرقی پنجاب کا سکھ وزیر اعلیٰ یہاں آ کر یہ کہہ گیا ہے کہ پاکستانی پنجاب کو بھارتی پنجاب سے مل جانا چاہیے' ہماری بولی ایک ہی ہے' صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ پاکستان اس پنجاب سے دستبردار ہو جائے اور اسے اپنے ملک سے کاٹ کر اور مشرقی پنجاب سے جوڑ کر ایک ملک بنا دے۔ سوچیے یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ سونیا گاندھی نے صاف کہا تھا ہم پاکستان کو تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے تو فتح کر ہی چکے ہیں۔ کراچی میں ویڈیوز کی دکانیں جا کر دیکھ لیں' وہ انڈین فلموں کی ویڈیوز سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ ان کی ثقافتی فتح ہے۔ اب صحافیوں کے طائفے آ رہے ہیں' پارلیمنٹ کے ممبران کے طائفے اور وفود آ رہے ہیں' دانشور چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب محبت کا راگ الاپتے ہوئے آ رہے ہیں۔

ہم مانتے ہیں محبت بڑی اچھی چیز ہے اور محبت کا جواب محبت سے دیا جانا چاہیے' لیکن بحالاتِ موجودہ یہ محبت ہمارے لیے خودکشی کا ذریعہ ہے۔ ہماری مثبت بنیاد اور وجہ جواز تو پہلے ختم ہو چکی ہے' ایک دوسری منفی بنیاد ہندو کا خوف تھی' اگر وہ بھی ختم ہو جائے تو پھر پاکستان کی بقا کے لیے تو کوئی بنیاد بھی باقی نہیں رہے گی! اسے تو پھر بھارت ہضم کر لے جائے گا۔ بھارت بہت بڑا ملک ہے' اس کے وسائل بہت زیادہ ہیں' اگرچہ اس کے مسائل بھی ہم سے دس گنا زیادہ ہیں' لیکن اُس نے ایک ایسا دستوری نظام بنایا ہوا ہے کہ وہاں آج تک مارشل لا نہیں لگا۔ ایک سال کے لیے ایمرجنسی لگی تھی اور وہ بھی دستور کے اندر تھی۔ ہندوستان میں آج تک کوئی ایک قدم بھی بالائے دستور نہیں اٹھایا گیا۔ تو اُس کا دستوری نظام بہت مستحکم ہے۔ انہوں نے پہلے دن سے ہی جاگیرداری ختم کر دی تھی' چنانچہ وہاں کی سیاست عوام کے ہاتھ میں ہے' وہاں کوئی جاگیردار نہیں ہے۔ انہوں نے ریاستیں ختم کیں اور جاگیردار ختم کیے۔ اب وہاں عوام کی طاقت ہے۔ اس حوالے سے اِس وقت پاکستان کے لیے ہندوستان کی محبت کے نغمے "kiss of death" یا "embrace of death" کے مترادف ہیں۔

ہندوؤں کے بارے میں مشہور ہے (معلوم نہیں وہ مائیتھالوجی ہے یا حقیقت) کہ وہ یہودیوں کی طرح اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے خوبصورت عورتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ خوبصورت دوشیزاؤں کو سنکھیا دیتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس کی مقدار کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کے اندر مزاحمت کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زہر اُن کے لیے مہلک نہیں رہتا' لیکن اس طرح اُن کا خون زہر کا بہتا ہوا دریا بن جاتا ہے۔ تو جو بھی ان دوشیزاؤں سے اختلاط کرتا ہے زہر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ ان

دوشیزاؤں کو وہ ''وِش کنیائیں'' کہتے ہیں' یعنی زہریلی دوشیزائیں۔ یہودی بھی مسلمان نوجوانوں کو خوبصورت جوان لڑکیاں پیش کر کے انہیں ان کے دامِ محبت میں گرفتار کر لیتے ہیں اور ان کے ذریعے سے اپنے مقاصد پورے کرتے ہیں۔ شاہ فیصل کو شہید کرنے والا ان کا اپنا بھتیجا تھا جو ایک یہودی لڑکی کے دامِ محبت میں گرفتار تھا اور وہ یہودی لڑکی اس کے سر پر سوار تھی۔ میں نے اس کا فوٹو دیکھا ہے کہ وہ لڑکی اس کے کندھے پر سوار ہے۔ چنانچہ اس وقت بھارت کی محبت کا معاملہ پاکستان کے حق میں انتہائی خطرناک ہے۔ ہاں اگر ہم نے یہاں اسلام نافذ کیا ہوتا تو محبت کے علمبردار سب سے بڑھ کر ہم ہوتے اور ہم ایک پیغامِ ہدایت لے کر ان کے پاس جاتے۔ اور سلامتی و اسلام کا پیغام لے کر جانے والے مخلص ہونے چاہئیں' لوگوں کے ہمدرد اور ان سے محبت کرنے والے ہونے چاہئیں کہ وہ ہم سے نفرت کریں اور ہم محبت کریں' وہ پتھر ماریں اور ہم پھول پیش کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی رویہ تھا۔ اگر ہم نے پاکستان کی تعمیر اس کی نظریاتی بنیادوں پر کی ہوتی تو محبت کے پیغام بر بن کر ہم جاتے' لیکن اب جبکہ ہماری کوئی بنیاد ہی نہیں ہے' تو وہ محبت تو ہمیں کھینچ کر لے جائے گی۔

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا' توبہ کے ذریعے سے نجات کی راہ کھلی ہے۔ لہٰذا حکومت کی سطح پر توبہ کا آغاز ہو جائے اور انفرادی سطح پر توبہ کی جائے اور اللہ کی رحمت کو پکارا جائے۔ اگر یہ ہو جائے تو ہمیں بھی مہلت مل جائے گی' جیسے قومِ یونس کو عذابِ استیصال کے بادل چھا جانے کے باوجود مہلت دے دی گئی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ انبیاء و رسل کی تاریخ میں ایک استثناء ہے۔ سورۃ یونس کی آیت 98 میں فرمایا گیا: ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ﴾ ''کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی جو ایمان لے آتی تو اُسے اس کا ایمان نفع دیتا؟'' مراد یہ ہے کہ جب اللہ کے عذاب کے آثار شروع ہو جائیں تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے' پھر توبہ کام نہیں آتی' بلکہ عذابِ الٰہی آ کر رہتا ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ﴾ ''سوائے قوم یونس کے''۔ یہ مہلت قومِ نوحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ صالحؑ وغیرہم کو نہیں ملی' صرف قومِ یونسؑ کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے کفر اور عناد سے مشتعل ہو کر قبل از وقت قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے' جبکہ ابھی اللہ کی اجازت نہیں آئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد جب عذابِ الٰہی کے آثار شروع ہوئے تو قوم سمجھ گئی کہ یونس علیہ السلام جو کہتے تھے ٹھیک کہتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی آبادی سے نکل کر جنگل میں جمع ہو گئے اور چیخ چیخ کر اللہ سے توبہ کی کہ اے اللہ! ہم تیرے نبی یونس علیہ السلام کے راستے پر واپس پلٹ آئے ہیں' ہمیں ایک مہلت دے دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ ﴿لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (98) ''جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کے اندر عذابِ رسوائی کو اُن سے دُور کر دیا اور انہیں ایک مہلت مزید عطا کر دی۔''

دیکھئے یہ واقعہ کیوں ہوا تھا؟ اسے جان لیجئے! رسول اور قوم کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اپنی قوم کو اللہ کی

اجازت کے بغیر چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام سے یہ خطا ہوگئی کہ وہ اپنی قوم کو ان کی نابنجاری کی وجہ سے غصے میں آ کر چھوڑ کر چلے گئے۔ لہٰذا یہ debit اُس قوم کے حق میں credit ہو گیا۔ جیسے جدید اکاؤنٹنگ کا ایک اصول ہے:

"For every credit entry there should be a corresponding debit entry."

تو وہ چونکہ حضرت یونس علیہ السلام کا debit تھا اس لیے ان کو سزا ملی کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں گئے۔ وہاں انہوں نے دعا کی کہ: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء: 87) "(اے اللہ!) نہیں کوئی معبود سوائے تیرے، تُو پاک ہے، یقیناً میں ہی ظالموں میں سے ہوں"۔ پھر اللہ نے انہیں مچھلی کے پیٹ سے نجات دی اور انہیں صحت دی اور دوبارہ اپنی قوم کی طرف بھیجا۔ تو ان کا ڈیبٹ قوم کے حق میں کریڈٹ ہو گیا کہ عذاب کے آثار شروع ہونے کے بعد بھی اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ مجھے یہ امید ہے کہ اگر پاکستانی اب بھی تمام شرائط کے مطابق توبہ کریں تو عذابِ الٰہی ٹل سکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنی اصل منزل کی طرف گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے جس کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا اور اس مقصد کی طرف پیش قدمی کا عزم عطا فرمائے جو علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح نے بیان کیا تھا اور جس کے لیے مسلم عوام اور مسلمانوں کے علماء و مشائخ نے ساتھ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلائے اور اس کی طرف پیش قدمی کی مہلت اور ہمت دے! اس ضمن میں سورۃ آل عمران کی آیت ذہن میں رکھیے: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ج﴾ "(دیکھو مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا"۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ امریکہ کیا امریکہ کا باپ بھی غالب نہیں آ سکتا۔ لیکن آگے فرمایا: ﴿وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ط﴾ "لیکن اگر اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے گا؟"

پھر اگر اللہ کے فضل و کرم سے حکومتی اور عوامی دونوں سطحوں پر "توبہ" کا یہ عمل خلوصِ قلب کے ساتھ شروع ہو جائے تو اُمیدِ واثق ہے کہ مشیتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی میں جو رول عالمی غلبۂ دین کے سلسلے میں تفویض کیا گیا تھا اُس کی جانب پیش قدمی شروع ہو جائے گی۔ پاکستان میں نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگا جس میں لامحالہ افغانستان بھی شامل ہو جائے گا، اس لیے کہ افغانوں کے بارے میں جو حکم ابلیس نے اپنے کارندوں کو دیا تھا، یعنی: "افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج...... مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو!" اس پر عمل نہ آسمان سے برسنے والے ڈیزی کٹر بموں سے ہو سکا ہے نہ زمینی تاخت و تاراج سے!

پھر جب ایک جانب ہم بھارت کی جانب اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظامِ عدل و قسط کے ذریعے اور خلوص و محبت کے جذبات کے ساتھ بڑھیں گے تو ایک جانب، اِن شاء اللہ العزیز، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی پیشین گوئی کے مطابق ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے

گی۔اور دوسری جانب جب سرزمین عرب میں حضرت مہدی سلام علیہ کا ظہور ہوگا تو ہماری فوجیں ان کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے جائیں گی، بقول علامہ اقبال ۔

خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں

کارواں زیں وادیٔ دُور و دراز آید بروں

یعنی جب وقت کے مجدد کا ظہور دشتِ حجاز میں ہوگا تو امدادی قافلہ (یعنی فوجیں) اس دور دراز کی وادی یعنی وادیٔ سندھ سے جائیں گی (واضح رہے کہ وادیٔ سندھ میں موجودہ پورے پاکستان پر مستزاد کوہِ ہندوکش کی مشرقی ڈھلوانوں تک کا پورا علاقہ شامل ہے' اس لیے کہ وہاں کے سارے دریا بھی دریائے سندھ ہی میں شامل ہوتے ہیں!)------ اور جب حق و باطل کے آخری معرکے یعنی مسیح الدجال کی قیادت میں یہودی کھلی جنگ کے لیے عالم اسلام پر حملہ آور ہوں گے اور مسلمانوں پر اللہ کی رحمت کے مظہر اور اُن کے مددگار حضرت مسیح ابن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے تب بھی خراسان کے علاقے سے فوجیں جائیں گی جو اُن کے ساتھ جنگ میں حصہ لیں گی اور حضرت مسیح علیہ السلام بنفس نفیس دجال کو قتل کریں گے۔اس کے بعد عیسائیت اسلام میں مدغم ہو جائے گی اور یہودیوں کی ایک قدرِ قلیل تعداد کے علاوہ جو حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے' باقی ان کی عظیم اکثریت قومِ نوح علیہ السلام' قومِ ہود علیہ السلام' قومِ صالح علیہ السلام وغیرہ کے مانند ہلاک کر دی جائے گی اور یہودیوں کا عارضی عظیم تر اسرائیل ان کے مستقل عظیم تر قبرستان کی شکل اختیار کر لے گا اور پھر نبی اکرم ﷺ کی پیشینگوئیوں کے مطابق نظامِ خلافت علیٰ منہاج نبوت پورے عالم ارضی پر قائم ہو جائے گا۔

لیکن اگر پاکستان میں حکومتی اور عوامی دونوں سطحوں پر ''توبہ'' کے تقاضے پورے نہ ہوئے تو یہ بارگاہِ الٰہی سے مخذول اور مردود ہو جائے گا۔اور اللہ وہی کرامات جو پاکستان کو عطا کی گئی تھیں' کسی اور ملک یا قوم کو عطا کر کے ان کے ذریعے اپنا اوپر بیان کردہ ایجنڈا مکمل کروالے گا گویا جو پیشگی وارننگ اہل عرب کو سورۃ محمد ﷺ میں دی گئی تھی' یعنی: ﴿اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ﴾ -----''اگر تم (ہمارے عائد کردہ فرائض سے) روگردانی کرو گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا''-----اور پاکستان یا حصے بخرے ہو کر رہ جائے گا یا بھارت کے سامنے الفاظِ قرآنی: ﴿یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ﴾ (التوبۃ:29) کا مصداق بن جائے گا۔اعاذنا اللہ من ذٰلک!

میرا اوڑھنا بچھونا قرآن ہے۔میری سوچ' میرے تجزیوں اور مستقبل کے جائزوں کی بنیاد صرف کتاب اللہ اور احادیثِ رسول ﷺ ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میری مساعی کو بھی شرفِ قبول عطا فرمائے اور ہماری حکومت اور عوام کو بھی خالص توبہ (توبۃ النصوح) کی توفیق عطا فرمائے! آمین یا ربّ العالمین!

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

(پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات اور بچاؤ کی تدابیر)

عالمی خلافت کی نوید

آیۂ استخلاف کا اجمالی تعارف

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○﴾ (النور: 55)

''وعدہ کرلیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام' البتہ پیچھے حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو، اور جما دے گا ان کے لیے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے، اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن۔ میری بندگی کریں گے' شریک نہ کریں گے میرا کسی کو۔ اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے پیچھے' سو وہی لوگ ہیں نافرمان۔''

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں پر خلافت سے مراد مسلمانوں کی حکومت ہے۔

اس وعدے کے سلسلے میں مزید وضاحت یہ فرما دی کہ یہ خلافت یا حکومت موجودہ اُمتِ مسلمہ (جو اُمتِ محمد ﷺ ہے) کو اسی طرح عطا کی جائے گی جس طرح اس آیت میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے اُس سابقہ اُمت کو بھی حکومت عطا کی تھی' (یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت طالوت سے لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام تک کا دور جو تقریباً ایک سو برس پر محیط ہے، سابقہ امت مسلمہ کی خلافت راشدہ کا دور تھا) چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ (ص: 26)

''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔''

(اس سابقہ امت کا وجود تو کسی مصلحت کے تحت اب تک برقرار رکھا گیا ہے، تاہم وہ اپنے منصب سے معزول ہو چکی ہے۔)

گویا تاریخ کے حوالے سے بتایا جا رہا ہے کہ اے اُمتِ مسلمہ! تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیں گے ہم انہیں لازماً خلافت عطا کریں گے جس طرح تم سے پہلوں کو عطا کی تھی۔

آیۂ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نوٹ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے لیے عربی زبان میں تاکید کا جو سب سے زیادہ مؤثر اور بلیغ اسلوب ممکن تھا اس کو تین بار استعمال کیا ہے۔

(i) ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾

''انہیں ضرور بالضرور خلافت عطا کرے گا۔''

(ii) ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ﴾

''اور ان کے دین کو لازماً تمکن عطا کرے گا۔''

(iii) ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا﴾

''ان کی خوف کی حالت کو جو اس وقت ان پر طاری ہے' لازماً امن میں بدل دے گا۔''

دیکھئے یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے' لیکن قرآن حکیم کی تکرار کی بھی ایک عجیب شان ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے: ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!'' قرآن حکیم میں ایک ہی مضمون کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے' مگر اس تکرار سے کلام کی تاثیر اور دلکشی میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ ''اور ان کے اس دین کو تمکن عطا کرے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے'' تو یہ وہی بات ہے جو سورۃ المائدہ میں آئی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:3)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی' تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو (تا قیامِ قیامت) دین کی حیثیت سے پسند کیا۔''

اور ظاہر ہے کہ جس دین کو اللہ نے پسند فرمایا وہ مغلوب نہیں رہے گا بلکہ اس کو غلبہ اور تمکن حاصل ہوگا۔ یہ گویا وعدۂ استخلاف کی دوسری بار تاکید ہے۔

یہی بات تیسری بار اس طرح بیان فرمائی:

﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا﴾

''ان کی خوف کی حالت کو (جو اس وقت ان پر طاری ہے) لازماً امن میں بدل دے گا۔''

سورۃ النور کی یہ آیات سن 5ھ کے اواخر یا سن 6ھ کے اوائل میں نازل ہوئی تھیں' اور جیسا کہ معلوم ہے سن 5ھ ہی میں غزوۂ احزاب پیش آیا تھا' جب عرب کی مجموعی قوت نے تقریباً ایک ماہ اور کئی دن تک مدینہ کا شدید

محاصرہ کر لیا تھا۔ 12 ہزار کا لشکر مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہوا تھا۔ مدینہ کے اردگرد یہود الگ سازشوں میں مصروف تھے۔ مسلمانوں پر شدید آزمائش کی گھڑی تھی۔ خود قرآن حکیم نے صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴾ (الاحزاب: 11)

''اہل ایمان شدید طور پر ہلا مارے گئے۔''

اس سنگین صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین کا نفاق ان کی زبانوں پر آ گیا' گویا ان کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا۔ اُس وقت یوں لگتا تھا جیسے لق و دق صحرا میں ایک دیا روشن ہے جسے بجھانے کے لیے ہر طرف سے آندھیاں چل رہی ہیں۔ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ہوازن کا بڑا قبیلہ حملہ آور ہو جائے گا۔ نجد کے قبائل یورش کر دیں گے۔ کہیں خیبر کے یہودی ہی نہ ٹوٹ پڑیں یا پھر جنوب کی طرف سے قریش نہ چڑھ دوڑیں۔ یہ تھے وہ حالات جن میں یہ بشارت دی گئی کہ ان کی اس خوف کی کیفیت کو ہم امن سے بدل دیں گے۔

آیۂ مبارکہ کا یہ حصہ بہت ہی اہم ہے کہ ﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ط﴾ یعنی ''(جب میں ان کو غلبہ عطا کر دوں گا تب) وہ میری بندگی کریں گے' میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے''۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی مسلمان اگرچہ خوف کی حالت ہی میں تھے' لیکن بندگی تو اللہ ہی کی کرتے تھے' پھر اب غلبۂ دین اور خوف کے خاتمے کے ساتھ بندگی کو کیوں معلق کیا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توحید اُس وقت تک ناقص ہے جب تک اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ قرآن حکیم نے اسی بات کو اس طرح بیان کیا ہے: ﴿وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: 39) یعنی ''دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ غیر اللہ کی حاکمیت کی کاملاً نفی ہو جائے' اس لیے کہ غیر اللہ کی حاکمیت کا تصوّر ہی سب سے بڑا شرک ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (44)۔۔۔۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (45)۔۔۔۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (47)﴾ (المائدۃ) یہی وجہ ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہ ہو تب تک افراد تو موحد ہو سکتے ہیں' لیکن نظام بہرحال کافرانہ و مشرکانہ ہی رہتا ہے۔ چنانچہ دراصل توحید کی تکمیل ہی اُس وقت ہو گی جب یہ تین وعدے پورے ہو جائیں گے۔

فسق اور کفر کی حقیقت

آیۂ مبارکہ کا اختتام اس طرح ہو رہا ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝﴾ ''اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں وہ تو نہایت ہی سرکش لوگ ہیں۔'' اس آیت میں ''فاسق'' بعینہٖ اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں ابلیس کو سورۃ کہف کی آیت 50 میں فاسق کہا گیا ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾

''وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے رب کے حکم کے خلاف ''فسق'' (سرکشی) اختیار کیا۔'' گویا یہاں فسق سرکشی اور بغاوت کے معنوں میں آیا ہے۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ ''اس کے بعد بھی جس نے کفر کیا'' تو اس آیت میں کفر کا مفہوم بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کفر دراصل دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو کفر اصطلاحی ہے جس کا مطلب اسلام کا انکار' توحید کا انکار' رسالت کا انکار یا ضروریات دین میں سے کسی کا انکار کرنا ہے۔ جب کہ دوسرا کفر وہ ہے جو شکر کے مقابلے میں آتا ہے' جیسے کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۝﴾ (ابراھیم:7)

''اگر تم میری نعمتوں کا شکر (اور قدر دانی) کرو گے تو میری طرف سے ان میں اور اضافہ ہوگا' اور اگر کفر (کفرانِ نعمت) کرو گے تو پھر (یاد رکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

اسی طرح سورۃ لقمان میں بھی کفر' شکر کے مقابلے میں آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ۝﴾ (سورۃ لقمان:12)

''جس نے شکر کی روش اختیار کی تو اس نے اپنا ہی بھلا کیا' اور جس نے کفرانِ نعمت کا وطیرہ اختیار کیا تو (اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ غنی (حمد و شکر سے بے نیاز) ہے' حمید (تمام اچھی صفات سے خود متصف) ہے۔''

لیکن سورۃ النور کی جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اس میں کفر کے یہ دونوں ہی معانی مراد ہیں۔ چنانچہ یہ معنی بھی مراد ہیں کہ:

1) ''جب اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کے بعد بھی کچھ لوگ اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو گویا وہ شیطنت کا مجسمہ ہیں''۔ کیونکہ غلبۂ کفر کی حالت میں تو کوئی عذر ہو سکتا ہے کہ آدمی مجبور ہے' حالات کے دباؤ کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ دین کا دامن فقط اصحابِ ہمت ہی تھام کر رکھیں گے۔ یہی لوگ نظامِ باطل سے ٹکرانے کی ہمت کر سکیں گے۔ لیکن دین کے غلبے کے بعد تو اکثریت کے لیے دین پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس غلبے کے بعد بھی جو کفر پر اڑا رہے گویا اس میں سرے سے کوئی خیر ہے ہی نہیں۔

2) اس کا دوسرا مفہوم بھی ہے جو ہم سے زیادہ متعلق ہے' اور وہ یہ ہے کہ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) طرف سے اتنے پختہ وعدوں کے بعد بھی اگر تم کمرِ ہمت نہیں باندھتے تو گویا ہمارے وعدوں کی بڑی ہی ناقدری کر رہے ہو۔

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس آیتِ مقدسہ میں جو بھی وعدے ہیں' وہ مشروط ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کی شرط لگی ہوئی ہے' گویا نام کے مسلمانوں سے اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا وعدہ تم پورا کرو گے اور ان کا حق ادا کرو گے تو خلافت عطا کرنے کا وعدہ ہم پورا کریں گے۔ (ہمارے

ہاں کچھ لوگ ''خلفائے ثلاثہ'' کی خلافت کے ہی نہیں ان کے اعمالِ صالحہ کے بھی منکر ہیں' مگر سورۃ النور کی یہ آیت ان کے ان سارے دعووں کی کامل نفی کرتی ہے۔ چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معرکتہ الآراء تصنیف "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں جن آیات پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے پہلی آیت یہی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنے پختہ وعدے موجود ہیں تو ان وعدوں کا مصداق آخر خارج میں بھی تو ہوگا اور اگر ''خلافت راشدہ'' کے دور کو خلافت کا دور اور آیت کا مصداق مان لیا جائے تو قرآن مجید کی شہادت کے مطابق پہلے تین خلفاء بھی ایمان و عمل صالح کا حق ادا کرنے والے ٹھہرتے ہیں' گویا حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمان اور عمل صالح کے مصداقِ کامل ٹھہرتے ہیں۔ جبھی تو ''خلافت'' کے حق دار ہوئے۔'' یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہوا ہے۔ ورنہ یہ لوگ اس آیت کو قرآن حکیم سے اب تک اس طرح کھرچ چکے ہوتے کہ اس کے وجود کا سراغ تک نہ ملتا۔)

سورۃ الصّف کی آیات کا اجمالی تعارف

اب سورۃ الصّف کی آیات 8 تا 13 سے متعلق بھی چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلے ان آیات پر ایک نگاہ ڈال لیں:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ ط وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ○ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ○﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں' اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ وہ غالب کر دے اس کو پورے کے پورے دین (نظام اطاعت) پر' خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے اہل ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس تجارت کی طرف جو تمہیں نجات دے ایک دردناک عذاب سے؟ تم ایمان پختہ رکھو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی تمہارے

حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ وہ تمہاری خطائیں معاف فرمائے گا اور تمہیں داخل کرے گا اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' اور اُن پاکیزہ گھروں میں جو جناتِ عدن میں ہیں۔ یہ ہے اصل کامیابی! اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت محبوب ہے، اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی۔ اور (اے نبی ﷺ) اہل ایمان کو بشارت دے دیجیے۔''

نورِ خدا کے دشمن؟

ان آیات میں پہلی آیت بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس سے متعلق دو نہایت ضروری باتیں میں کسی قدر وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یُرِیْدُوْنَ (وہ چاہتے ہیں) کا فاعل کون ہے؟ اور ''وہ'' کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کن کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دینے کے درپے ہیں؟

اس آیت سے پہلے سورۃ الصف میں سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی یہود کا تذکرہ چلا آ رہا ہے کہ انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا اور یہ کہ وہ اب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں۔ یہ سابقہ اُمتِ مسلمہ کے تین ادوار کا ذکر ہے جو سورۃ الصف کے پہلے رکوع میں انتہائی جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ تو گویا اس آیت میں یہود ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ (مولانا ظفر علی خان مرحوم نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے: نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن —— پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!)

پھر یہود ہی کے بارے میں یہ بات کیوں کہی گئی کہ وہ اللہ کے نُور کو گل کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت مسلمانوں کے جو دشمن موجود تھے ان پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔ ان میں سے ایک تو مشرکین تھے جن کے سرخیل قریشِ مکہ تھے' مگر یہ بہت بہادر اور جری لوگ تھے' سامنے سے حملہ کرتے تھے۔ جب کہ دوسرے دشمن تھے یہود۔ یہ انتہائی بزدل تھے' ان کے بارے میں سورۃ الحشر میں آیا ہے کہ ''یہ کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کریں گے۔ ہاں چھپ کر قلعوں کے اندر سے پتھراؤ کریں گے۔'' ابوجہل نے تو اپنے دین کے لیے بہرحال گردن کٹوائی مگر ان میں اس کی ہمت نہیں۔ یہ تو صرف پھونکوں سے کام چلانا چاہتے ہیں' کیونکہ پروپیگنڈے اور سازشوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ مگر ان کی سازشوں اور پروپیگنڈے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (8)﴾ ''اللہ تعالیٰ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔'' (اسی مضمون کی آیت سورۃ التوبہ میں بھی معمولی فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ

يُتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (32)﴾ ''چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کیے اپنی روشنی کو اور پڑے برا مانیں کافر۔'' اس آیت میں بھی تذکرہ یہود ہی کا ہے۔)

آیت کے اس پہلو پر زور اس لیے دے رہا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی اسی صورت حال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا:

آگ ہے' اولادِ ابراہیمؑ ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

بعینہٖ یہی کیفیت یہود کی آج بھی ہے۔ اس وقت صہیونیت جس طرح اسلام کے اس نور کو بجھانے کی فکر میں ہے اور جس تیزی سے یہود اپنے منصوبے روبہ عمل لا رہے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ دنیا کی سب سے بڑی حکومت اور sole supreme power کے سر پر بھی وہی سوار ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا میں Islamic fundamentalism یعنی ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوا بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ آج بھی آپ اس آیت کے بین السطور میں پڑھ لیجیے۔

رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9)﴾ ''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (یعنی قرآنِ حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اس کو کل کے کل دین پر (یا پورے نظامِ زندگی پر) خواہ مشرکوں کو یہ بات ناپسند ہو''

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ جب تک نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کا صحیح صحیح فہم حاصل نہ ہو' سیرۃ النبی ﷺ سمجھ میں نہیں آسکتی' نہ ہی قرآن حکیم کا گہرا فہم و ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ بات میں دراصل امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں' جنہوں نے اس آیہ مبارکہ کو پورے قرآن کا عمود قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی بڑی شخصیت کے کارناموں اور کاوشوں کی قدر و قیمت معین کرنے اور ان کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کا مقصد معین ہو جائے۔ تب ہی تو آپ تجزیہ کر سکیں گے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی اور کتنی ناکام۔ نیز یہ کہ اس نے اپنا ہدف کس طور سے اور کس حد تک حاصل کر لیا۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت صرف تبلیغ نہیں ہے بلکہ غلبۂ دینِ حق ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔ اگر فقط تبلیغ کرنی ہوتی تو شاید حضور ﷺ کبھی ہاتھ میں تلوار نہ لیتے۔ لیکن غلبۂ دین

حق کے لیے ہاتھ میں تلوار لیے بغیر چارہ نہیں۔ اسی حقیقت کے منکشف ہونے سے تو ساری بات کھلتی ہے۔ تبلیغ تو بدھ مت کے بھکشو بھی کرتے ہیں۔ آخر یہ عیسائی مشنری والے بھی تو تبلیغ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہ تبلیغ جس سطح پر کر رہے ہیں اس میں کسی تصادم کی ضرورت نہیں پیش آتی' اس لیے کہ محض تبلیغ کے کچھ اور تقاضے ہوتے ہیں' جب کہ غلبۂ دین کے کچھ اور تقاضے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی غلبۂ دینِ حق ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ مشرکوں کو بہت ہی ناگوار ہوگا۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ مشرک ہے کون! ہر وہ شخص یا ادارہ جو دینِ حق کے مقابلے میں کوئی اور نظام آپ کے سامنے رکھے وہ مشرک ہے۔ مگر ہم نے شرک کو صرف چند عقائد تک محدود کر دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام!

غلبۂ دین اور جہاد و قتال

اللہ کا دین یقیناً غالب ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی غلبۂ دین ہے۔ لیکن اس کے لیے سرفروشی' جانفشانی اور جہاد و قتال کے مراحل تو مؤمنینِ صادقین ہی کو طے کرنے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

"اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی اس تجارت کی طرف کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (پختہ) ایمان رکھو اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ اگر تم علم (حقیقی) رکھتے ہو تو (جان لو کہ) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔"

سورۃ الصف کی ان آیات پر ذرا ٹھہر کر ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ سورۃ النور کی آیت 55 میں نظامِ خلافت کے قیام کے لیے دو شرائط آئی تھیں' یعنی وعدہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط تھا۔ اس مقام پر بھی دو ہی شرائط آئی ہیں' یعنی ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ۔ وہ ایمان' وہ عمل صالح اور وہ جہاد کون سے ہیں جن سے یہ وعدے پورے ہو سکتے ہیں؟ افسوس ہے کہ ہمارے ذہنوں میں ایمان' عمل صالح اور جہاد کے معنی بہت محدود اور مسخ شدہ ہیں' اس لیے ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دُنیوی اوراُخروی وعدے

سورۃ الصف کی مذکورہ بالا آیات میں دو وعدے مذکور ہیں' جب کہ سورۃ النور کی آیت 55 میں تین وعدے آئے ہیں' مگر سورۃ النور میں جن وعدوں کا ذکر ہے ان کا تعلق دنیا سے ہے' یعنی ''اے مسلمانو! ہم تمہیں خلافت عطا کریں گے' دنیا میں تمہارا دین غالب ہو جائے گا اور دنیا میں تمہاری خوف کی کیفیت امن سے بدل دی جائیگی۔'' جب کہ سورۃ الصف کی مذکورہ بالا آیات میں پہلے آخرت کا نتیجہ بیان کیا ہے' یعنی ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر حقیقی ایمان رکھو گے اور جہاد فی سبیل اللہ پر کار بند رہو گے تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا' تمہیں جنتوں میں داخل کرے گا اور ہمیشہ ہمیش کے باغات میں تمہیں نہایت پاکیزہ مسکن عطا کرے گا۔'' اور اسی اخروی نتیجے کو بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ اس طرح ہمارے معیارِ خیر وشر (value structure) کو بھی درست کر دیا گیا ہے کہ اصل کامیابی دنیا کی نہیں' آخرت کی ہے۔ اسی لیے آگے چل کر تقابل (contrast) میں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا﴾ ''ایک اور شے جو تمہیں پسند ہے۔''

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ ''یہاں درحقیقت اس بات کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ تمہاری بشریت ہے جس کی وجہ سے تم دنیا کی فتح وکامیابی کو اہمیت دیتے ہو' مگر اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر اہمیت ہوتی تو (اہل ایمان کو) آنِ واحد میں فتح عطا کر دیتا۔ اللہ کی نگاہ میں تو تمہاری آزمائش اور امتحان کو اہمیت حاصل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اپنی آنکھوں سے فتح مکہ کا منظر نہیں دیکھ سکے تو کیا وہ ناکام ہو گئے؟ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ تو مکہ میں ہی شہید ہو گئے' ان کو مدینہ کا دارالامن دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ لہٰذا اصل کامیابی ثابت قدمی ہے۔ ایمان وعمل صالح کا حق ادا کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دینا ہی فوزِ عظیم ہے۔

اُخروی کامیابی کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دنیا سے متعلق وعدوں کا ذکر ہوا ہے:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

یعنی اللہ کی طرف سے مدد آیا ہی چاہتی اور فتح تمہارے قدم چوما چاہتی ہے۔ اور اے نبی ﷺ! ہمارے مومن بندوں کو بشارت دے دیجیے کہ تمہاری سخت آزمائشوں کا زمانہ اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ تم نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیا ہے اور جہاد کے تقاضے بھی پورے کر دیے ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب آزمائش انتہا کو پہنچ جاتی ہے' اور اہل ایمان اس میں بھی اپنی ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کر دکھاتے ہیں تب اللہ کی مدد بلا تاخیر دستگیری کے لیے آ جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت اس آیت میں بھی مومنین کو فتح اور نصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

وعدۂ استخلاف کی تکمیلِ اوّل

آیئے اب یہ دیکھیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ وعدۂ استخلاف ونصرت کتنی جلدی پورا ہوا۔ مذکورہ بالا آیات سن 5ھ کے اواخر یا سن 6ھ کے اوائل میں نازل ہوئیں۔ 6ھ کے ذی القعدہ میں صلح حدیبیہ ہوئی اور قرآن نے اعلان کر دیا: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ (الفتح:1)''اے نبی! ہم نے تم کو فتح مبین عطا کی۔'' یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن مجید صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیتا ہے، لیکن فتح مکہ کا ذکر اس اہتمام سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں کُفار نے مسلمانوں کے وجود کو ایک طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا اور یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ (ہمارے زمانے میں عربوں کے مقابلے میں یہود نے 1948ء میں زبردست کامیابی حاصل کی، پھر 1967ء میں یہود نے عربوں کے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی طاقتور ترین حکومتوں مصر اور شام کو شکست سے دوچار کیا۔ لیکن اسرائیل کی اصل اور سب سے بڑی فتح یہ ہے کہ آج تمام عرب ممالک اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ توہین وتذلیل کی حد ہے کہ سب کو اسرائیل کے سامنے ایک میز پر گفتگو کے لیے بلا لیا گیا ہے۔ حالانکہ عرب اس پر کبھی تیار نہ تھے، صرف مصر نے یہ ذلت گوارا کی تھی، لیکن اب سب کو میڈرڈ میں بلا کر بٹھایا گیا ہے۔ یہ میڈرڈ ''تہذیب حجازی'' کے مزار اندلس (اسپین) کا معروف شہر ہے۔ اس سے قبل میڈرڈ میں کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی، لیکن عربوں کی تذلیل کے لیے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے، جہاں پر آٹھ سو سال انہوں نے حکومت کی تھی، مگر جہاں سے ان کا بچہ بچہ ختم کیا گیا اور جہاں سے ان کو ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔)

6ھ کی صلح حدیبیہ کے فوراً بعد 7ھ میں خیبر فتح ہو گیا۔ مسلمانوں کی تنگ دستی ختم ہوئی۔ پھر 8ھ میں خود مکہ فتح ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اعلان کر دیا گیا: ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى الَّذِيۡنَ عٰهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾ (التوبہ:1) یعنی ''مشرک کان کھول کر سن لیں کہ آج کے بعد سے ان کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں''۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر جزیرہ نمائے عرب سے کفر وشرک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ سورۃ التوبہ میں mopping-up operation کا اعلان کر دیا گیا۔ کسی علاقے کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی کہیں کہیں مزاحمتی اور دفاعی مورچے (pockets of resistance) باقی رہ جاتے ہیں، فتح مکہ کے بعد ان مزاحمتی مورچوں کی صفائی سن 9ھ میں ہوئی۔ پھر 9ھ کے اواخر یا 10ھ کے اوائل تک ﴿وَقُلۡ جَآءَ الۡحَـقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا۝﴾ (بنی اسرائیل:81) کا بچشم سر مشاہدہ ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین غالب ہو گیا۔ نظامِ خلافت کا وعدہ پورا ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد 24 برس کے اندر اندر دریائے جیحوں سے لے کر بحر اوقیانوس تک نظام خلافت غالب ہو گیا۔ گویا آیتِ استخلاف کے نزول کے بعد تیس برس کے اندر اندر معروف دنیا کے بہت بڑے رقبے پر وہ کیفیتیں پوری ہو گئیں جن کو

﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ط﴾ کے بلیغ انداز میں بیان فرمادیا گیا تھا۔

قافلۂ سخت جاں‘ منزل بمنزل

یہ تو ہے وعدۂ استخلاف ونصرت کی تکمیل اولیٰ۔ البتہ اس کے بعد کیا ہوا‘ اس وقت سے اب تک ہم کن کن مرحلوں اور وادیوں سے گزرے اور اب ؎

کون سی وادی میں ہے‘ کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!

یہ تیرہ سو اکتیس برس کی تاریخ ہے۔ 632ء میں نبی ﷺ کی وفات ہوئی‘ تیس برس خلافت راشدہ کے اور نکال دیجیے۔ اس حساب سے تیرہ سو اکتیس سال بنتے ہیں (1994ء تک)۔ اگر ہم اپنی کوشش سے اس ساری داستان کو بہت مختصر کر کے بیان کریں تو بھی بات بہت طویل ہو جائے‘ لیکن یہ کلامِ نبوی ﷺ کی بلاغت ہے کہ ہم اس طویل تاریخ کو صرف ایک حدیث نبوی ﷺ سے سمجھ لیں گے۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارک میں اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے۔ ہماری پوری تاریخ اس حدیث میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت ہے جسے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: ((تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا)) ”مسلمانو! تمہارے اندر نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اس نبوت کو اٹھا لے گا۔“ (یعنی میں تمہارے درمیان بنفس نفیس موجود رہوں گا‘ پھر ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ (الزمر: 30) (موت تم کو بھی آنی ہے اور موت ان کو بھی آنی ہے) کے تحت اللہ کے حکم سے نبی ﷺ دنیا سے رخت سفر باندھ لیں گے۔)

پھر آپ ﷺ نے دوسرے دور کا ذکر کیا ہے: ((ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ”پھر خلافت ہوگی منہاجِ نبوت پر۔“

”خلافت علیٰ منہاج النبوۃ“ اس کے الفاظ بہت قابل غور ہیں۔ اس دور کے لیے ہمارے ہاں معروف اصطلاح ”خلافت راشدہ“ ہے۔ تاہم یہ اصطلاح حدیث میں اس طرح نہیں آئی۔ ہاں ”خلفاء راشدین“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں‘ جیسا کہ مشہور حدیث ہے: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ)) ”میری سنت کا اتباع کرنا اور میرے خلفاء راشدین المہدیین کی سنت کا اتباع کرنا تم پر لازم ہے“۔ لیکن حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی زیر مطالعہ روایت میں خلافت کی جو صفت آئی ہے وہ اتنی مشہور نہیں ہے۔ اللہ نے یہ توفیق ہم کو دی کہ ہم اپنی تقاریر اور مطبوعات کے ذریعے اس صفت کو عام کر رہے ہیں۔ خلافت

علیٰ منہاجِ النبوۃ کے معنی ہوں گے کہ ''بعینہٖ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت''۔ یہ ''بعینہٖ'' کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ خلافت راشدہ میں وہ نظام جو محمد عربی ﷺ نے بنفسِ نفیس قائم کیا تھا وہ بعینہٖ بتمامہٖ اور بکمالہٖ جوں کا توں قائم رہا۔

اس سلسلے میں صرف ایک مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک کے آغاز ہی میں مانعینِ زکوٰۃ کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم شخص نے بھی مصلحت اندیشی کا مشورہ دیا' کیونکہ دو محاذ پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک محاذ پر رومیوں سے جنگ کے لیے جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا تھا کہ اس لشکر کے بھیجنے کا فیصلہ خود نبی ﷺ نے کیا تھا' اس کا علم خود دستِ مبارک سے باندھا تھا' میں اسے کیسے کھول سکتا ہوں۔ دوسرا محاذ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف کھل چکا تھا' ان کے کفر میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی' چنانچہ ان سے تو لڑنا ہی تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''اب تیسرا محاذ نہ کھولیے''۔ اس بات پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ردعمل (reaction) بڑا ہی سخت تھا۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ڈانٹ پلا دی۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کا مقام ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی کو وہ ڈانٹ سکتے تھے۔ صحابہؓ میں کسی اور کا یہ مقام نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر رضی اللہ عنہ! تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے' اسلام میں آ کر بزدل بن گئے؟ (اَجبّارٌ فی الجاھلیة و خوار فی الاسلام؟) اور دوسری بات جو آپؓ نے فرمائی دراصل اسی کو بیان کرنے کے لیے یہ سارا واقعہ میں نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ''اَیُنْقَصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟'' ''کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی؟'' آپ رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر حضور ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ یہ ان کو باندھنے کی رسیاں دیتے تھے' مگر اب رسّی دینے سے انکار کریں گے تو بھی میں اُن سے جنگ کروں گا۔''

کمیونزم اب تو قصہ پارینہ بن چکا ہے' لیکن اس کے زوال کا آغاز نظریات میں ترمیم سے ہوا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کمیونزم عالمی نظریہ کے بجائے روسی قوم پرستی (Russian Nationalism) کا لبادہ اوڑھ چکا ہے' چنانچہ تحریف کی ایک خشتِ کج نے پوری عمارت کو زمین بوس کر دیا۔

دورِ حاضر کی اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے موقف پر غور کریں۔ آپؓ نے اظہار مافی الضمیر میں فصاحت و بلاغت کی بھی حد کر دی۔ کہاں اونٹ اور کہاں اس کی رسّی' لیکن جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اتنی مداہنت یا ترمیم بھی گوارا نہ تھی۔ آپؓ کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؓ نے اعلان کر دیا تھا: ''خدا کی قسم! اور کوئی میرے ساتھ جائے یا نہ جائے میں تن تنہا جاؤں گا اور ان سے جنگ کروں گا۔'' آخر اُمت نے آپ کو ''افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق'' (بلاشبہ انبیاء کے بعد تمام انسانوں سے افضل) کا اعلیٰ مقام یونہی تو نہیں دے دیا تھا! آپ جیسا رقیق القلب انسان اس نازک موقع

پر عزیمت واستقلال کا کوہِ ہمالہ نظر آتا ہے۔

بہر حال اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے معنی حقیقتاً ہیں کیا اور اس سے فی الواقع مراد کیا ہے۔ اسی خلافت کو عرفِ عام میں خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی حدیث مبارک میں مزید فرمایا کہ یہ نظام بھی اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ اس کے بعد یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتے پر بھی غور کر لیں کہ کیا خود حضور ﷺ کا دور بھی دورِ خلافت تھا یا نہیں؟ یقیناً آپ ﷺ کا دور بھی دورِ خلافت ہی ہے۔ ہر نبی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم خود کہتا ہے: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (ص:26) ''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔'' بلکہ آپ ﷺ کا دورِ خلافت اب ایک ''ماڈل'' کی حیثیت رکھتا ہے' جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:21) ''تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔'' چنانچہ اب قیامت تک جو بھی نظام ہوں گے انہیں اسی کے حوالے سے پرکھا جائے گا۔

اس کے بعد نبی ﷺ نے تیسرے دور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے: ((ثُمَّ یَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ یَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَهَا)) یعنی ''پھر ایک دورِ ملوکیت آئے گا اور یہ کاٹ کھانے والی ملوکیت ہوگی۔ یہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جب چاہے گا' اسے بھی اٹھا لے گا۔''

خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد جس نظام کو عرفِ عام میں خلافت کہا جاتا ہے' حدیثِ نبوی ﷺ میں اسے ملوکیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تاہم اس دور کو ہم اس معنی میں خلافت کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کم از کم نظری طور پر کتاب وسنت کی مکمل بالادستی تسلیم کی جاتی تھی۔ اس قسم کی بالادستی خلافت بنواُمیہ میں بھی تھی اور خلافتِ بنوعباس میں بھی' جبکہ خلافت عثمانیہ میں بھی یہ بالادستی قائم رہی۔ ہاں اقتدار کی منتقلی اور دولت کی تقسیم کا نظام عملاً بدل گیا تھا۔ دورِ بنواُمیہ کے 90 برس دراصل عبوری مدت ہے۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ سے ملوکیت تک بات ایک دن میں نہیں پہنچی تھی' چنانچہ اصل ملوکیت تو بنوعباس کے دور میں شروع ہوئی۔

بہر حال بنواُمیہ کی حکومت بھی یقیناً ظالم تھی۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ میدانِ کربلا میں جو کچھ ہوا اس سے تو بچہ بچہ واقف ہے' کیونکہ اس کا تذکرہ تو اہتمام کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ اسی جیسا سلوک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حرمِ مکہ میں ہوا' ان کو بے دردی سے ذبح کیا گیا اور ان کی لاش کو تین دن تک بے گور وکفن سولی کے تختے پر لٹکائے رکھا گیا۔ حرمِ مکی کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا۔ اسی دور میں واقعۂ حرہ بھی پیش آیا' جب تین دن تک مدینہ منورہ میں لوٹ مار کی گئی' خواتین کی بے حرمتی کی گئی اور حجاج بن یوسف

کے ہاتھوں سینکڑوں تابعین شہید کیے گئے' مگر میرے نزدیک اس سے بڑا ظلم یہ تھا کہ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو سندھ سے واپس بلا کر شہید کر دیا گیا۔ وہ نوجوان تھا' لیکن اس قدر پارسا تھا کہ ہندوؤں نے اپنے معیار و عقیدہ کے مطابق اسے اوتار قرار دے دیا اور اس کی مورتیاں بنا کر پوجا شروع کر دی۔ ایسے متقی اور عادل حکمران کو اگر موقع مل جاتا تو پورا ہندوستان فتح ہو جاتا' لیکن اس سے ملوکیت کو بڑا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ملوکیت میں تو سوچنے کا انداز یہی ہوتا ہے کہ کسی شخص کا ہر دل عزیز ہونا تختِ شاہی کے لیے خطرہ ہے۔ محمد بن قاسم کا یہی جرم تھا کہ وہ کشمکشِ اقتدار میں برسر اقتدار آنے والے بادشاہ کے مخالف گروپ میں شمار ہوتا تھا۔ جو کچھ محمد بن قاسم کے ساتھ ہوا بعینہٖ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے شمالی افریقہ کا اکثر و بیشتر حصہ فتح کیا تھا۔ طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر کے ادنیٰ کمانڈر تھے۔ موسیٰ بن نصیر کو بھی ذلیل کیا گیا' دھوپ میں کھڑا کیا گیا' بہت بوڑھے تھے' بے ہوش ہو کر گر گئے۔ دونوں کو بادشاہت کے لیے خطرہ سمجھا گیا۔

یہ حالت تو بنو اُمیہ کے دَور کی ہے۔ اس کے بعد بنو عباس کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ جو ٹھاٹ اس دور میں جمے' رقص و سرود کی جو محفلیں سجائی گئیں' وہ سب کو معلوم ہیں۔ کوہِ قاف کا سارا نسوانی حسن بغداد کے محلوں میں کھنچا چلا آ رہا تھا۔ یہ ہے تیسرا دور جسے نبی ﷺ نے ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' سے تعبیر کیا ہے۔

چوتھے دور کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيًّا ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا)) یعنی ''پھر ایک اور ملوکیت آئے گی' وہ مجبوری والی ملوکیت ہوگی۔ پھر اس کو بھی اللہ جب چاہے گا اٹھا لے گا۔''

ان دو قسم کی ملوکیتوں میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں ہمارے پاس نہ اس امر کی کوئی شہادت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا ہو' نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس زمانے میں ان دونوں ملوکیتوں کے درمیان کیا فرق سمجھا گیا' مگر آج کے حالات میں ہمارے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ان سے مراد کیا ہے! پہلا دورِ ملوکیت وہ تھا جب ملوک مسلمان تو تھے' لیکن اس کے بعد جو ملوکیت ہم پر مسلط ہوئی وہ غیر مسلموں کی تھی۔ یہ مغربی استعماریت کا دور ہے۔ ہم برطانیہ کے غلام' فرانس کے غلام' اٹلی کے غلام اور ولندیزیوں کے غلام ہوتے چلے گئے۔ یہ چوتھا دور ہے' جس کی اس حدیث مبارک میں خبر دی گئی ہے۔

یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ براہِ راست غلامی تو ختم ہو گئی' لیکن بالواسطہ یعنی (by-proxy rule یا indirect rule) ابھی برقرار ہے۔ پوری اُمتِ مسلمہ ہنوز اُن کے شکنجے میں ہے۔ ہماری معیشت اور وسائل ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے دماغ ان کے قابو میں ہیں۔ ذہنی' فکری اور تہذیبی اعتبار سے ہم ان کے غلام ہیں۔ علم اور ٹیکنالوجی میں ہم ان کے بھکاری ہیں۔ دراصل یہ چوتھا دور جزوی طور پر ختم ہوا ہے' لیکن معنوی اعتبار سے اس کا تسلسل اب بھی جاری ہے۔ اس غلامی کا جو حصہ باقی ہے وہ پہلے سے زیادہ تلخ اور اس کے شدائد اور مصائب پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔

دورِ سعادت کی نوید جاں فزا

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا' حدیث مبارکہ کے مطابق بہرحال اس دور کو بھی ختم ہونا ہے اور اس کے بعد آپ ﷺ نے آخری دَور کا تذکرہ فرمایا ہے: ((ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ''پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور آئے گا۔'' یہ ہے وہ نویدِ جاں فزا' وہ خوشخبری جو موجودہ مایوس کن حالات کے لیے نبی اکرم ﷺ نے سنائی ہے۔

اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ثُمَّ سَكَتَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ یعنی ''اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ خاموش ہو گئے۔'' اسی حدیث مبارکہ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قدرے تفصیل سے اپنی کتاب ''تجدید واحیائے دین'' میں نقل کیا ہے۔ اس روایت میں اضافی مضمون یہ ہے کہ:

''جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے گا تو لوگوں میں معاملہ سُنّتِ محمد ﷺ کے مطابق ہو گا اور اسلام اپنے جھنڈے زمین میں گاڑ دے گا۔ آسمان والے بھی راضی ہو جائیں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان اپنا ہر ہر (مبارک) قطرہ موسلا دھار بارش کی شکل میں زمین پر برسا دے گا اور زمین بھی اپنے تمام معدنی اور نباتاتی خزانے اگل دے گی۔''

گویا اس حدیث مبارکہ میں نظام خلافت کی اضافی شان وارد ہوئی ہے۔ افسوس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ میں امکانی کوشش کے باوجود اب تک حوالہ تلاش نہیں کر سکا۔

اگر اِس وقت کے معروضی حالات کو دیکھا جائے تو یہ بشارت بالکل ناممکن الوقوع نظر آتی ہے' لیکن ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ جب نبی ﷺ کو ہم نے مان لیا ہے کہ وہ الصادق والمصدوق ہیں تو ان کی ہر خبر پر ایمان لانا لازم ہے۔ حدیث صحیح ہے' لہٰذا ایمان لانا ہے۔ شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم یقین کریں یا نہ کریں' ہونا وہی ہے جس کی آپ ﷺ نے خبر دی ہے۔

بیسویں صدی کی تاریخی اہمیت

اب چند باتیں بیسویں صدی کے حوالے سے بھی عرض کرنی ہیں۔ تاریخ انسانی میں بیسویں صدی سے زیادہ گمبھیر دور کوئی نہیں گزرا۔ اس صدی میں دو عظیم مملکتوں کا ایسا خاتمہ ہوا کہ نام ونشان تک مٹ گیا۔ صدی کے آغاز میں' سلطنت عثمانیہ جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی' جب کہ اس صدی کے اختتام پر U.S.S.R جیسی سپر طاقت ع ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!'' کی تصویر بن گئی۔ کیا عجب کہ اسی صدی میں کوئی تیسری طاقت بھی اسی طرح پگھل کر رہ جائے! جاننے والے جانتے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔ امریکی معیشت سخت بحران کا شکار ہے۔ اس کی معیشت کا اصل lever یہود کے ہاتھ میں ہے۔ یہودی جب چاہیں گے' ایک جنبش میں سب کچھ ختم کر دیں گے۔ میں تو ان حقائق کو دو اور دو چار کی طرح جانتا

ہوں۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب یہود مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کریں گے۔ مسلمان ممالک میں سے ان کے راستے میں کوئی مزاحم نہیں ہے۔ اگر مزاحم ہو گا تو امریکہ ہی ہو گا۔ لہٰذا وہ پہلے اس کا خاتمہ کریں گے۔ جو لوگ مغرب کے حالات کا مطالعہ صہیونی تحریک کے عزائم کے پس منظر میں کرتے ہیں وہ یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں ہی دو عظیم جنگیں ہوئی ہیں' جن میں کروڑوں انسان قتل ہوئے۔ کیا تیسری جنگ نہیں ہوسکتی؟ نبی اکرم ﷺ نے احادیث مبارکہ میں اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی کی خبر دی ہے' اسے جنگ عظیم نہیں جنگ اعظم کہیں گے۔ اس لیے کہ عظمیٰ اعظم کی مؤنث ہے۔ حالات تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں۔ دراصل یہ تیسری صلیبی جنگ ہوگی۔ (واضح رہے کہ یورپ دو صلیبی جنگیں پہلے لڑ چکا ہے۔) احادیث مبارکہ کے علاوہ اس کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔

بیسویں صدی ہی کا تیسرا عجوبہ یہ ہے کہ یہودی قوم جو دو ہزار سال سے دربدر تھی' اُسے اس صدی میں گھر مل گیا۔ اسرائیل وجود میں آ گیا اور آیا بھی کس شان و شوکت سے!

70 عیسوی سے یہودی بے گھر تھے۔ ٹائیٹس رومی نے یروشلم پر حملہ کیا تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ یہودی ایک دن میں قتل ہوئے۔ ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا' جو اب تک مسمار پڑا ہے۔ اسی لیے یہودی اس کو اپنی تاریخ کا دورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہودی دنیا میں تیرہ چودہ ملین (یعنی ایک کروڑ تیس چالیس لاکھ) سے زائد نہیں ہیں۔ اس کے برعکس اُمتِ مسلمہ میں سے صرف عربوں کو شمار کیا جائے تو وہی بیس پچیس کروڑ ہیں' لیکن ان کی جو معنوی حقیقت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ شاید یہود کا موجودہ تسلط اور استیلاء بجھنے سے پہلے چراغ کی آخری بھڑک ہو۔ اس کے بعد شاید یہ مغضوب و ملعون قوم تباہ و برباد کر دی جائے۔

اہل ایمان کا طلوع و غروب

اگر اس صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو کیا اس صدی کے اختتام پر احیائے نظامِ خلافت نہیں ہوسکتا؟ چنانچہ ہم بقولِ شاعر یہ منظر دیکھ لیں کہ:۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے' اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

یہ نری شاعری نہیں' بلکہ تاریخی حقائق ہیں۔ جب اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکمرانی کا سورج غروب ہو رہا تھا تو اُسی وقت مشرق میں اسلام کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

اسلام کو تو قیامت تک رہنا ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ ((اَنَا آخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ

الْاُمَمِ)) (ابن ماجہ) ''مَیں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو''۔ یہ اُمت کسی ایک نسل پر مبنی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو معزول کیا تو اپنے دین کا پرچم ترکوں کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اب ترک اگر معزول ہو گئے ہیں تو کیا عجب یہ پرچم اسلام ہندیوں کے ہاتھوں میں آنے والا ہو' جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی' ذہنِ ہندی' نطقِ اعرابی!

یہ منظر تاریخ انسانی پہلے بھی دیکھ چکی ہے:۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

اور:۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کوئی بعید نہیں کہ آفتابِ خلافت جو اس صدی کے آغاز میں غروب ہوا وہ اس کے اختتام پر طلوع ہو جائے!

مسلمانانِ برعظیم کا استحقاق

بیسویں صدی کے حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ جب خلافت کا برائے نام ادارہ بھی اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی نادانیوں سے ختم کر دیا گیا تو ردِ عمل کہاں ظاہر ہوا؟ صرف اور صرف برعظیم پاک و ہند میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ خلافت کا ادارہ تو پورے عالم اسلام کی وحدت کا نشان تھا' اس لیے آنسو تو پورے عالم اسلام میں بہائے جانے چاہئیں تھے' لیکن کہیں کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا۔ اس ادارے کی بحالی کی تحریک چلی تو صرف اس صنم خانۂ ہند میں چلی اور اس شدت سے چلی کہ گاندھی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا۔ گاندھی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس نے اس موقع پر مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا تو آئندہ کبھی بھی ان کا تعاون حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ پورا برعظیم اس نغمے سے گونج اٹھا:۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا' خلافت کا یہ برائے نام ادارہ اپنوں کی غداری سے منسوخ ہوا تھا۔ بقول اقبال:

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

مصطفی کمال پاشا نے اُس وقت صہیونیت کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا۔ (اس موقع پر ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ دورانِ اسیری انگریز کمانڈنٹ آپ کی درویشی سے متاثر ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ ہماری خلافت کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ یہ تو ایک مُردہ خلافت ہے' اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے جواب دیا ''مولانا آپ اتنے سادہ نہ بنئے! آپ بھی جانتے ہیں اور ہم کو بھی معلوم ہے کہ یہ گئی گزری خلافت بھی اتنی طاقتور ہے کہ اگر کہیں دارالخلافہ سے جہاد کا اعلان ہو جائے تو مشرق سے مغرب تک لاکھوں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں گے۔'')

1924ء سے لے کر اب 1994ء تک ستر برس بیت گئے ہیں' لیکن پوری دنیا میں خلافت کے ادارے کا برائے نام وجود بھی نہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

عالمی خلافت

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا گیا ہے کہ نظامِ خلافت ایک مرتبہ پھر برپا ہو کر رہے گا' لیکن اب جب بھی خلافت قائم ہو گی تو یہ دنیا کے کسی ایک خطے پر محدود نہیں ہو گی بلکہ عالمی خلافت ہو گی۔ اس لیے کہ صراحت کے ساتھ احادیثِ نبوی ﷺ میں اس کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ حدیث کے علاوہ خود قرآنِ حکیم میں اس کا صغریٰ کبریٰ موجود ہے۔ (منطق میں دو معلوم یا تسلیم شدہ باتوں یا قضیوں کو ترتیب دے کر کسی نامعلوم بات جسے نتیجہ کہتے ہیں' تک پہنچنے کو قیاس کہتے ہیں۔ معلوم قضیوں کا subject موضوع کہلاتا ہے۔ جس قضیہ کا موضوع زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ قضیہ ''کبریٰ'' کہلاتا ہے اور جس کا موضوع نسبتاً کم افراد پر مشتمل ہوتا ہے اس قضیہ یا مقدمہ کو ''صغریٰ'' کہتے ہیں۔ دو قضیوں میں جو مشترک بات ہوتی ہے اسے ''حدِ اوسط'' کہتے ہیں۔ صغریٰ اور کبریٰ میں سے حدِ اوسط نکال دینے سے نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کھیل ہے (صغریٰ)' کھیل تفریح ہے (کبریٰ)۔ نتیجہ. کرکٹ تفریح ہے۔ حدِ اوسط ''کھیل'' کو دونوں جملوں سے خارج کر کے نتیجہ معلوم کر لیا گیا۔)

قرآن حکیم میں یہ الفاظِ مبارکہ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ تین مرتبہ ایک شوشے کے فرق کے بغیر وارد ہوئے ہیں۔ گویا یہ صغریٰ ہے۔

پھر قرآن مجید میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ بات پانچ مرتبہ وارد ہوئی ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت پورے عالم انسانی کے لیے ہے' جیسا کہ سورۃ سبا کی آیت 28 میں ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ ''اے نبی ﷺ! ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر ہی بھیجا ہے۔'' یہ کبریٰ ہے۔ اس کو صغریٰ کے ساتھ جمع کیجئے' نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ بعثتِ محمدی ﷺ کا مقصد غلبۂ دین ہے (صغریٰ)' بعثتِ محمدی ﷺ تمام عالم انسانی کے لیے ہے (کبریٰ)' غلبۂ دین تمام عالم کے لیے ہے (نتیجہ)۔

بعثت کا مقصد غلبۂ دین لازماً پورا ہو گا۔ مگر کب؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس

وعدے کا اِتمام ہماری آزمائش اور امتحان کی راہ سے گزرتا ہوا آگے بڑھے گا۔ چنانچہ ہمیں علامہ اقبال کا یہ پیغام یاد رکھنا چاہیے کہ: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

اور جب یہ اِتمام ہو جائے گا تو بساطِ عالم کا نقشہ کچھ اس طرح پر ہوگا:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

گویا اُس وقت ﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط﴾ (النور:55) کی تصویر سامنے آجائے گی۔

غلبۂ دین اور احادیثِ مبارکہ

اب میں ان پیشین گوئیوں کا حوالہ دوں گا جو احادیث مبارکہ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت ہے جس کے راوی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا)) (مسلم' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجه)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا (یا لپیٹ دیا) تو میں نے زمین کے سارے مشرق اور سارے مغرب دیکھ لیے' اور (سن لو) میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے زمین سکیڑ کر دکھائے گئے ہیں۔''

ایک دوسری حدیث مسند احمد بن حنبل کی روایت ہے اور اس کے راوی مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ' اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا' اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا))
(رواه احمد بسند صحیح)

''زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ گارے کا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں سے بنا ہوا کوئی خیمہ جس کے اندر اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرما دے' عزّت دار کی عزّت کے ساتھ یا مغلوبیت پسند کی مغلوبیت کے ساتھ۔ یا تو اللہ ان کو اس کلمہ کے ذریعے عزّت دے گا تو وہ خود اس کلمہ کے حامل بن جائیں گے یا وہ ان کو مغلوب کر دے گا تو وہ اس کے مطیع اور تابع بن جائیں گے۔''

راویٔ حدیث (حضرت مقداد رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں' اس پر مَیں نے (اپنے دل میں) کہا تب وہ بات پوری ہو جائے گی کہ ''دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے۔''

گویا احادیث مبارکہ کی ان پیشین گوئیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔

فلسفۂ ارتقاء اور غلبۂ دین

اسی بات کو میں دو اور حوالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات کا تعلق فلسفۂ ارتقاء سے ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''Ideology of the Future'' میں فلسفہ ارتقاء کے مختلف مراحل بیان کیے ہیں۔ ایک فلسفۂ ارتقاء وہ ہے جسے ڈارون نے بیان کیا ہے' اس کو ذہن سے نکال دیجیے' کیونکہ اس کے بعض گوشے ابھی تک حیاتیات کے میدان میں بھی مسلّم نہیں سمجھے جاتے۔ تاہم جہاں تک تعلق ہے نفسِ ارتقاء کا تو اس کو سب سے پہلے بیان کرنے والے تو مسلمان فلسفی ابن مسکویہ ہیں۔ اس فلسفے کو بعد میں مولانا روم نے بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ارتقاء کا پہلا مرحلہ Physical Evolution یعنی ارتقاءِ طبعی بیان کرتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کے جدید نظریات کے مطابق تخلیق کا ایک مرحلہ (stage) وہ ہے جس سے کیمیاوی مرکبات (chemical compounds) بنے ہیں۔ ان سے جب نامیاتی مرکبات (organic compounds) وجود میں آ گئے جن میں حیات کی صلاحیت تھی تو گویا Physical Evolution اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ اب حیات کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ارتقاء کا دوسرا مرحلہ (second phase) ہے حیاتیاتی ارتقاء (Biological Evolution) اور ڈارون کی بحث اسی phase تک محدود ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی یہ ارتقاء بھی اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اس سے آگے حیاتیاتی ارتقاء کی کوئی منزل نہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے جس مرحلۂ ارتقاء کا ذکر کیا ہے (وہ اسے ایک مرحلہ کہتے ہیں' مگر میں اسے دو مرحلوں میں تقسیم کرتا ہوں) وہ ہے نفسیاتی اور ذہنی ارتقاء یا Psychological and Intellectual Evolution کا مرحلہ۔ میرے نزدیک اسی مرحلے کا انتہائی عروج حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین اس کو نبی اکرم ﷺ تک لے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

تین نسبتیں ہیں: (i) خلیل اللہ (ان تین نسبتوں میں سے ''خلیل اللہ'' کی نسبت بہت اہم ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا ((لَو کُنتُ مُتَّخِذًا خَلِیلًا لَاتَّخَذتُ اَبَابَکرٍ خَلِیلًا)) ''اگر میں (انسانوں میں سے) کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا''۔ اس حدیث سے دو عظیم حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ انبیاء کے علاوہ انسانوں میں سے عظیم ترین انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ بھی اس مقام پر نہیں کہ جس کو خلیل کہا جا سکے۔ ''خلیل'' وہ لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبرٰھِیمَ خَلِیلًا﴾ (النساء:125) یعنی ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔'' (ii) امام الناس اور (iii) ابوالانبیاء یعنی ان کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام انہی کی نسل سے ہوئے ہیں چاہے وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں، چاہے بنی اسمٰعیل میں سے ہوں یا بنی مدین میں سے۔

محمد رسول اللہ ﷺ پر رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک معاشرے کو وہاں تک بلند کر دیا جہاں تک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رفعت عطا فرمائی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی، اسی طرح ہود اور شعیب علیہما السلام کی قومیں ہلاک ہوئیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ قوم کو بلندی تک لے گئے اور ایک معاشرہ قائم کیا۔ یہ وہ کمال ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے کر دکھایا ہے۔

اب اس سے اگلی بات وہ ہے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بیان کیا ہے۔ ارتقاء کا اب صرف ایک امکانی phase اور ہے، یعنی Globalization of the Revolution of Muhammad S.A.W.S۔ مطلب یہ کہ دنیا کا عمرانی ارتقاء اس انتہا کو پہنچ جائے گا جس کی جھلک محمد رسول اللہ ﷺ نے دکھائی تھی اور نوعِ انسانی کی اجتماعی یادداشت میں جس کو ایک خوشگوار خواب کی حیثیت حاصل ہے، آپ ﷺ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا اس کی بنیاد پر 1937ء میں گاندھی نے اپنے اخبار ''ہریجن'' میں ایک مقالے میں کانگریسی وزراء کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: ''میں آپ لوگوں کے سامنے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مثال پیش کرتا ہوں''۔ نبی اکرم ﷺ نے جو نظام قائم کیا وہاں تک تو ابھی انسانی فکر پہنچ بھی نہیں سکی ہے۔ علامہ اقبال نے صورتِ حال کی صحیح صحیح تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو\
آں کہ از خاکش بروید آرزو\
یا زنورِ مصطفی ﷺ او را بہا ست\
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفی ﷺ ست!

(جہاں جہاں تم کو رنگ و بو کی ایسی دنیا نظر آتی ہے جس کی خاک سے آرزو کا پودا پھوٹتا ہے، اس دنیا کی رونق یا تو مصطفی ﷺ کے نور سے ہے یا وہ دنیا ہنوز مصطفی ﷺ کی تلاش میں ہے۔)

گویا انسانیت کے دامن میں جو خیر اور بھلائی ہے وہ نورِ مصطفی ﷺ ہی سے مستعار ہے' یا پھر انسانیت ابھی اس طرف جا رہی ہے جہاں محمد ﷺ نے اسے چودہ سو برس پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔ یہ ہے ارتقاء کی آخری منزل' لٰہذا فلسفۂ ارتقاء کے حوالے سے بھی ''نظام خلافت'' کا احیاء لازمی ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر سے نظام خلافت تک

اب ہم ایک اور اعتبار سے غور کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں نئے عالمی نظام کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ خلیج کی جنگ کے بعد اس کا شور کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے فاصلے معدوم ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری دنیا نے ایک شہر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اسی وجہ سے سوچا جا رہا ہے کہ پوری دنیا کے لیے کوئی ایک نظام بھی تو ہونا چاہیے۔ اسی غرض سے پہلی جنگ عظیم کے بعد League of Nations وجود میں آئی تھی' لیکن چونکہ اس نظام کے لیے انسان کے پاس کوئی فکری بنیاد نہیں تھی' لٰہذا وہ جلد ہی ناکام ہو گئی۔ (اس ''جمعیت اقوام'' کے بارے میں اقبال نے تبصرہ کیا تھا:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے!)

''انجمن اقوام'' کی ناکامی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک اور ادارہ تنظیم اقوام متحدہ (United Nations Organization) کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ بھی عالمی نظام کے قیام کی ایک کوشش ہے۔ مگر یہ ادارہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ اب اس کی حیثیت امریکہ کے گھر کی لونڈی سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ اب یہ نیو ورلڈ آرڈر آیا ہے' یہ بھی اسی ارتقاء کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔ اگرچہ یہ نیا عالمی نظام ابھی تک پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکا' تاہم عالم اسلام پورے کا پورا اس کی گرفت میں آ چکا ہے۔ البتہ چین' جاپان اور شمالی کوریا کو زیر نگیں کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

یہ New World Order. درحقیقت Jew World Order ہے۔ 1897ء میں پروٹوکولز کا جو نقشہ ''صہیونی اکابر'' (Elders of the Zion) نے بنایا تھا' وہی تدریجاً روبعمل آ رہا ہے۔ (i) صہیونی اکابر تینتیسویں مرتبہ پر فائز یہودی دانشوران کے کئی خفیہ اجلاس 1897ء سے منعقد ہونا شروع ہوئے۔ (ii) صہیونی اکابر کے خفیہ اجلاس میں ساری دنیا پر یہود کی حکومت قائم کرنے کے لیے جو خفیہ دستاویز تیار کی گئی تھی وہ

''پروٹوکول'' کے مختصر نام سے معروف ہے۔اس کا پورا نام'' The Protocols of the Elders of the Zion '' ہے۔اس دستاویز میں 24 دفعات ہیں۔اس خفیہ دستاویز کو پہلے دو روسی اخباروں نے شائع کیا' پھر عیسائی پادریوں نے 1905ء میں اس یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے شائع کیا۔اس کا نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہود اس دستاویز کو عام نہیں ہونے دینا چاہتے اور جہاں بھی اس کے نسخے ملتے ہیں انہیں ضائع کرنے کے درپے رہتے ہیں' تاکہ غیر یہود ان کی سازشوں سے بے خبر رہیں۔) 1917ء کا اعلانِ بالفور (جنگ عظیم اوّل میں برطانوی وزیر خارجہ' جس نے جنگ میں یہودی امداد کے معاوضہ میں بعد ازاں فلسطین میں یہودی حکومت (اسرائیل) کے قیام کا اعلان کیا تھا۔) پھر 1948ء میں اسرائیل کا قیام' 1967ء میں عربوں سے جنگ اور اسرائیل کی فتح' یہ سارے واقعات ایک تدریجی عمل کا حصہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسرائیل یروشلم کے سوا تمام معاملات پر گفتگو کے لیے تیار ہے۔''جریکو میں اپنی قومی حکومت بنا لو'' ''غزہ میں بھی self-rule لے لو'۔غرض ''سب کچھ منظور ہے' مگر بات نہیں ہوگی تو یروشلم کے بارے میں' یہ ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔''

میرے نزدیک تو شاید چند سال کی بات ہے کہ مسجد اقصیٰ گرائی جائے گی۔ یہود اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔تقریباً دو ہزار سال سے ان کا یہ ''کعبہ'' گویا گرا پڑا ہے۔اسرائیلی وہاں جاتے ہیں اور رو دھو کر واپس آجاتے ہیں' وہاں جا کر دیوارِ گریہ سے سر ٹکراتے ہیں۔اگرچہ یہ ٹکریں علامتی (symbolic) ہوتی ہیں' تاہم movement تو ایسی ہی بناتے ہیں جیسے کہ سچ مچ ہی ٹکریں مار رہے ہوں۔اب وہ اسے تعمیر کریں گے۔مسجد اقصیٰ اب ان کے لیے گرانا مشکل نہیں رہا' اس لیے کہ بابری مسجد گرا کر انہوں نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا ہے کہ ان میں کوئی جان نہیں ہے۔بس عالم عرب کے کچھ جوشیلے نوجوان احتجاج کے لیے کھڑے ہوں گے۔انہیں بھوننے کے لیے اسرائیل کو اپنی گولیاں بھی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے لیے حسنی مبارک موجود ہے' شاہ فہد صاحب ہیں' اور بھی جو اُردن اور مراکش کے بادشاہ اور الجزائر کے ڈکٹیٹر ہیں۔اس فہرست میں اب پی ایل او کے صدر یاسر عرفات کا اضافہ ہو گیا ہے۔اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ نکال رہا ہوں کہ New World Order جو درحقیقت Jew World Order ہے وہ ایک دفعہ تو قائم ہوگا' لیکن قائم ہونے کے بعد اسے Just World Order of Islam میں بدلنا اگلا قدم ہوگا۔

اس تبدیلی کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔فرض کیجیے آپ کو سو آدمیوں کو مسلمان بنانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔اب اگر یہ سو آدمی بالفرض ایک آدمی کی شکل اختیار کر لیں یا کسی ایک آدمی کا مسلمان ہونا سب کے مسلمان ہونے کا وسیلہ بن جائے تو آپ کا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھئے دنیا عالمی نظام کی طرف جا رہی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالمی نظام کو اسلام کی طرف لانا صرف ایک shift

over کی بات رہ جائے گی۔ اس طرح نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی خبر کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔ وہ اسلام کا عالمی نظام ہوگا اور اسی نظام کو حضور ﷺ نے ''خلافت علیٰ منہاجِ النبوۃ'' کا نام دیا ہے۔

دورِ سعادت سے پہلے

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ بہت ہی خوش آئند ہے کہ اللہ کا دین پورے کرۂ ارض پر غالب ہوگا۔ لیکن اس عظیم کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کن تکلیف دہ حالات سے گزرنا ہوگا اور گوہر بننے سے قبل قطرے پر کیا کچھ گزرے گی' یہ دردناک باب ہے۔ اس کی خبریں بھی نبی کریم ﷺ نے ہمیں دی ہیں۔ افسوس کہ ان احادیث کی طرف ہمارا رجحان ہی نہیں ہے۔ عوام کا تو خیر ذکر ہی کیا' کئی علماء نے بھی مجھے بتایا کہ ''یہ جو کتب احادیث کے آخر میں ''کتاب الفتن''، ''کتاب الملاحم'' اور ''علامات الساعۃ'' کے عنوان سے ابواب آتے ہیں ہم انہیں پڑھتے ہی نہیں۔ علماء کا سارا زور احادیث کے فقہی مباحث پر صرف ہو جاتا ہے۔ احادیث صحیحہ اور متواترہ میں جو خبریں اور پیشین گوئیاں موجود ہیں' ان سے صرفِ نظر کا کیا جواز ہے؟ بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ اللعنہ نے احادیثِ نزولِ مسیح علیہ السلام کی جو توجیہہ کی اور پھر خود ہی مسیح بن بیٹھا' اس سے عام مسلمان کہتے ہیں کہ ان باتوں کو سرے سے چھوڑ ہی دو' ان میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے جس سے اہل فتنہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ باتیں جو نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہیں بہت اہم ہیں' ان سے استغناء برتنا گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ کو کم کرنا ہے۔ بہرحال احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو آنے والا وقت مغربی سامراج کی غلامی سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔

میں اپنی بات کو اگر ایک جملے میں بیان کروں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ عالمی خلافت سے قبل دو مسلمان اُمتوں کو ان کی سزاؤں کی آخری قسط ملنی ہے۔ اس جملے کی مختصر تشریح کے سلسلے میں پہلا سوال تو یہی ہے کہ وہ دو مسلمان اُمتیں کون سی ہیں؟ ذرا سورۃ النور کی آیت 55 جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے' اس پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

﴿...لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ...﴾

''......ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے......''

گویا پہلے بھی ایک اُمتِ مسلمہ تھی۔ اگر میری بات کا غلط مفہوم نہ لیا جائے تو کہوں گا کہ بعض اعتبارات سے سابقہ اُمتِ مسلمہ ہم سے افضل تھی' جس طرح جزوی فضیلت تو کسی نبی کو حاصل ہو سکتی ہے' لیکن کلی اور مطلق فضیلت محمد عربی ﷺ ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ سابقہ امت مسلمہ کے لیے قرآن حکیم میں دو جگہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (البقرہ: 47' 122)

''میں نے تم کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔''

جبکہ ہمارے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف یہ ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ...﴾ (البقرہ:143)

''اور ہم نے تم کو 'اُمتِ وسط' بنایا۔''

دونوں آیات کے تیور اور کلمات کے فرق کو دیکھئے!

اس کے علاوہ یہ پہلی اُمت وہ اُمت ہے جس میں 1400 برس تک نبوت کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ 1400 قبل مسیح میں دو رسولوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے یہ سنہری زنجیر شروع ہوئی اور اس زنجیر کے اختتام پر بھی دو ہی نبی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام موجود تھے۔ اس سنہری زنجیر کے درمیان جب بھی کوئی نبی فوت ہوا تو کوئی نبی ہی اس کا جانشین بنا۔ اس سابقہ امت کی تاریخ 2400 برس پر محیط ہے۔ 1400 قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تھی۔ بنی اسرائیل تو پہلے بھی موجود تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے درمیان کسی نبی کا تذکرہ نہیں ملتا' (قرآن حکیم کی ایک آیت سے بھی اشارہ نکلتا ہے کہ دونوں... حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ... کے درمیان کوئی دوسرا نبی نہیں تھا۔ آلِ فرعون میں سے ایک مومن کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا﴾ (غافر:34) ''یہاں تک کہ جب وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) وفات پا گئے تو تم یہ کہنے لگے اب اُن کے بعد اللہ کوئی اور رسول نہیں اٹھائے گا۔'') لیکن بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تو موجود تھے۔ پھر تورات ملنے کے بعد ان کو اُمت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا﴾
(بنی اسرائیل:2)

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کا رہنما بنایا کہ (دیکھو) میرے سوا کسی کو سرپرست نہ بنانا۔''

گویا یہاں سے اُمت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس اُمت کو ایک ہی کتاب نہیں دی گئی بلکہ کئی کتابیں دی گئیں۔ دو کتابیں تو وہ ہیں جن پر ہمارا ابھی ایمان ہے' زبور اور انجیل --- ان کے علاوہ متعدد صحیفے بھی عطا کیے گئے۔

یہ ہے وہ سابقہ اُمتِ مسلمہ جس کی فضیلت کے لیے قرآن حکیم میں مذکورہ بالا آیت دو مقام پر آئی ہے۔ بالکل اسی طرح دو ہی دفعہ یہ مضمون بھی آیا ہے:

﴿وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:61)

''ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

یہی مضمون سورۃ آل عمران (آیت 112) میں الفاظ کی ذراسی تبدیلی کے ساتھ آیا ہے۔
ایک طرف ان کو یہ فضیلت دی گئی اور دوسری طرف وہی قوم مغضوب وملعون قرار پا گئی۔ سورۃ الفاتحہ کے کلمات الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی تفسیر میں سب متفق ہیں کہ ان سے مراد یہود ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط
(المائدۃ:78)

''داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں پر لعنت کی گئی جنہوں نے کفر کیا۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ دراصل اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کچھ قوانین ہیں جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کے سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ دنیا افراد کے لیے دارالجزاء نہیں ہے' جب کہ قوموں کے لیے دارالجزاء ہے۔ افراد کے لیے عذاب وثواب کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ آخرت میں ہر شخص انفرادی حیثیت میں آئے گا' لیکن اقوام کے گناہوں کا حساب اکثر و بیشتر اس دنیا میں ہی چکا دیا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

قوموں پر دوطرح کے عذاب آتے ہیں۔ ایک بڑا عذاب' جسے قرآن مجید ''العذاب الاکبر'' کہتا ہے' اسے عذاب استیصال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس عذاب میں قوموں کا نام ونشان مٹا دیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ عذاب صرف ان قوموں پر آتا ہے جن کی طرف کسی رسول کو مبعوث کیا گیا ہو اور قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیا ہو۔ قومِ نوح علیہ السلام' قومِ صالح علیہ السلام' قوم ہود علیہ السلام' قومِ شعیب علیہ السلام' قومِ لوط علیہ السلام اور آلِ فرعون اسی عذابِ استیصال سے دوچار ہوئے، اور یہ چھ مثالیں قرآن مجید میں پندرہ مرتبہ بیان کی گئی ہیں۔

اس سے کم درجے کا عذاب آتا ہے اُس مسلمان اُمت پر جو زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے' حامل کتابِ الٰہی ہونے اور وارثِ علومِ نبوت ہونے کے باوجود اپنے عمل سے اپنے دعووں کی تکذیب شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا مجرم کوئی نہیں۔ باقی نوعِ انسانی کی گمراہی اور جرائم کی ذمہ دار بھی یہی قرار پاتی ہے' کیونکہ پیغامِ حق پہنچانا اس کا فرض تھا۔ اگر وہ یہ پیغامِ حق بے کم وکاست پہنچا دیتی اور پھر دنیا نہ مانتی تب تو انکار کرنے والے مجرم قرار پاتے اور وہ اُمت بریٔ الذمہ سمجھی جاتی۔ مگر جب اس اُمتِ مسلمہ نے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا تو اب مجرم وہ خود بن گئی کہ اللہ کی زمین پر اس کی نمائندگی کی دعویدار بھی ہے اور عمل اس کے برعکس ہے۔

اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔ اسی کی پاداش میں وہ عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر آیا اور جو اُمت محمد ﷺ پر آیا۔

اس موقع پر میں ایک عظیم حدیث مبارکہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں' جو دراصل بہت بڑے خزانے کی کلید ہے۔ یہ حدیث سنن الترمذی میں وارد ہوئی ہے اور اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت پر وہ سارے حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتی کا تلا دوسری جوتی کے بالکل مشابہ اور برابر ہوتا ہے۔'' حضور ﷺ کی فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے۔ جوتی کا جوڑا اگر اوپر سے دیکھا جائے تو ان کے چھوٹے بڑے ہونے کا فرق نظر نہ آئے گا' لیکن جب ان کے تلے جوڑ کر دیکھا جائے گا تو جوڑی کا فرق معلوم ہو جائے گا' اور اگر صحیح جوڑی ہوئی تو دونوں کے تلووں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس حدیث کے کلید ہونے کی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ نبی ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل پر دو عروج کے دور آ چکے تھے اور زوال کے بھی دو ہی دور بیت چکے تھے۔ سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں ان دو ادوار کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَ قَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِى الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا كَبِيۡرًا﴾ (40)

پہلے آشوریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی حکومت ختم ہوئی۔ اس کے بعد کلدانیوں کے ہاتھوں تباہی آئی۔ چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں چھ لاکھ انسان یروشلم میں قتل ہوئے اور چھ لاکھ کو وہ قیدی بنا کر لے گیا۔ یروشلم میں ایک متنفس نہیں چھوڑا۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے ہموار کر دیا۔ اس کی بنیادیں تک کھود کر پھینک دیں۔ اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے توبہ کی دعوت و منادی دی' جس پر یہ جاگے اور اللہ کے حضور توبہ کی۔ تب سائرس کے ہاتھوں اللہ نے انہیں بابل کی اسیری سے نجات دلائی۔ اس کے بعد یہ یروشلم آئے اور ہیکل سلیمانی' جو ان کے ہاں کعبے کا درجہ رکھتا ہے' دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ ان کا دوسرا دورِ عروج ہے۔ لیکن انہوں نے پہلے کی طرح پھر کتاب اللہ کو پیٹھ دکھائی' عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہوئے اور طاؤس و رباب میں غرق ہو کر تباہی کے اسی راستے پر چل پڑے جس کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل' طاؤس و رباب آخر!

لہٰذا پھر عذاب کا کوڑا برسا۔ یہ عذاب کا کوڑا پہلے یونانیوں' پھر رومیوں کے ہاتھوں برسا۔ پہلے دور میں سزا آشوریوں کے ہاتھوں آئی جو شمال سے آئے تھے' پھر مشرق سے کلدانی آئے۔ بخت نصر بابل کا بادشاہ تھا۔ دوسرے دور میں پہلے عذاب کے کوڑے یونانیوں کے ہاتھوں برسے اور پھر رومیوں کے ہاتھوں۔ 70ء میں

ٹائیٹس رومی نے جو حملہ کیا اس میں ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل ہوئے' باقی یہودیوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ اُس وقت کے بعد سے اب جا کر اس صدی میں انہیں اپنا گھر نصیب ہوا ہے۔ یروشلم میں ان کا داخلہ بند تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا تب جا کر انہیں یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ''open city'' قرار دیا' ورنہ پورے ساڑھے پانچ سو برس تک کوئی یہودی اپنے مقدس شہر میں داخل بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال یہ ہے اس وقت تک کی تاریخ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورۃ آل عمران (آیت 49) میں ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے رسول''۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر دیا' بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر چڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ لہٰذا اُسی وقت سے یہ قوم عذابِ استیصال کی مستحق ہو چکی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل ہی کے دوسرے رکوع میں آیا ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: 15)

''ہم اُس وقت تک عذابِ (استیصال) نہیں نازل کرتے جب تک ہم اپنا رسول نہ بھیج دیں۔''

جیسا کہ واضح کیا گیا کہ رسول آ چکا اور انہوں نے اس کو رد بھی کر دیا' لیکن ایک خاص سبب سے اس قوم پر اس طرح کے عذاب کی نہ اُس وقت تنفیذ ہوئی نہ اب تک ہوئی۔ بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں ان کے لیے ایک رحم کی اپیل (mercy appeal) کا موقع پیدا کیا۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹﴾

یعنی اب بھی دامنِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لے لو' قرآن پر ایمان لے آؤ جو ہر معاملے میں سیدھا راستہ دکھانے والی کتاب ہے' ہم اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لیے تیار ہیں۔ افسوس! یہود نے اس mercy appeal کا موقع بھی گنوا دیا' لیکن اس کے باوجود ''العذاب الاکبر'' کی execution نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ یہ اس داستان کا تلخ حصہ ہے۔ اس لیے کہ پہلے موجودہ مسلمان اُمت کے افضل حصے (عالم عرب) کی پٹائی اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں کروانی ہے۔

اُمتِ مسلمہ کے عروج وزوال کی تاریخ

اب ہم اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس اُمت پر بھی بعینہٖ عروج وزوال کے وہی چار دور آ چکے ہیں جو تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا پہلا دورِ عروج عربوں کی زیر قیادت آیا۔ اس پہلے دور میں خلافت راشدہ کا سنہری دور بھی شامل ہے۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ ختم ہوگئی مگر مسلمانوں کی حکومت موجود رہی۔ اس کے بعد پہلا دورِ زوال صلیبیوں کے ہاتھوں آیا۔ 1099ء میں یروشلم ہاتھ سے نکل گیا اور لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ اس کے بعد 1258ء میں وہ فتنۂ تاتار آیا جس میں کروڑوں مسلمان قتل کر دیے گئے' ان کی عظیم مملکت تہس نہس کر دی گئی۔ 1258ء میں بغداد کا سقوط ہوا۔ بنوعباس کے آخری خلیفہ کو محل کے اندر سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور جانور کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑوں کے سموں تلے کچلوا دیا گیا۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے مرثیہ کہا تھا: ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنیں!

(امیر المومنین مستعصم باللہ کی سلطنت کے زوال پر آسمان کو حق ہے کہ وہ زمین پر خون کے آنسو برسائے۔)

دیکھئے دونوں اُمتوں کی تاریخ میں کتنی گہری مشابہت ہے' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاربن کاپی ہو۔ وہاں پہلے شمال سے آشوری آئے تھے' جب کہ یہاں پہلے یورپ یعنی شمال سے صلیبی آئے۔ وہاں مشرق سے کلدانی آئے تھے' جب کہ یہاں مشرق سے تاتاری آئے۔ وہاں لاکھوں انسانوں کا خون بہا' یہاں کروڑوں انسان تہ تیغ ہوئے (موجودہ اُمتِ مسلمہ کی وسعت کے لحاظ سے اس کے کروڑوں سابقہ اُمت مسلمہ کے لاکھوں کے برابر ہی ہیں)۔

اس زوال کے بعد ہمارا دوسرا دورِ عروج شروع ہوا: ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جن کے ہاتھوں پٹوایا تھا انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا پرچم تھما دیا۔ یہ دوسرا عروج سلطنتِ عثمانیہ کا دور ہے۔ چار سو برس تک خلافت کا یہ ادارہ قائم رہا۔ اسے گویا بنی اسرائیل کی مکابی سلطنت کا دور سمجھئے۔ پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔

سابقہ اُمتِ مسلمہ پر بھی عذاب کا دوسرا مرحلہ یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا تھا' موجودہ اُمت پر بھی یورپی سامراج (European Imperialism) کا تسلط ہوا۔ سابقہ اُمتِ مسلمہ پر پہلے یونانی حملہ آور ہوئے پھر

رومی آئے' جب کہ ہم پر ولندیزی' انگریز اور اطالوی قوموں نے تسلط پالیا۔

جو چار ادوار سابقہ امت مسلمہ پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت تک مکمل ہوئے تھے وہ اس امت پر رواں صدی کے آغاز میں پورے ہو گئے۔ سابقہ اُمت مسلمہ کے لیے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ﴿وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا﴾ (بنی اسرائیل: 8) یعنی ''اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم تم کو سزا پر سزا دیتے رہیں گے''۔ چنانچہ ان کی سزا جاری رہی یہاں تک کہ صرف اسی صدی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہٹلر نے قتل کیا۔ انسانی تاریخ میں پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ انسانی لاشوں کو تلف کرنے کے لیے پلانٹ بنائے گئے ہوں۔ ایک طرف سے لوگ gas chamber میں داخل ہو رہے ہیں' کپڑے اتروا لیے گئے ہیں' ننگے داخل کیے جا رہے ہیں' مرتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پٹوں کے اوپر لاشیں جا رہی ہیں اور آگے جا کر مشینیں ان لاشوں کو چارے کی طرح کاٹ رہی ہیں... بعد میں انہیں کیمیکل سے treat کیا جا رہا ہے' اس لیے کہ اتنی لاشوں کو ٹھکانے (dispose off) کیسے لگایا جائے۔ کون اتنی قبریں کھودے اور کون جلانے کی مصیبت اپنے سر لے۔ آخر میں ان پلانٹوں سے ایک سیاہ بدبودار مائع نکلتا تھا جس کو وہ اپنے کھیتوں میں کھاد کے طور پر پہنچا دیتے تھے! یہ سب اسی بیسویں صدی کی بات ہے۔

اس ضمن میں جو تلخ ترین بات مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ''کاربن کاپی'' ابھی اُمت مسلمہ پر آنے والی ہے' اس لیے کہ حضور ﷺ کی حدیث جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہم کو مغربی استعماریت سے نجات دلا دی ہے' لیکن ہم اب زیادہ بڑے امتحان میں ڈال دیے گئے ہیں۔ پہلے تو (بطور عذر) ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم انگریزوں' فرانسیسیوں اور اطالویوں کے غلام ہیں' اب تو غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن غلامی کے خاتمے کے باوجود دنیا میں کوئی مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس نظام کو قائم کر لیا ہو جو محمد رسول اللہ ﷺ کی امانت و وراثت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہے۔ لہٰذا امتحان میں اس ناکامی کا نتیجہ تو نکلنا ہی ہے۔

خروجِ دجال بھی سامنے کی بات ہے۔ یہودیوں کو ابھی عظیم تر اسرائیل قائم کرنا ہے۔ اس کے نقشے میں تقریباً آدھا جزیرہ نمائے عرب موجود ہے۔ مدینہ سمیت سعودی عرب کے کچھ حصے اور مصر کے پورے زرخیز علاقے پر ان کا دعویٰ ہے۔ عراق میں وہ اسیری میں رہے ہیں اس لیے اس پر بھی ان کا دعویٰ ہے اور شام تو ان کی ارضِ موعود ہے۔ ترکی کا مشرقی حصہ بھی ان کے نقشے میں شامل ہے۔ ایک طرف ان کے یہ عزائم ہیں اور دوسری طرف کوئی مزاحمت سرے سے موجود ہی نہیں۔ عالم عرب میں سے کس میں دم ہے؟ عراق کے کچھ ''ایٹمی دانت'' نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تھا' لہٰذا اسرائیل نے سعودی عرب کی فضائی حدود سے گزر کر عراق کے ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیے اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ خلیج کی جنگ میں نکل گئی۔ امریکی فوجی جنرل شوارزکوف نے صاف کہا ہے کہ ہم نے یہ جنگ لڑی ہی اسرائیل کی حفاظت کے لیے ہے۔

نزولِ مسیح علیہ السلام اور خروجِ دجال

حدیث مبارکہ میں جس "اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی" (جنگِ اعظم) کا ذکر ہے اس کے بارے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ اتنے انسان قتل ہوں گے کہ ایک پرندہ اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے سوائے لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا' یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر گرے گا تو لاشوں پر ہی گرے گا۔

اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی' خروجِ دجال اور دجالی فتنے سے مراد کیا ہے؟ ایک چیز دجالی فتنہ ہے' اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اس فتنے میں تو ہم سب اس وقت مبتلا ہیں۔ ایک "اَلْمسیح الدّجال" ہے۔ یہ درحقیقت ایک یہودی ہوگا۔ اس کا دعویٰ یہ ہوگا کہ "میں مسیح ہوں۔" یہ دعویٰ وہ اس بنیاد پر کرے گا کہ یہود کے ہاں ایک "مسیحا" کے بارے میں پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہودی اس کو اپنا نجات دہندہ مانتے آ رہے تھے۔ وہ نجات دہندہ دراصل حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام تھے جن کی بعثت ہو بھی چکی' لیکن یہود نے ان کا انکار کر دیا بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر ہی چڑھا دیا' لہٰذا ان کے "مسیحا" کی جگہ یہود کے خیال میں اب بھی خالی ہے۔ اب کوئی شخص یہود میں سے عظیم تر اسرائیل قائم کرنے کا عزمِ مصمم لے کر اٹھے گا۔ اس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

اس طرح خود یہود میں سے خروجِ دجال ہوگا اور پھر "خونِ اسرائیل" نہیں خونِ اسمٰعیل جوش میں آئے گا۔ محمد رسول اللہ ﷺ جو اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں سے ہیں' کی اُمت میں سے وہ عظیم قائد اٹھے گا جو مہدی کے نام سے مشہور ہے (اگرچہ مہدی اس کا نام نہیں' صفت ہے)۔ میں نے دانستہ "ظہورِ مہدی" کے الفاظ کے بجائے "عظیم قائد" کا لفظ استعمال کیا ہے' تاکہ اہلِ تشیع کے امام غائب کے ظہور کی طرف اشارہ نہ سمجھا جائے۔ ہمارے نزدیک عالمِ عرب سے ایک قائد ابھرے گا' اس کی قیادت میں مسلمان صالحین وہ جنگ کریں گے کہ آسمان سے بھی مدد آئے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور یہ اصل عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے جو اس جعلی مسیح کو مقامِ لد پر قتل کریں گے۔ یہی وہ مقام ہے جو اس وقت "لڈا" کے نام سے اسرائیل کا سب سے بڑا ایئر بیس ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب توڑ دیں گے' گویا صلیب کا عقیدہ ختم کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ مجھے تو کسی نے صلیب پر نہیں چڑھایا تھا' مجھے تو اللہ لے گیا تھا' اللہ ہی نے دوبارہ اتار دیا' تمہارا یہ عقیدۂ صلیب باطل ہے۔ اس کے علاوہ آپ علیہ السلام خنزیر کو قتل کر دیں گے' گویا خنزیر کو حرام قرار دے دیں گے۔ شریعتِ موسوی علیہ السلام اور شریعتِ محمدی ﷺ مل کر دنیا پر چھا جائیں گی اور اس طرح پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے بہت بڑی سزا اُمتِ محمد ﷺ بالخصوص اس کے سب سے افضل حصے کو مل کر رہے گی' اس اصول پر کہ: ع جن کے رُتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے۔ عربوں کا رتبہ بلند ہے کہ نبی اکرم ﷺ انہی میں سے تھے۔ پھر اللہ کی آخری کتاب ان کی زبان میں نازل ہوئی۔ ہمیں قرآن سمجھنے کے لیے بڑی محنت کرنی ہوتی ہے' جبکہ عربی ان کی مادری زبان ہے۔

دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک ارب کی تعداد میں غیر عرب ہیں جبکہ عربوں کی تعداد پچیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر عرب مسلمانوں میں سے چالیس کروڑ تو جنوبی ایشیا' برعظیم پاک و ہند میں رہتے ہیں۔ ان چالیس کروڑ میں سے دس کروڑ مسلمانانِ پاکستان ہیں۔ دس' گیارہ کروڑ بنگلہ دیش میں ہوں گے' جب کہ بھارت میں کم از کم اٹھارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں (1994ء تک)۔ عالم اسلام میں ثقافتی مراکز بھی دو ہی رہے ہیں۔ عربوں کے لیے ثقافتی مرکز مصر اور عجمی مسلمانوں کے لیے یہ برعظیم رہا ہے۔ ایک ہزار سال تک سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے' جبکہ چار سو سال سے سارے مجددین برعظیم پاک و ہند میں پیدا ہوئے۔ اسلام کے نام پر تحریک اسی برعظیم میں چلی جس کا نتیجہ قیامِ پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں ہوں۔ ایک اعتبار سے پوری اُمتِ مسلمہ میں عربوں کے بعد سب سے بڑے مجرم ہم ہیں' اس لیے کہ ان کے بعد فضل بھی سب سے زیادہ ہم پر ہی ہوا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں عظیم شخصیات یہیں سے اُبھریں۔ علامہ اقبال جیسا مفکر یہاں پیدا ہوا' جس کے پائے کی شخصیت پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی۔ پوری دنیا میں صرف یہی ایک ملک ایسا ہے جو اِس دور میں اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام معجزے سے کم نہیں ہے۔ چند مہینے پہلے جو گاندھی یہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان میری لاش پر ہی بن سکتا ہے' اسے پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا۔ بہرحال پاکستان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

Hope for the best and be prepared for the worst.

''امید بہترین کی رکھو لیکن بدترین (حالات) کے لیے تیار رہو۔''

پاکستان میں خلافت کا احیاء

تاہم ایک بات میں تیقّن سے کہہ سکتا ہوں کہ خلافت کا احیاء شروع یہیں سے ہوگا۔ اس لیے کہ پوری اسلامی دنیا میں صرف اور صرف یہ ملک ایسا ہے جس میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی اور دس کروڑ عوام کی اسمبلی نے اعلان کیا کہ ہم حاکمیت سے دستبردار ہوتے ہیں' حاکمیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں وہ ایک امانت ہیں اور یہ انہی حدود کے اندر اندر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے مقرر کر دی ہیں۔ دنیا کے باقی تمام ممالک کے دساتیر میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی ملک کے سرکاری مذہب کا نام اسلام لکھ دیا گیا ہے' جو بہت محدود اور مبہم بات ہے۔

تبدیلی تو یہیں سے آئے گی' لیکن اس تبدیلی کی عملی صورت Hope for the best کے مصداق یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے اور بغیر کسی مزید عذاب اور سزا کے ہم اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ اور یہ توبہ کرنے والے اتنی معتد بہ تعداد میں ہوں جو جمع ہو کر یہاں پر انقلاب برپا کر دیں۔ معدودے چند افراد کی توبہ سے تو ظاہر ہے کہ کام نہیں چلے گا۔ اگرچہ اس توبہ کا آغاز بہرحال افراد سے ہوگا کہ ع ہر فرد ہے

ملت کے مقدر کا ستارا!

مگر کیا اجتماعی توبہ کی یہ توفیق ہم کو نصیب ہوگی؟ عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پچیس سال پہلے برس چکا ہے، مگر ہم ایک بار پھر اس عذاب کے مستحق بن چکے ہیں۔ تاریخ سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ عذاب کا وہ کوڑا کوئی معمولی تو نہ تھا۔ بدترین شکست ہوئی، پاکستان دولخت ہوا، 93 ہزار فوجی اور سویلین اس ہندو کی قید میں گئے جس پر ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو مزید مہلت دی، مگر افسوس! حالات اس طرف جا رہے ہیں کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو نہ دہرائے۔ کسی قوم پر جب عذاب کے آثار شروع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ٹلا نہیں کرتا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے، جس نے عذاب کے نمایاں آثار دیکھ کر اجتماعی توبہ کی اور اس کے نتیجے میں آتا ہوا عذاب ٹل گیا۔ یہی ایک راستہ مسلمانانِ پاکستان کے لیے بھی ہے کہ اجتماعی توبہ کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ کوئی پہلے سے بھی زبردست کوڑا ہماری پیٹھ پر برسے گا۔

تبدیلی کی دوسری عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عذاب کے اس دوسرے کوڑے کے بعد ہم ہوش میں آ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا مبارک کوڑا ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝﴾

(السجدۃ:21)

''ہم انہیں آخری بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے، شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔''

اسی چھوٹے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پڑا تھا، لیکن دو ہزار میل دور ہونے کی وجہ سے ہم نے محسوس ہی نہیں کیا۔ کتنے لوگ مرے، کتنی عصمتیں لٹیں اور کتنے گھر اجڑ گئے، اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈھائی تین لاکھ پاکستانی ابھی تک وہیں پڑے ہیں اور جانوروں سے بدتر حالت میں ایک ایک کوٹھڑی میں پندرہ پندرہ انسان رہ رہے ہیں! مگر ہم بہرحال مکمل تباہی سے بچ گئے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تازہ مہلتِ عمل (Fresh lease of existence) عطا کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکسن کا دل موڑ دیا، اُس نے ہاٹ لائن پر بھارت کو الٹی میٹم دے ڈالا۔ کوسیجن نے بھی اندرا گاندھی کو حکم جاری کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مداخلت نہ ہوتی تو پھر جو تباہی آنی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا morale آسمان پر تھا جب کہ ہمارا پاتال میں۔ ہماری فضائیہ مفلوج ہو چکی تھی، ہمارے جہاز تو حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ روس کے دیے ہوئے اواکس طیارے بھارت کو پاکستان میں اڑنے والی چڑیا کی بھی خبر کر دیتے تھے۔ وہ ہماری بحریہ کو کیماڑی میں مار کر چلے گئے تھے۔ ہمارا زمینی دفاع ٹوٹ چکا تھا سوائے ہیڈ سلیمانکی کے۔ شکر گڑھ اور راجستھان میں ہمارا محاذ ٹوٹ چکا تھا۔ ان حالات میں امریکہ اور روس کے صدور کی مداخلت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو

پھیرنے کی قوت کا ظہور تھا اور مغربی پاکستان کا بچ جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت کا مظہر ہے۔

بھارت میں ہندومت کا اِحیاء

پاکستان کی تبدیلی کے حوالے سے تیسری اور آخری بات بہت بھاری دل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ بھارت میں ہندومت کا احیاء بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ایودھیا کی مسجد گرانے کے لیے بھارت کے طول وعرض سے جو تین لاکھ کارکن پہنچے' ان کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے مگر مسلمانوں کو کہیں بھی گزند نہ پہنچایا۔ یہ کام ڈسپلن کے بغیر ممکن نہیں۔ نرے ہجوم کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اعلیٰ تربیت یافتہ اور منظم کارکن تھے۔ ان کا بس ایک ہی مقصد تھا' بابری مسجد کو منہدم کرنا۔ وہ گرائی اور واپس چلے گئے۔ فسادات جو ہوئے بعد میں ہوئے' جب مسلمانوں نے احتجاجی تحریک چلائی۔

میں یہ حقائق چھ سال کے عرصے سے بتا رہا ہوں کہ آر ایس ایس میں 25 لاکھ کارکن موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد اسلام اور پاکستان کا خاتمہ ہے۔ حال ہی میں ان کے تیسرے گرو ''دیو داس'' نے ہندوستان کی تمام ہندو سماجی' علمی' سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کو ایک سرکلر بھیجا ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان کی زمین کو مسلمانوں کی نجاست سے پاک کر دیں۔ اس گرو نے مزید لکھا ہے کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کچھ ردِّعمل ہوگا تو وہ صرف پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہوگا جس کی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے' باقی پورے عالم اسلام میں کہیں ردِعمل نہیں ہوگا۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کیوں کیے ہیں کہ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں''؟ ... اس لیے کہ ایودھیا کی مسجد کی تہدیم پر پورے عالم اسلام میں ان دو ممالک... پاکستان اور بنگلہ دیش... کے علاوہ کہیں کوئی ردِّعمل نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک نے یہ تک نہیں کہا کہ مسجد دوبارہ تعمیر کرو ورنہ ہم تمہارے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع کر دیں گے۔ سفارتی تعلقات توڑنا تو دور کی بات ہے' اگر صرف امارات' سعودی عرب اور کویت کی یہ دھمکی آ جاتی کہ ہم تجارتی تعلق منقطع کر رہے ہیں تو بھارت کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔

یہ ہے تیسری صورت جو بدترین ہوگی!

ایک طرف تو ہندومت کا تیزی سے احیاء ہو رہا ہے اور دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ ہم بدترین انتشار کا شکار ہیں۔ تازہ الیکشن (واضح رہے کہ یہ خطاب 1993ء کا ہے اور ''تازہ الیکشن'' سے مراد 1993ء کے انتخابات ہیں۔) میں دینی' مذہبی سیاسی جماعتوں کا جو حشر ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ لیکن کوئی پتا نہیں کہ تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرا دے کہ ہندو قوم کے ہاتھوں ہم کو تہس نہس کرا دیا جائے' لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا کر دے:۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

نظامِ خلافت کب اور کہاں برپا ہو گا؟

ان تین صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی پیش آئے' مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ خلافت کا احیاء اسی خطے سے ہو گا۔ ایک سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ یہ احیاء کب ہو گا؟ میں کیا جواب دوں گا' جب کہ قرآن نے خود حضور ﷺ سے کہلوا دیا:

﴿وَإِنْ أَدْرِيْ أَقَرِيْبٌ أَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ۝﴾ (الانبیاء:109)

''اور میں نہیں جانتا کہ (جس بات کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور۔''

اسی طرح سورۃ الجن میں آیا ہے:

﴿قُلْ إِنْ أَدْرِيْ أَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ أَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْ أَمَدًا۝﴾ (25)

''مجھے معلوم نہیں ہے کہ (جو خبر تم کو دی جا رہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکا ہے یا ابھی اس میں تمہارا رب کوئی تاخیر کرے گا۔''

اسی خطے سے نظامِ خلافت کے اِحیاء کا یقین مجھے بہرحال حاصل ہے۔ اب میں اس کی تائید میں دو حدیثیں پیش کر رہا ہوں۔ ایک حدیث امام ابن ماجہؒ نے حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

''مشرق سے فوجیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کرنے کے لیے منزل پر منزل مارتی چلی آئیں گی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرق کے کسی علاقے میں وہ نظامِ خلافت پہلے قائم ہو چکا ہو گا۔ دوسری حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے:

''خراسان کی جانب سے علم چلیں گے' ان کو کوئی روک نہ سکے گا جب تک کہ وہ ایلیاء میں جا کر نصب نہ ہو جائیں۔''

(حضور ﷺ کے زمانے میں یروشلم کا نام ایلیاء تھا) خراسان اس علاقے کا نام ہے جس کا کچھ حصہ اس وقت پاکستان میں ہے اور زیادہ حصہ افغانستان میں ہے۔ گویا یہی علاقے ہیں جہاں سے خلافت کا آغاز ہو گا۔

بظاہر بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی' کیونکہ عربوں کے بعد سب سے بڑی مجرم قوم ہم مسلمانانِ پاکستان ہیں۔ اس وقت پاکستان ننگے سیکولرازم کی طرف جا رہا ہے' حتیٰ کہ قومی شناختی کارڈ پر مذہب کا خانہ تک درج نہ ہو سکا' اس لیے کہ یہ بات عیسائیوں کو پسند نہ تھی' یہاں تک کہ مذہب کا خانہ ختم کرانے کے لیے پوپ صاحب بھی بول پڑے۔ یہ سب اُس ملک میں ہو رہا ہے جو اسلام ہی کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر چکا ہوں کہ کتب احادیث میں "کِتَابُ الفِتَن و کِتَابُ المَلَاحِم" سے مراد جنگوں کا باب ہے۔ ان میں خاص طور پر "اَلمَلحَمَۃُ العُظمٰی" کا ذکر ملتا ہے جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ ہوگی۔ اس کے علاوہ احادیث میں علاماتِ قیامت' خروجِ دجال' عرب میں قیادتِ مہدی کا ظہور' مشرق سے فوجوں کی آمد' آسمان سے حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول' اس کے نتیجے میں یہود کا استیصال اور پھر عالمی سطح پر اسلام کے نظامِ خلافت علیٰ منہاجِ النبوۃ کے قیام کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ وہ حالات ہیں جو میرے اندازے میں تو زیادہ دُور نہیں ہیں۔ قرائن وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے' بس اُس کی آیات ہی سے تو اسے پہچانا جاتا ہے: ؎

حق مری دسترس سے باہر ہے
حق کے آثار دیکھتا ہوں میں!

اسی طرح جو پیش آنے والے حالات ہیں اور قیامت سے قبل کی جو علامات ہیں' نبی اکرم ﷺ نے ان کو وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ دیکھنے والے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے بساط بچھ رہی ہے' جیسے کسی ڈرامے کے لیے سٹیج تیار کیا جاتا ہے اور سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ درحقیقت دو مسلمان اُمتوں کی سزاؤں کی آخری قسطیں ہیں جو کہ اب آنے والی ہیں۔

ایک اصولی بات اور سمجھ لی جائے کہ تاریخ میں جو بڑے بڑے حادثات وواقعات رونما ہوتے ہیں ان کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر میں کون کون سی قوتیں اور عوامل کارفرما ہیں' باطن میں اصل حقیقت کیا ہے اور مشیتِ ایزدی کس طور سے اپنا ظہور کر رہی ہے' یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بسا اوقات ظاہری اعتبار سے جن چیزوں اور واقعات و حادثات کی بہت اہمیت ہوتی ہے' باطنی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح باطنی اعتبار سے جن امور کی اہمیت ہوتی ہے وہ ظاہری اعتبار سے اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جن حالات میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے' اس وقت کی دنیا نے اس واقعہ کی اہمیت کو کیا سمجھا ہوگا؟ دنیا کے ایک چھوٹے سے کونے میں' جزیرہ نمائے عرب کے لق ودق صحرا میں بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا' پھر اس واقعہ نے آگے چل کر وہاں انقلاب برپا کر دیا۔ مگر دنیا پر اس کا یا اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے انقلاب کا فوری اثر کیا ہوا ہوگا؟ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی دنیا میں آباد انسانوں کی اکثریت نے اس کا کیا نوٹس لیا ہوگا؟ لیکن معنوی اعتبار سے یہ کتنا اہم واقعہ تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت انبیاء ورسل کے سلسلہ کا خاتمہ اور تکمیل ہے۔ اس بعثت کی وجہ سے روئے ارضی پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہوا! اگرچہ اِس وقت کے حالات وواقعات میں کچھ دوسری قوتیں زیادہ مؤثر نظر آتی ہیں' حقیقت میں باطنی معاملہ تو

''مشیت ِایزدی'' کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے' اُس کی جو سُنّت ہے' یہ واقعہ اس کا ظہور ہے' اور جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا' مسلمان اُمتوں پر بھی عذاب آتا ہے اور کافروں سے بڑھ کر عذاب آتا ہے' مگر کُفار کے ضمن میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ کافر جن کی طرف براہ راست کوئی رسول آیا ہو' اور رسول کی طرف سے اتمام حُجت کے باوجود وہ ایمان نہ لائیں تو ایسے کافروں کو کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ان کے علاوہ وہ کُفار جن پر کسی رسول نے براہِ راست حُجت پوری نہیں کی ان پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آتا' ان کا سارا معاملہ آخرت میں ہی چکایا جائے گا۔ اس دنیا میں سزا رسولوں کی اُمتوں کو ان کے اعمال اور قول و فعل کے تضاد کی بنیاد پر ملتی ہے۔

سورۃ الصّف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③﴾

''اے اہلِ ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ ناراضی کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ وہ کہو جو کرتے نہیں ہو۔''

اس بات کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک قوم مدعی ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں' اُس کے رسول کو مانتے ہیں' اُس کی کتاب کو مانتے ہیں اور اُس کی شریعت کو مانتے ہیں' مگر یہ سب کچھ ماننے کے بعد عمل نہیں کرتے یا عمل کرتے ہیں تو جزوی طور پر (ہماری جہالت اور بدبختی لائق ماتم ہے کہ ہم نے اپنی بے عملی' بدعملی یا دورنگی کے جواز کے لیے خوب خوب عذر تراش رکھے ہیں۔ چنانچہ ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بد ہیں تو کیا ہوا' ہیں تو اُمتِ محمد ﷺ میں۔ ہم اللہ اور رسول ﷺ کو مانتے ہیں... نہ ماننے والوں سے تو اچھے ہیں۔ ہم بڑی عقیدت کے مظاہرے کے ساتھ کہتے ہیں: ''ہم تیرے محبوب ﷺ کے اُمتی ہیں'' اور پھر اگر ہم کچھ احکام پر عمل کر لیتے ہیں تو ان کے مقابلے میں تو بہتر ہی ہیں جو کسی حکم کو نہیں مانتے۔ آخر کچھ تو ہمارا کریڈٹ ہونا چاہیے۔ یہ ہے ہماری سوچ کا انداز' مگر قرآن حکیم ہمیں دوسرا ہی فیصلہ سناتا ہے۔ یہود کی روش یہ تھی کہ مختلف یہودی قبائل اپنے حلیف غیر یہودی قبائل کے ساتھ مل کر دیگر یہودی قبائل سے جنگ کرتے اور ان کو گھروں سے نکال کر قیدی بناتے۔ مگر جب وہ گرفتار ہو کر آتے تو ان کو یاد آجاتا کہ یہ تو ہمارے یہودی بھائی ہیں' ان کو ہم گرفتار کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا فدیہ ادا کر کے ان کو رہائی دلاتے اور فدیہ ادا کرنے کے لیے چندے جمع کرتے۔

یہود کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (البقرہ: 85) ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کے منکر ہو؟'' پھر اس روش کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص یہ طریقہ اختیار کرتا ہے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ رسوا ہو اور آخرت میں اس کو سخت عذاب میں ڈالا جائے۔'' یہ اللہ کا ابدی قانون

ہے'اس میں کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں کی جاتی ہے۔)

اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے وہ مسلمان اُمت جو زمین پر اللہ کی نمائندگی کے منصب پر فائز تھی اُس نے اُلٹی نمائندگی شروع کر دی ہے تو یہ اُمت اب خالق اور مخلوق کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ دنیا ان کو دیکھتی ہے اور انہی کے حوالے سے دین کو سمجھتی ہے۔ اِس وقت یہ اُمت مخلوقِ خدا کو دین کی طرف لانے کے بجائے اس سے لوگوں کو متنفر کر رہی ہے۔

اپنے اس طرزِ عمل اور غلط نمائندگی کے باعث یہ کافروں سے بڑھ کر مجرم اور زیادہ شدید سزا کی مستحق بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ محمد ﷺ کی پٹائی ایک مغضوب اور ملعون قوم (امیر جماعت اسلامی کراچی چودھری غلام محمد مرحوم اس معاملے کو ''چمار کے ہاتھوں پٹوانا'' کہا کرتے تھے) کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور مزید ہو گی۔

یہود کے خواب اور ان کی تعبیر

یہود کے عزائم کو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی نے' جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں' ایک چونکا دینے والی بات بتائی۔ پچھلے دنوں وہ اپنی فلائٹ پر بنکاک گئے ہوئے تھے۔ وہاں ٹیلی ویژن پر ایک فلم "Stories of the Bible" دکھائی جا رہی تھی۔ اس فلم میں تاریخی دلائل و شواہد اور اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے ذریعے یہودی یہ پرچار کر رہے ہیں کہ ان کا ''تابوتِ سکینہ'' (یہود کے تابوت سکینہ کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ تابوت جو یہود کے دشمنوں کے پاس چلا گیا تھا اس کی واپسی کو ''طالوت'' کی سرداری کی علامت کے طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس ''تابوت سکینہ'' میں' کہا جاتا ہے کہ وہ الواح موجود ہیں جن پر تورات لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔ اس کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی موجودگی کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود اس ''تابوتِ سکینہ'' کو بہت مقدس جانتے ہیں اور اس کو اپنی فتح کی علامت تصور کرتے ہیں۔) مسجد اقصیٰ کے نیچے ایک سرنگ میں موجود ہے۔ جب بخت نصر نے ہیکل سلیمانی منہدم کیا تھا' یہود کے دعویٰ کے مطابق وہ اُسی وقت سے یہاں دفن ہے۔ اسی لیے یہود اسے دوبار نکالنے کی کوشش بھی کر چکے ہیں۔ اس میں تو وہ ناکام رہے مگر اب بڑی تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور ''تابوتِ سکینہ'' کی تلاش میں مسجد اقصیٰ کو منہدم کیا جائے۔ اسرائیل کی سپریم کورٹ فیصلہ دے چکی ہے کہ ''یروشلم' اسرائیل کا ''اٹوٹ انگ'' ہے۔

حالات اب روزِ روشن کی طرح واضح ہو رہے ہیں۔ جو لوگ احادیثِ صحیحہ سے استغناء برتتے ہیں ان کی حالت پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اب تو حقائق حدیث مبارکہ کی تشبیہ "مثل فلق الصبح" یعنی صبح صادق کی طرح کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ (حضور ﷺ پر آغازِ وحی رؤیائے صادقہ سے ہوا۔ آپ ﷺ جو خواب دیکھتے، چند دنوں بعد یا اگلے ہی دن وہ واقعہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو جاتا۔ اسی بات کو ایک حدیث میں

"مثل فلق الصبح" (صبح صادق کی پو پھٹنے کی مانند) قرار دیا گیا ہے۔)

یہود کی جو سزا مؤخر تھی اس کی تنفیذ کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ میں ان حقائق کو حکمت قرآن کی بنیاد پر مانتا ہوں۔ احادیث ان کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں عقل و منطق بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ آپ غور کریں کہ یہود کو کون ختم کر سکتا ہے؟ اسرائیل کے پاس کتنے ایٹم بم موجود ہیں؟ مسلمان ممالک میں سے کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ دنیا کو پاکستان پر کچھ شک ہونے لگا ہے کہ اس کے پاس ''اسلامک بم'' ہے۔ امریکی سینیٹرز بھی آ کر کہہ گئے ہیں کہ ہمیں ''اسلامک بم'' سے بہت خوف آتا ہے۔ لہٰذا اسرائیل اور یہود کو تو وہی آخری درجے کے معجزے ختم کر سکتے ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کو دیے گئے ہیں۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نگاہ جہاں تک جائے گی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ بھی حدیث میں ہیں کہ اگر کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ پتھر بھی پکارے گا کہ ''اے روح اللہ! یہ میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے''۔ تو گویا ایک دفعہ ''گریٹر اسرائیل'' قائم ضرور ہو گا' مگر پھر وہی ان کا ''Greater Graveyard'' بھی بنے گا۔

یہ بات بھی عقل و منطق کے عین مطابق ہے۔ یہود کا ''دورِ انتشار'' 70ء سے شروع ہوا تھا' جس کے بعد یہود پوری دنیا میں دربدر ہو گئے تھے' جہاں جس کے سینگ سمائے چلا گیا' لیکن مختلف ممالک میں پہنچ کر انہوں نے اپنے اڈے بنا لیے اور جم کر بیٹھ گئے۔ اب یہود کو ختم کرنے کے لیے یا تو پوری دنیا پر عذاب لایا جائے یا ان سب کو کہیں سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اسرائیل کے قیام کے بعد سے انہیں بظاہر مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں عرب مسلمان پٹ رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت مشیتِ ایزدی اس طرح تمام کوڑے کرکٹ کو جھاڑ و دے کر ایک جگہ جمع کر رہی ہے' تاکہ سب کو ایک ساتھ دیا سلائی دکھائی جا سکے۔ یہ بات سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ پہلے رکوع میں تاریخ بنی اسرائیل کے چار ادوار کا ذکر ہے' جب کہ آخری رکوع میں فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا﴾ (104)

''جب آخرت والے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب (یہود) کو لپیٹ کر لے آئیں گے۔''

دیکھ لیجیے! پوری دنیا سے یہودی اسرائیل کا رخ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب کے سب موجودہ اسرائیل میں تو نہیں سما سکتے' لہٰذا ''گریٹر اسرائیل'' وجود میں لایا جائے گا۔

ان تمام حقائق کے بارے میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے' لیکن عہد حاضر میں احادیثِ نبویہ ﷺ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو استغناء برت رہا ہے' وہ فتنۂ انکارِ سُنّت اور فتنۂ قادیانیت کا نتیجہ ہے۔ اسے ہم ''اعتزالِ جدید'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں جب میرے مضامین شائع ہو رہے

تھے تو ان کے حوالے سے ایک لمبا چوڑا خط میرے پاس امریکہ سے آیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ آپ پیشین گوئیوں کی باتیں کررہے ہیں!! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلمان ان کے انتظار میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہیں! ان صاحب سے جب خط و کتابت کا سلسلہ چلا تو معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہیں۔ میں نے انہیں جواباً لکھا کہ پیشین گوئیاں صرف احادیث میں نہیں قرآن میں بھی تو ہیں۔ سورۃ الروم کی ابتدائی آیات پیشین گوئی پر مبنی نہیں؟ اس پیشین گوئی میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ اس وقت رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' لیکن چند سال کے اندر اندر وہ دوبارہ غالب آ جائیں گے اور اس دن مومن بھی اللہ کی دی ہوئی فتح پر خوش ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی نو سال میں پوری ہو گئی۔ ایک طرف ہرقل نے یروشلم دوبارہ فتح کر لیا اور ایرانیوں کو شکست فاش دی' دوسری طرف بدر میں مسلمانوں کو اللہ نے فتح عظیم اور یومِ فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا دن) عطا فرمایا۔ یہ پیشین گوئی نو سال بعد حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ کیا نو سال تک مسلمان ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے تھے اور پیشین گوئی پوری ہونے کا انتظار کرتے رہے تھے؟ نہیں! اس کے برعکس ہوا یہ کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ماریں کھائیں' ہجرت کی' اہل و عیال کو انسان نما بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مدینہ کا رخ کیا اور پھر تین سو تیرہ... پندرہ سال کی محنت شاقہ کا حاصل... آپ ﷺ نے میدان میں لا کر ڈال دیے' تب فتح مبین حاصل ہوئی۔

اب بھی جو کچھ ہوگا' محنت و کوشش سے ہوگا۔ جن کو توفیق ملے گی وہ اس کام میں لگ جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کی پیشین گوئیوں کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں' مگر نہ قرآنی پیشین گوئیوں کا مطلب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا تھا اور نہ احادیث میں وارد پیشین گوئیوں کا یہ مطلب ہے۔

(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام)

منتخبات از بیان القرآن

سورۃ الکھف، آیات 83 تا 101

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ط قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (83) اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (84) فَاَتْبَعَ سَبَبًا (85) حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ط قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (86) قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا (87) وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ج وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ط (88) ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (89) حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (90) كَذٰلِكَ ط وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا (91) ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (92) حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا (93) قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا (94) قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (95) اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ط حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا (96) فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (97) قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ج فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ج وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (98) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (99) وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۨ (100) الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (101)﴾

اس رکوع میں ذوالقرنین کے بارے میں یہودِ مدینہ کے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اکثر مفسرین ذوالقرنین سے ناواقف تھے۔ چنانچہ تیرہ سو سال تک عام طور پر سکندر اعظم ہی کو ذوالقرنین سمجھا جاتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن میں ذوالقرنین کی فتوحات کا ذکر جس انداز میں ہوا ہے یہ انداز سکندر اعظم کی فتوحات سے ملتا جلتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوالقرنین کی سیرت کا وہ نقشہ جو قرآن نے پیش کیا ہے اس کی سکندر اعظم کی سیرت کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔

بہر حال جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ذوالقرنین قدیم ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس کا لقب تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ایران کے علاقے میں دو الگ الگ خود مختار مملکتیں قائم تھیں۔ ایک کا نام پارس تھا جس سے ''فارس'' کا لفظ بنا ہے اور دوسرے کا نام ''مادا'' تھا۔ کیخورس یا سائرس نے ان دونوں مملکتوں کو ملا کر ایک ملک بنا دیا اور یوں سلطنت ایران کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ دو مملکتوں کے فرمانروا ہونے کی علامت کے طور پر اس نے اپنے تاج میں دو سینگ لگا رکھے تھے اور اس طرح اس کا لقب ذوالقرنین (دو سینگوں والا) پڑ گیا۔

آیت 83: ''اور یہ لوگ آپ ﷺ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہیے کہ ابھی میں آپ لوگوں کو اس کا حال بتاتا ہوں۔''

ذوالقرنین کے بارے میں جدید تحقیق کو اہل علم کے حلقے میں متعارف کرانے کا سہرا مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں اس موضوع پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قدیم ایران کا بادشاہ کیخورس یا سائرس ہی ذوالقرنین تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تحقیق کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایک کھدائی کے دوران دستیاب ہوئی تھیں۔ اس کھدائی کے دوران اس عظیم فاتح بادشاہ کا ایک مجسمہ بھی دریافت ہوا تھا اور مقبرہ بھی۔ اس کھدائی سے ملنے والی معلومات کی بنیاد پر رضا شاہ پہلوی نے اس کی ڈھائی ہزار سالہ برسی منانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ دریافت شدہ مجسمے کے سر پر جو تاج تھا اس میں دو سینگ بھی موجود تھے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایران کا یہی بادشاہ (کیخورس یا سائرس) تھا جو تاریخ میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں نے خصوصی طور پر یہ سوال کیوں پوچھا تھا اور ذوالقرنین کی شخصیت میں ان کی اس دلچسپی کا سبب کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ملتا ہے۔ جب 587 قبل مسیح کے لگ بھگ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کر کے یروشلم کو تباہ کیا تو اس شہر کی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا گیا اور زندہ بچ جانے والوں کو وہ اپنی فوج کے ساتھ بابل (Babilonia) لے گیا' جہاں یہ لوگ ڈیڑھ سو سال تک اسیری کی حالت میں رہے۔

جب ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس (آئندہ سطور میں انہیں ''ذوالقرنین'' ہی لکھا جائے گا) نے ایران کو متحد کرنے کے بعد اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو سب سے پہلے عراق کو فتح کیا۔ مشرق وسطیٰ کے موجودہ نقشے کو ذہن میں رکھا جائے تو فلسطین' اسرائیل' شرق اردن' مغربی کنارہ اور لبنان کے ممالک پر مشتمل پورے علاقے کو اُس زمانے میں شامِ عرب یا شام اور اس سے مشرق میں واقع علاقے کو عراقِ عرب یا عراق کہا جاتا تھا' جبکہ عراق کے مزید مشرق میں ایران واقع تھا۔ عراق پر قبضہ کرنے کے بعد ذوالقرنین نے بابل میں اسیر یہودیوں کو آزاد کر دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے ملک واپس جا کر اپنا تباہ شدہ شہر یروشلم دوبارہ آباد کر لیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی قیادت میں یہودیوں کا قافلہ بابل سے واپس یروشلم آیا۔ انہوں

نے اپنے اس شہر کو پھر سے آباد کیا اور ہیکل سلیمانی کو بھی از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس پس منظر میں یہودی ذوالقرنین کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور اسی سبب سے ان کے بارے میں انہوں نے حضور ﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا۔

ذوالقرنین کی فتوحات کے سلسلے میں تین مہمات کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ان مہمات میں ایران سے مغرب میں بحیرۂ روم (Mediterranian) تک پورے علاقے کی تسخیر، مشرق میں بلوچستان اور مکران تک لشکر کشی اور شمال میں بحیرۂ خزر (Caspian Sea) اور بحیرۂ اسود (Black Sea) کے درمیانی پہاڑی علاقے کی فتوحات شامل ہیں۔ ذوالقرنین کا یہ سلسلہ فتوحات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی فتوحات کے سلسلے سے مشابہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی جزیرہ نمائے عرب سے مختلف سمتوں میں تین لشکروں نے پیش قدمی کی تھی، ایک لشکر شام اور پھر مصر گیا تھا، دوسرے لشکر نے عراق کے بعد ایران کو فتح کیا تھا، جبکہ تیسرا لشکر شمال میں کوہ قاف (Caucasus) تک جا پہنچا تھا۔

قدیم روایات میں ذوالقرنین کے بارے میں کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہیں کہ ابتدائی عمر میں وہ ایک چھوٹی سی مملکت کے شہزادے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ کچھ لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ عرصہ صحرا میں روپوش رہے۔ اسی عرصے کے دوران ان تک کسی نبی کی تعلیمات پہنچیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زرتشت ہی اللہ کے نبی ہوں اور انہی کی تعلیمات سے انہوں نے استفادہ کیا ہو۔ بہر حال قرآن نے ذوالقرنین کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک نیک اور صالح بندۂ مومن کا کردار ہے اور اس کردار کی خصوصیات تاریخی اعتبار سے اُس زمانے کے کسی اور فاتح حکمران پر منطبق نہیں ہوتیں۔

آیات 84 تا 86: ''ہم نے اسے زمین میں تمکن عطا کیا تھا اور اُسے ہر طرح کے اسباب و وسائل مہیا کیے تھے۔ تو اس نے ایک (مہم کا) سروسامان کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچا۔''

یہ ذوالقرنین کی مغربی علاقوں پر لشکر کشی کا ذکر ہے جب وہ پیش قدمی کرتے ہوئے بحیرۂ روم کے ساحل تک جا پہنچے۔ چونکہ اُس زمانے میں ان لوگوں کو پوری دنیا کا نقشہ معلوم نہیں تھا اس لیے وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم اس سمت میں دنیا یا زمین کی آخری سرحدوں تک پہنچ گئے ہیں اور اس سے آگے بس سمندر ہی سمندر ہے۔ وہاں ساحل پر کھڑے ہو کر انہیں سورج بظاہر سمندر میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا اور اس طرح وہ اس جگہ کو مَغْرِبَ الشَّمْسِ (سورج کے غروب ہونے کی جگہ) سمجھے۔

''اس نے اسے غروب ہوتے ہوئے پایا ایک گدلے چشمے میں، اور اس نے پایا وہاں ایک قوم کو۔''

یعنی اس علاقے کو جب انہوں نے فتح کر لیا تو وہاں بسنے والی قوم ان کی رعایا بن گئی۔

''ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تم چاہو تو انہیں سزا دو اور چاہو تو ان (کے بارے) میں حسن سلوک کا معاملہ کرو۔''

یعنی آپ نے اس علاقے کو بزورِ بازو فتح کیا ہے اب یہاں کے باشندے آپ کے رحم و کرم پر ہیں' آپ کو ان پر مکمل اختیار ہے۔ آپ چاہیں تو ان پر سختی کریں اور آپ چاہیں تو ان کے درمیان حسن سلوک کی روایت قائم کریں۔ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ذوالقرنین کو مخاطب کر کے فرمائی' لیکن ضروری نہیں کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہو۔ اگر تو وہ نبی تھے (واللہ اعلم) تو یہ ممکن بھی ہے' ورنہ اس سے مراد القاء یا الہام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے سورہ النحل (آیت ۶۸) میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کیے جانے کا ذکر ہے۔

آیت 87: ''اُس نے کہا: جس نے ظلم کیا ہم اُسے سزا دیں گے' پھر وہ لوٹایا جائے گا اپنے رب کی طرف اور وہ اُسے بہت سخت عذاب دے گا۔''

یہاں ظلم سے مراد کفر اور شرک بھی ہو سکتا ہے۔

آیت 88: ''اور جو کوئی ایمان لایا' اور اُس نے نیک اعمال کیے تو اُس کے لیے ہے اچھی جزا' اور اُس سے ہم بات کریں گے اپنے معاملے میں نرمی سے۔''

یعنی اس مفتوحہ علاقہ میں اپنی رعایا کے اہل ایمان نیک لوگوں سے ہم تمام معاملات میں نرمی سے کام لیں گے اور خراج وغیرہ کی وصولی کے سلسلے میں ان پر سختی نہیں کریں گے۔

آیت 89: ''پھر اُس نے ایک (اور مہم کا) سروسامان کیا۔''

مغربی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ذوالقرنین نے مشرقی علاقوں کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ بنایا۔

آیت 90: ''یہاں تک کہ وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ پر پہنچ گیا۔''

اس مہم کے سلسلے میں تاریخی طور پر مکران کے علاقے تک ذوالقرنین کی پیش قدمی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم!) ممکن ہے ساحل مکران پر کھڑے ہو کر بھی انہوں نے محسوس کیا ہو کہ وہ اس سمت میں بھی زمین کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں۔

''اُس نے اس کو طلوع ہوتے پایا ایک ایسی قوم پر جس کے لیے ہم نے اس (سورج) کے مقابل کوئی اوٹ نہیں رکھی تھی۔''

اس زمانے میں یہ علاقہ Gedrosia کہلاتا تھا۔ یہاں ایسے وحشی قبائل آباد تھے جو زمین پر صرف دیواریں کھڑی کر کے اپنے گھر بناتے تھے اور اُس زمانے تک ان کے تمدن میں گھروں پر چھتیں ڈالنے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

آیت 91: ''(پھر) ایسا ہی ہوا۔''

پھر یہاں بھی ویسا ہی معاملہ ہوا جیسا کہ پہلی مہم کے سلسلے میں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکمل فتح عطا فرمائی اور علاقے میں آباد قبائل کے معاملات میں نرمی یا سختی کرنے کا پورا اختیار دیا۔ یہاں بھی ذوالقرنین نے ظالم اور

شریر لوگوں کے ساتھ سختی جبکہ نیک اور شریف لوگوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

''اور ہم پوری طرح باخبر تھے اُس کے احوال سے۔'' جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اور جن حالات سے اس کو سابقہ پیش آیا ہم اس سے پوری طرح باخبر تھے۔

آیت 92: ''پھر اُس نے ایک (اور مہم کا) سروسامان کیا۔''

آیت 93: ''یہاں تک کہ جب وہ دو دیواروں کے درمیان پہنچا''

''سد'' دیوار کو کہتے ہیں۔ دو دیواروں سے مراد یہاں دو پہاڑی سلسلے ہیں۔ داہنی طرف مشرق میں بحیرۂ کیسپین تھا اور دوسری طرف بحیرۂ اسود۔ ان دونوں سمندروں کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ دو پہاڑی سلسلے متوازی چلتے ہیں۔ اور ان پہاڑی سلسلوں کی درمیانی گزرگاہ سے شمالی علاقوں کے وحشی قبائل (یاجوج ماجوج) اس علاقے پر حملہ آور ہوتے تھے۔

''اُس نے پایا اُن دونوں سے ورے ایک قوم (کے افراد) کو جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتے تھے۔''

گویا یہ بھی ایک غیر متمدن قوم تھی۔ اس قوم کے افراد ذوالقرنین اور ان کے ساتھیوں کی زبان سے قطعاً ناآشنا تھے اور حملہ آور لشکر کے لوگ بھی اس مفتوحہ قوم کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے ذوالقرنین کے سامنے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا:

آیت 94: ''انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین میں بہت فساد مچانے والے لوگ ہیں، تو کیا ہم آپ کو کچھ خراج ادا کریں کہ اس کے عوض آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں؟''

یعنی آپ ان پہاڑوں کے درمیان واقع اس واحد قدرتی گزرگاہ کو بند کر دیں تاکہ یاجوج وماجوج ہم پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔ یہ وہی تصور یا اصول تھا جس کے تحت آج کل دریاؤں پر ڈیم تعمیر کیے جاتے ہیں۔ یعنی دو متوازی پہاڑی سلسلوں کے درمیان اگر دریا کی گزرگاہ ہے تو کسی کو مناسب مقام پر مضبوط دیوار بنا کر پانی کا راستہ روک دیا جائے تاکہ دریا ایک بہت بڑی جھیل کی شکل اختیار کر لے۔

یہ یاجوج ماجوج کون ہیں؟ ان کے بارے میں جاننے کے لیے نسل انسانی کی قدیم تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ قدیم روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی آپ کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث سے چلی تھی۔ ان میں سے سامی نسل تو بہت معروف ہے۔ قومِ عاد، قوم ثمود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سامی نسل میں سے تھے۔ حضرت یافث کی اولاد کے لوگ وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے شمال کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ان کی نسل بڑھتے بڑھتے شمالی ایشیا اور یورپ کے علاقوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشرق میں چین اور ہند چینی کی yellow races، مغرب میں روس اور سکنڈے نیوین ممالک کی اقوام، مغربی یورپ کے Anglo Saxons، مشرقی یورپ میں خصوصی طور پر شمالی علاقوں اور صحرائے گوبی کے علاقوں کی تمام آبادی حضرت یافث کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ تورات میں حضرت یافث کے بہت سے بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔ ان

میں Mosc, Tobal, Gog & Magog وغیرہ قابل ذکر ہیں (ممکن ہے روس کا شہر ماسکو' حضرت یافث کے بیٹے ماسک نے آباد کیا ہو)۔اسی طرح Baltic Sea اور Baltic States کا نام غالباً Tobal کے نام پر ہے۔ بہر حال یورپ کی اینگلو سیکسن اقوام اور تمام Nordic Races یاجوج ماجوج ہی کی نسل سے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غیر متمدن اور وحشی لوگ تھے جن کا پیشہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ وہ اپنے ملحقہ علاقوں پر حملہ آور ہوتے' قتل و غارت کا بازار گرم کرتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ ان کی اس غارت گری کی جھلک موجودہ دنیا نے بھی دیکھی جب Anglo Saxons نے ایک سیلاب کی طرح یورپ سے نکل کر دیکھتے ہی دیکھتے پورے ایشیا اور افریقہ کو نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ بعد ازاں مختلف عوامل کی بنا پر انہیں ان علاقوں سے بظاہر پسپا تو ہونا پڑا مگر حقیقت میں دنیا کے بہت سے ممالک پر بالواسطہ اب بھی ان کا قبضہ ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے ان کی اسی بالواسطہ حکمرانی کو مضبوط کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

قربِ قیامت میں ان قوموں کی ایک اور یلغار ہونے والی ہے۔ اس کی تفصیلات احادیث اور روایات میں اس طرح آئی ہیں کہ قیامت سے قبل دنیا ایک بہت ہولناک جنگ کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ اس جنگ کو احادیث میں "المَلحمۃ العُظمٰی" جبکہ بائبل میں Armageddon کا نام دیا گیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ اس جنگ کا مرکزی میدان بنے گا۔ اس جنگ میں ایک طرف عیسائی دنیا اور تمام یورپی اقوام ہوں گی اور دوسری طرف مسلمان ہوں گے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک عظیم لیڈر امام مہدی کی صورت میں عطا کرے گا۔ امام مہدی عرب میں پیدا ہوں گے اور وہ مجدد ہوں گے۔ پھر کسی مرحلے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ خراسان کے علاقے سے مسلمان افواج ان کی مدد کو جائیں گی۔ پھر اس جنگ کا خاتمہ اس طرح ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کر دیں گے' یہودیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے۔ یوں اسلام کو عروج ملے گا اور دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ (اللہ تعالیٰ مسلمانانِ پاکستان کو توفیق دے کہ اس سے پہلے وہ یہاں نظام خلافت قائم کر لیں اور ہمسایہ علاقہ خراسان سے جو فوجیں امام مہدی کی مدد کے لیے روانہ ہوں ان میں ہمارے لوگ بھی شامل ہوں۔)

جب ہولناک جنگ اپنے انجام کو پہنچ جائے گی تو اس کے بعد یاجوج ماجوج کی بہت بڑی یلغار ہوگی۔ میرے خیال میں یہ لوگ چین اور ہند چینی وغیرہ علاقوں کی طرف سے حملہ آور ہوں گے۔ یہ لوگ Armageddon میں حصہ نہیں لیں گے، بلکہ اس کے بعد اس علاقے پر یلغار کر کے تباہی مچائیں گے۔ سورۃ الانبیاء کی آیات 94' 97 اور 98 میں اُن کی اس یلغار کا ذکر قربِ قیامت کے واقعات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

آیت 95: ''اُس نے کہا: جو کچھ مجھے دے رکھا ہے اس میں میرے رب نے وہ بہت بہتر ہے۔''

یعنی یہ کہ مجھے تمہارے خراج وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے بہتر مال تو میرے رب نے مجھے پہلے

ہی عطا کر رکھا ہے۔ بہر حال تمہارے اس مسئلے کو میں حل کیے دیتا ہوں۔ اس جملے سے ذوالقرنین کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔

''البتہ تم لوگ میری مدد کرو قوت (محنت) کے ذریعے سے' میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گا۔''

دیوار بنانے کے لیے جو مادی اسباب و وسائل درکار ہیں وہ میں مہیا کر لوں گا۔ آپ لوگ اس سلسلے میں محنت و مشقت اور افرادی قوت (man power) کے ذریعے میرا ہاتھ بٹاؤ۔

آیت 96: ''لاؤ میرے پاس تختے لوہے کے۔ یہاں تک کہ جب اس نے برابر کر دیا دونوں اونچائیوں کے درمیان (کی جگہ) کو''

جب لوہے کے تختوں کو جوڑ کر انہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیانی درّے میں دیوار کھڑی کر دی تو:

''اُس نے کہا: اب آگ دہکاؤ!''

اُس نے بڑے پیمانے پر آگ جلا کر ان تختوں کو گرم کرنے کا حکم دیا۔

''یہاں تک کہ جب بنا دیا اُس نے اس کو آگ (کی مانند)''

جب لوہے کے وہ تختے گرم ہو کر سرخ ہو گئے تو:

''اُس نے کہا: لاؤ میرے پاس مَیں ڈال دوں اس پر پگھلا ہوا تانبا۔''

اور یوں ذوالقرنین نے لوہے کے تختوں اور پگھلے ہوئے تانبے کے ذریعے سے ایک انتہائی مضبوط دیوار بنا دی۔ اس دیوار کے آثار بحیرۂ کیسپین کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ داریال اور دربند کے درمیان اب بھی موجود ہیں۔ یہ دیوار پچاس میل لمبی' انتیس فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے لوہے اور تانبے کی اتنی بڑی (مصر کے اسوان ڈیم سے بھی بڑی جسے اَسدّ الاعلیٰ کہا جاتا ہے) دیوار تعمیر کرنا یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

آیت 97 اور 98: ''اب نہ تو وہ (یاجوج ماجوج) اس کے اوپر چڑھ سکیں گے' اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکیں گے۔ اس نے کہا کہ یہ رحمت ہے میرے رب کی۔''

اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دینے کے بعد بھی ذوالقرنین کوئی کلمہ فخر زبان پر نہیں لائے' بلکہ یہی کہا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں' یہ سب اللہ کی مہربانی سے ہی ممکن ہوا ہے۔

''اور جب آ جائے گا وعدہ میرے رب کا تو وہ کر دے گا اس کو ریزہ ریزہ۔''

چنانچہ امتدادِ زمانہ کے سبب یہ دیوار اب ختم ہو چکی ہے' صرف اس کے آثار موجود ہیں' جن سے اس کے مقام اور سائز وغیرہ کا پتا چلتا ہے۔

''اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔''

آیت99: ''اور ہم چھوڑ دیں گے ان کو اس دن وہ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہو جائیں گے''
یہ قیامت سے پہلے رونما ہونے والے جنگی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ قربِ قیامت کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ یاجوج وماجوج کا ظہور بھی ہے۔ احادیث میں ان کے بارے میں ایسی خبریں ہیں کہ وہ دریاؤں اور سمندروں کا پانی پی جائیں گے اور ہر چیز کو ہڑپ کر جائیں گے۔ عین ممکن ہے وہ آدم خور بھی ہوں اور ضرورت پڑنے پر انسانوں کو بھی کھا جائیں۔ جیسے آج ہم چینی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سانپ' بچھو' کتا' بلی' ہر چیز کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ کثرتِ آبادی کے لحاظ سے بھی یاجوج وماجوج کی بیشتر علامات کا تطابق چینی قوم پر ہوتا نظر آتا ہے۔

یاجوج وماجوج کی یلغار کا نقشہ سورۃ الانبیاء میں اس طرح کھینچا گیا ہے: ''اور وہ ہر پہاڑ کی ڈھلوان سے اترتے ہوئے نظر آئیں گے'' (96)۔ 1962ء میں چین بھارت جنگ کے دوران اخباروں نے چینی افواج کے حملوں کی تفصیلات بتاتے ہوئے بھی کچھ ایسی ہی تصویر کشی کی تھی:

"Waves after waves of Chinese soldiers were coming down the slopes."

بہرحال جس طرح یاجوج وماجوج آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے اپنے ملحقہ علاقوں کی مہذب آبادیوں کو تاخت وتاراج کرتے تھے' اسی طرح قیامت سے پہلے ایک دفعہ پھر وہ دنیا میں تباہی مچائیں گے اور ان کا ظہور اپنی نوعیت کا ایک بہت اہم واقعہ ہوگا۔

''اور صور میں پھونکا جائے گا' پس ہم ان سب کو جمع کر لیں گے۔''

آیت100: ''اور اس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لے آئیں گے۔''

کہ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے' اسے ہم نے تمہارے انجام کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

آیت101: ''وہ لوگ جن کی نگاہیں پردے میں تھیں میرے ذکر سے' اور وہ سن بھی نہیں سکتے تھے۔''

وہ لوگ جو اندھے اور بہرے ہو کر دنیا سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے' حقیقی مسبب الاسباب کو بالکل فراموش کر چکے تھے' صرف دُنیوی اسباب ووسائل پر بھروسا کرتے تھے اور دنیا میں ان کی ساری تگ و دو مادی منفعت کے حصول کے لیے تھی۔

سورۃ الانبیاء، آیات 95 تا 112

﴿وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (95) حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (96) وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (97) اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (98) لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (99) لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ (100) اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ

مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (101) لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (102) لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (103) يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (104) وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (105) اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (106) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (107) قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (108) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (109) اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ (110) وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (111) قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (112)﴾

آیت 95: ''اور حرام ہے ہر اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کیا کہ (وہ لوٹ آئیں) اب وہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔''

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جن بستیوں پر اللہ کے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا تھا' وہاں کے لوگ نبی یا رسول کے آنے کے بعد بھی کفر و شرک سے لوٹنے والے نہیں ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اتمامِ حجت کے لیے رسول تو بھیج دیتا تھا' لیکن اس کو خوب معلوم تھا کہ کفر و شرک سے ان لوگوں کے رجوع کرنے اور ایمان لانے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ کے عذاب سے جو بستی ایک دفعہ برباد ہو گئی پھر اس کے دوبارہ آباد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

آیت 96: ''یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج' اور وہ ہر اونچائی کے اوپر سے پھسلتے ہوئے چلے آئیں گے۔''

قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر اس آیت کے علاوہ سورۃ الکہف میں بھی آیا ہے۔ سورۃ الکہف کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ یاجوج اور ماجوج کی یلغار سے بچاؤ کے لیے ذوالقرنین کی تعمیر شدہ دیوار سے متعلق بہت واضح معلومات دنیا کے سامنے آ چکی ہیں۔ دنیا کے نقشے میں ''دربند'' وہ جگہ ہے جہاں پر وہ دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ دیوار اب وہاں بالفعل تو قائم نہیں' مگر اس کے واضح آثار اس جگہ پر موجود ہیں۔ ان آثار سے دیوار کی dimensions کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

آیت زیر نظر سے واضح ہوتا ہے کہ قربِ قیامت کے زمانے میں یاجوج اور ماجوج کا سیلاب ایک بار پھر آنے والا ہے۔ اس سلسلے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران یورپی اقوام کی یلغار (colonization) بھی اس آیت کا مصداق ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے پورے ایشیا اور افریقہ پر

بتدریج قبضہ جما لیا تھا۔ یعنی ایک ہی وقت میں فرانسیسی، ولندیزی اور برطانوی اقوام نے ملایا، انڈونیشیا، ہندوستان سمیت پورے ایشیا اور افریقہ کو غلام بنا لیا تھا۔ یہ تمام لوگ سکنڈے نیوین ممالک سے اتری ہوئی اقوام کی نسل سے تھے، جن کو Nordic Races کہتے ہیں اور یورپ کے White Anglo Saxons لوگ بھی انہیں کی اولاد سے ہیں۔ دراصل یہی وہ اقوام ہیں جو مختلف ادوار میں مہذب دنیا پر حملہ آور ہو کر ظلم وستم اور لوٹ مار کا بازار گرم کرتی رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے اس شعر میں یورپی اقوام کے اس نوآبادیاتی استعمار (colonization) کو یاجوج اور ماجوج کے تسلط سے تعبیر کیا ہے:

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ یَنْسِلُوْنَ!

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بظاہر ان اقوام کی افواج کو ان مقبوضہ ممالک سے نکلنا پڑا، لیکن بالواسطہ طور پر وہ اپنے کٹھ پتلی اداروں اور افراد کے ذریعے ان ممالک پر مسلسل اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور بہت سے دیگر ملٹی نیشنل ادارے ان کے آلہ کار ہیں۔

البتہ احادیث میں قربِ قیامت کے زمانے کے حالات و واقعات کی جو تفصیل ملتی ہے اس کے مطابق قیامت سے قبل ایک دفعہ پھر یاجوج اور ماجوج کا سیلاب آئے گا۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ قربِ قیامت کے زمانے میں ایک بہت خوفناک جنگ (احادیث میں اس کا نام اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی جبکہ عیسائی روایات میں Armageddon بتایا گیا ہے) ہوگی جس میں یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے مقابل ہوں گے۔ فلسطین، شام اور مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ بنیادی طور پر میدانِ جنگ بنے گا، جس کی وجہ سے اس علاقے میں بہت بڑی تباہی پھیلے گی۔ اسی زمانے میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول اور امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ امام مہدی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ اس سے پہلے خراسان اور مشرقی ممالک میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہوگی اور ان علاقوں سے مسلمان افواج مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے جائیں گی۔ اس جنگ میں بالآخر فتح مسلمانوں کی ہوگی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائید ہوگی، جس سے آپ علیہ السلام یہودیوں کو ختم کر دیں گے۔ آپ علیہ السلام کی آنکھوں میں ایک خاص تاثیر (آج کی لیزر ٹیکنالوجی سے بھی مؤثر) ہوگی، جس کی وجہ سے آپ علیہ السلام کی نگاہ پڑتے ہی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ پھر آپ علیہ السلام دجال (جو مسیح ہونے کا جھوٹا دعوے دار ہوگا) کو قتل کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دجال بھاگنے کی کوشش میں ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس کو مقامِ لُدّ پر جالیں گے اور قتل کر دیں گے۔ (واضح رہے کہ Lydda اسرائیل کا سب سے بڑا ایئر بیس ہے۔)

ان سب واقعات کے بعد یاجوج اور ماجوج کے سیلاب کی شکل میں ایک دفعہ پھر دنیا پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔ آیت زیرِ نظر میں یاجوج اور ماجوج کی یلغار کے راستوں (routes) کے لیے لفظ "حدب"

استعمال ہوا ہے' جس کے معنی اونچائی کے ہیں۔ مندرجہ بالا آراء کے مطابق جن اقوام پر یاجوج اور ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے اُن سب کے علاقے ہمالیہ اور وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلوں کے شمال میں واقع ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ ان پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے جنوبی علاقوں پر یلغار کریں اور یوں ''مِنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ'' کے الفاظ کی عملی تعبیر کا نقشہ دنیا کے سامنے آ جائے۔

آیت 97: ''اور قریب آ لگے گا وہ سچا وعدہ' تو اُس وقت کافروں کی نگاہیں پتھرا جائیں گی۔''

انتہائی خوف کی وجہ سے انسان کی آنکھ حرکت کرنا بھول جاتی ہے۔ کُفّار و مشرکین قیامت کے دن اسی کیفیت سے دو چار ہوں گے۔

''(وہ کہیں گے) ہائے ہماری شامت! ہم تو اس کی طرف سے غفلت میں ہی رہے' بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے۔''

ہم آخرت کا انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعے تمام خبریں مل چکی تھیں لیکن ہم نے غفلت اور لا پرواہی کا مظاہرہ کیا اور اس طرف کبھی توجہ ہی نہ کی۔

آیات 98 تا 100: ''یقیناً تم لوگ اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو' سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔ تمہیں اس میں پہنچ کر رہنا ہے۔ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو اس (جہنم) میں داخل نہ ہوتے۔ اور وہ سب کے سب اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ انہیں اس میں چیخنا چلاّنا ہوگا' اور وہ اس میں کچھ سن نہیں سکیں گے۔''

ان کے معبود جو ان کے ساتھ ہی جل رہے ہوں گے' وہ ان کی اس چیخ و پکار کو سن نہیں پائیں گے۔

آیات 101 اور 102: ''یقیناً وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ تک نہیں سنیں گے۔''

سورہ مریم کی آیت 71 ﴿وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ کے مطابق ایک دفعہ جہنم کا مشاہدہ تو سب کو کرایا جائے گا' لیکن پھر اس کے بعد اس کو اہلِ جنت سے بہت دُور کر دیا جائے گا۔

''اور وہ اپنی دل پسند خواہشوں میں ہمیشہ رہیں گے۔''

تمام مرغوباتِ نفس اہل جنّت کو فراہم کر دی جائیں گی اور وہ اس کیفیت میں ہمیشہ رہیں گے۔

آیت 103: ''وہ بڑی گھبراہٹ انہیں پریشان نہیں کرے گی''

قیامت کی صورت حال بہت ہی بھیانک ہوگی۔ اگلی سورہ (سورۃ الحج) کے آغاز میں قیامت کی ہولناک کیفیت کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَىۡءٌ عَظِيۡمٌ﴾ ''اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ قیامت کا زلزلہ یقیناً بہت بڑی چیز ہے''۔ لیکن آیت زیر نظر میں یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو اس سے کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہوگی۔

''فزعِ اکبر'' سے مراد یہاں صرف قیامت کے دن کی سختیاں ہی نہیں بلکہ زمانۂ قربِ قیامت کی سختیاں

بھی ہیں۔ اس صورتِ حال کا ذکر احادیث میں کافی تفصیل سے ملتا ہے۔ اِن تفصیلات کے مطابق قربِ قیامت کے زمانہ میں مسلمانوں کو عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف ایک بہت خوفناک جنگ لڑنا ہوگی۔ اس جنگ کے کئی مراحل ہوں گے۔ مسلمانوں کو اس میں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا' لیکن اللہ کی خصوصی مدد مسلمانوں کے شاملِ حال ہوگی۔ اللہ کی یہ مدد ظاہری اور مادی اسباب کی صورت میں بھی سامنے آئے گی۔ انہی اسباب میں سے ایک سبب سرزمین عرب میں ایک مجدد امام مہدی کا ظہور بھی ہوگا۔ پھر جب حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا تو مسلمان حضرت مسیح علیہ السلام اور امام مہدی کی قیادت میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اتحاد کا مقابلہ کریں گے۔ اس سے پہلے خراسان اور افغانستان کے علاقوں میں (میرے اندازے کے مطابق اس میں پاکستان کا علاقہ بھی شامل ہوگا) اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہوگی اور اس حکومت کی طرف سے مذکورہ جنگ میں مسلمانوں کی مدد کے لیے افواج بھیجی جائیں گی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد آزمائش کا آخری مرحلہ یاجوج اور ماجوج کی یلغار کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اس کے بعد اسلام کا غلبہ ہوگا اور پوری دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو جائے گی' جو لگ بھگ چالیس سال (مختلف روایات میں مختلف مدت مذکور ہے) تک رہے گی۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت کا پانچواں دور ہوگا' جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''دورِ نبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دَور ہوگا' پھر وہ دَور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی''۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ (مسند احمد' کتاب اول مسند الکوفیین' باب حدیث النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ' ح 17680)

اس حدیث کی رو سے پہلا دور دورِ نبوت' دوسرا دور دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' تیسرا دور ظالم ملوکیت کا دور' چوتھا غلامی والی ملوکیت کا دور' جبکہ پانچواں اور آخری دور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا ہے۔ اس خلافت کی خبر آپ ﷺ نے اس حدیث میں بھی دی ہے جو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔'' (صحیح مسلم' کتاب الفتن

واشراط الساعة، باب هلاك هذه الامة بعضهم ببعض)

اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں ---- (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔''

(مسند احمد' کتاب باقی مسند الانصار' باب حدیث المقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ' ح 22697)

بہر حال قرآن میں موجود ''بین السطور'' اشاروں اور احادیث میں وارد صریح پیشین گوئیوں کے مطابق قیامت سے پہلے ان واقعات کا رونما ہونا طے ہے' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کے اس سلسلے کا آغاز کب ہوگا۔

اس کے بعد قیامت کا مرحلہ ہوگا' لیکن قیامِ قیامت سے قبل ایک خوشگوار ہوا چلے گی جس سے تمام اہلِ ایمان پر موت طاری ہو جائے گی۔ اس مرحلے کے بعد صرف فساق وفجار ہی دنیا میں باقی رہ جائیں گے اور انہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت صرف شریر لوگوں پر ہی آئے گی۔''

(صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعة، باب قرب الساعة)

''الفزع الاکبر'' اور ''زلزلة الساعة'' کی سختیوں کا سامنا بھی انہی لوگوں کو کرنا ہوگا' جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو قیامت سے پہلے سکون واطمینان کی موت دے کر اس دن کی سختیوں اور ہولناکیوں سے بچا لے گا۔

''اور فرشتے ان سے ملاقاتیں کریں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔''

آج آپ لوگوں کو انعامات سے نوازا جائے گا' آپ کی قدر افزائی ہوگی' خلعتیں پہنائی جائیں گی اور اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی ہوگی۔

آیت 104: ''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے لپیٹا جاتا ہے کاغذوں کا طومار۔''

یہاں پر ''السَّمٰوٰت'' (جمع) کے بجائے صرف اَلسَّمَآء (واحد) استعمال ہوا ہے' جس سے اس رائے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ یہ صرف آسمانِ دنیا کے لپیٹے جانے کی خبر ہے اور یہ کہ قیامت کے زلزلے کا عظیم واقعہ: ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ﴾ (الحج:1) صرف ہمارے نظامِ شمسی کے اندر ہی وقوع پذیر ہوگا۔ اسی نظام کے اندر موجود کرے آپس میں ٹکرائیں گے: ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ (القیامہ:9) اور یوں یہ پورا

نظام تہہ و بالا ہو جائے گا۔فرمایا کہ اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے کتابوں کے طومار (scrolls) لپیٹے جاتے ہیں۔

''جیسے ہم نے پہلی مرتبہ ابتدا کی تھی (ویسے ہی) ہم اس کا اعادہ کریں گے۔''

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے Theory of the Expanding Universe کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے۔اس نظریہ (Theory) کے مطابق یہ کائنات مسلسل وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔اس میں موجود ہر کہکشاں مسلسل چکر لگا رہی ہے اور یوں ہر کہکشاں کا دائرہ ہر لحظہ پھیلتا جا رہا ہے۔اس حوالے سے آیت زیرنظر کے الفاظ سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے لیے کائنات کے پھیلنے کے اس عمل کو الٹا دیا جائے گا' اور اس طرح یہ پھر سے اسی حالت میں آ جائے گی جہاں سے اس کے پھیلنے کے عمل کا آغاز ہوا تھا۔اس تصور کو سمجھنے کے لیے گھڑی کے "فنر" کی مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے' جس کا دائرہ اپنے نقطۂ ارتکاز کے گرد مسلسل پھیلتا رہتا ہے' لیکن جب اس میں چابی بھری جاتی ہے تو یہ پھر سے اسی نقطۂ ارتکاز کے گرد لپٹ کر اپنی پہلی حالت پر واپس آ جاتا ہے۔

''یہ وعدہ ہمارے ذمہ ہے۔ہم یہ ضرور کر کے رہیں گے۔''

آیت 105: ''اور ہم نے لکھ دیا تھا زبور میں نصیحت کے بعد کہ اس زمین کے وارث ہوں گے ہمارے نیک بندے۔''

الفاظ کے مفہوم کے مطابق اس وراثت کی دو امکانی صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ قیامت سے پہلے اللہ کا دین پوری دنیا پر غالب آ جائے گا' اللہ کے نیک بندوں کی حکومت تمام روئے زمین پر قائم ہو جائے گی اور یوں وہ پوری زمین کے مالک یا وارث بن جائیں گے۔دوسری صورت یہ ہو گی کہ قیامِ قیامت کے بعد اسی زمین کو جنت میں تبدیل کر دیا جائے گا اور اہلِ جنت کی ابتدائی مہمان نوازی (نُزُل) یہیں پر ہو گی (مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تشریح سورہ ابراہیم: 48)۔اور یوں اللہ کے نیک بندے جنت کے وارث بنا دیے جائیں گے۔اس مفہوم کے مطابق یہاں زمین سے مراد جنت کی زمین ہو گی۔

آیت 106 اور 107: ''یقیناً اس میں ایک بڑی خبر ہے (اللہ کی) بندگی کرنے والوں کے لیے۔اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔''

یعنی آپ ﷺ کی بعثت صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے عملی طور پر غلبے کے بعد آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا ہوتا' مگر آپ ﷺ تو تمام اہلِ عالم کے لیے بھیجے گئے ہیں۔چنانچہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن میں تین مقامات (التوبہ: 33' الفتح: 28 اور الصف: 9) پر ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ

تا کہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر''۔ گویا آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد تب پورا ہو گا جب دین اسلام کُل روئے زمین پر غالب ہو جائے گا۔ اسی مضمون کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

نورِ توحید کا اتمام یعنی اسلام کا بطور دین کلی غلبہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تو حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں دین اسلام کے اس اقتدار کو مزید وسعت دینے کا سلسلہ بڑی شد و مد سے شروع ہوا مگر دورِ عثمانی میں ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے سازش کے ذریعے عالمِ اسلام میں "الفِتنۃُ الکُبرٰی" کھڑا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے اور پھر مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے نتیجے میں ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے ہلاک ہو گئے۔ اس فتنہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ نہ صرف غلبہ اسلام کی مزید تصدیر و توسیع کا عمل رک گیا' بلکہ بعض علاقوں سے مسلمانوں کو پسپائی بھی اختیار کرنا پڑی۔ حضور ﷺ کی بعثت چونکہ تا قیامِ قیامت کُل روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ''اِظہار دین الحق'' (دین حق کا غلبہ) ہے' اس لیے یہ دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک آپ ﷺ کی بعثت کا یہ مقصد بہ تمام و کمال پورا نہ ہو اور دین اسلام کُل عالمِ انسانی پر غالب نہ ہو جائے۔ اس کا صغریٰ و کبریٰ قرآن سے ثابت ہے اور اس کی تفصیلات کتبِ احادیث میں موجود ہیں۔

آیات 108 اور 109: ''(اے نبی ﷺ!) آپ ان کو بتایئے کہ میری طرف تو یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے' تو کیا تم (اس کی) فرمانبرداری اختیار کرتے ہو؟ پھر اگر یہ لوگ منہ موڑ لیں تو کہہ دیجیے کہ میں نے تو تم سب کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے۔''

میں نے تم سب لوگوں تک برابر اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ میں نے تمہارے سرداروں پر بھی اتمامِ حجت کر دیا ہے اور عوام کے سامنے بھی حق واضح انداز میں پیش کر دیا ہے۔ الغرض تمہارے معاشرے کا کوئی چھوٹا' کوئی بڑا' کوئی امیر اور کوئی غریب فرد ایسا نہیں جس تک میری یہ دعوت نہ پہنچی ہو۔ لہٰذا جو کام اللہ نے میرے ذمے لگایا تھا میں نے اپنی طرف سے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

''اور میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دُور۔''

تم لوگوں کو جو وعید سنائی جا رہی ہے' جس عذاب یا قیامت کے وقوع پذیر ہونے سے متعلق تم لوگوں کو خبردار کیا جا رہا ہے' اس کے بارے میں کوئی ''ٹائم ٹیبل'' میں تم لوگوں کو نہیں دے سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا وہ وعدہ کب پورا ہو گا' البتہ یہ بات طے ہے کہ اپنے کرتوتوں کے نتائج و عواقب بہر حال تم لوگوں کو بھگتنے ہوں گے۔

قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں قطعی علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے' البتہ قرآن میں

جابجا قیامت اور آثارِ قیامت کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔ احادیث نبویہ ﷺ کی کتاب الملاحم' کتاب اشراط الساعۃ اور کتاب الفتن کے اندر بھی قربِ قیامت کے زمانہ کے حالات و واقعات بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں سابقہ الہامی کتب کے اندر بھی بہت سی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ اگرچہ ان کتب میں بڑی حد تک ردّ و بدل کر دیا گیا ہے' لیکن ان کی بعض عبارات اپنی اصلی حالت میں آج بھی موجود ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کے حوالے سے بائبل کی آخری کتاب Book of Revelation بھی بہت اہم ہے جو حضرت یوحنا (John) کے مکاشفات پر مشتمل ہے' جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام پیغمبر (یوحنا: John the Baptist) کے ہم نام تھے۔ ماضی قریب کی شخصیات میں Nostradamus' نعمت شاہ ولی' گاندھی جی (ان کی ذاتی ڈائری کی دریافت کے بعد یہ پیشین گوئیاں سامنے آئی ہیں) اور وائن برگر کی پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اس سب کچھ کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت سے پہلے اس دنیا پر بہت مشکل حالات آنے والے ہیں۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں' لیکن اس کے وقوع کے بارے میں قطعی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

آیت 110 اور 111: ''یقیناً وہی جانتا ہے بلند آواز سے کہی گئی بات کو بھی اور اسے بھی جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو۔ اور میں نہیں جانتا' شاید کہ (اس تاخیر میں) تمہارے لیے کوئی آزمائش ہو اور کچھ مدت تک تمہیں فائدہ (اٹھانے کی مہلت) دینا مقصود ہو۔''

شاید اس عذابِ موعود کے واقع ہونے میں تاخیر کی وجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کچھ عرصہ اور رہنے بسنے کی مہلت دے کر تم لوگوں کو مزید آزمانا چاہتا ہو اور اس کے لیے وہ تم لوگوں کو مزید Fresh lease of existence عطا کر دے۔ لیکن بالآخر ہوگا وہی جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عذاب کا آنا ایک شدنی امر ہے اور وہ آکر رہے گا۔

آیت 112: ''رسول ﷺ نے کہا: پروردگار! اب حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے۔''

چونکہ کفّار کے ساتھ کش مکش اور ردّ و کدح کا سلسلہ بہت طوالت اختیار کر گیا تھا' اس لیے خود حضور ﷺ بھی چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب آخری فیصلہ آ جانا چاہیے۔

''اور ہمارا رب رحمن ہے' جس سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں کے خلاف جو تم بنا رہے ہو۔''

اس فرمان کے مخاطب مشرکینِ مکّہ ہیں۔ گویا حضور ﷺ مشرکین کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں کہ اے گروہِ منکرین! تم لوگوں کی مخالفت' ہٹ دھرمی اور سازشوں کے خلاف میں اپنے پروردگار سے مدد کا طلب گار ہوں جو مجھ پر بہت مہربان ہے۔ چنانچہ پچھلے کئی برس سے جو رویہ تم لوگ میرے خلاف' میری دعوت کے خلاف اور میرے پیروکاروں کے خلاف اپنائے بیٹھے ہو وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ یقیناً ہماری مدد فرمائے گا اور تم لوگوں کو تمہارے کرتوتوں کی قرار واقعی سزا دے گا۔

منتخبات از احادیث

قیامت سے قبل عالمی غلبۂ اسلام کی نوید

عَنۡ ثَوۡبَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الۡاَرۡضَ فَرَاَیۡتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِیۡ سَیَبۡلُغُ مُلۡکُهَا مَا زُوِیَ لِیۡ مِنۡهَا)) (صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، باب ہلاک ھذہ الامۃ بعضھم ببعض)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔"

عَنِ الۡمِقۡدَادِ بۡنِ الۡاَسۡوَدِ رضی اللہ عنہ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُولُ: ((لَا یَبۡقٰی عَلٰی ظَهۡرِ الۡاَرۡضِ بَیۡتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدۡخَلَهُ اللّٰهُ کَلِمَةَ الۡاِسۡلَامِ بِعِزِّ عَزِیۡزٍ وَذُلِّ ذَلِیۡلٍ --- اِمَّا یُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَیَجۡعَلُهُمۡ مِنۡ اَهۡلِهَا اَوۡ یُذِلُّهُمۡ فَیَدِیۡنُوۡنَ لَهَا)) --- قُلۡتُ: "فَیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ" (رواہ احمد فی "المسند" بسند صحیح)

حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔

عَنِ النُّعۡمَانِ بۡنِ بَشِیۡرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا عَنۡ حُذَیۡفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم:

((تَکُوۡنُ النُّبُوَّةُ فِیۡکُمۡ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنۡ تَکُوۡنَ، ثُمَّ یَرۡفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنۡ یَرۡفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوۡنُ خِلَافَةٌ عَلٰی مِنۡهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَکُوۡنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنۡ تَکُوۡنَ، ثُمَّ یَرۡفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنۡ یَرۡفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوۡنُ مُلۡکًا عَاضًّا فَیَکُوۡنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنۡ یَکُوۡنَ، ثُمَّ یَرۡفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنۡ یَرۡفَعَهَا ثُمَّ تَکُوۡنُ مُلۡکًا جَبۡرِیَّةً فَتَکُوۡنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنۡ تَکُوۡنَ، ثُمَّ یَرۡفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنۡ

يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ (رواہ احمد)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دورِ نبوت تم میں اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دور ہوگا' پھر وہ دور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی''۔ پھر آپ خاموش ہو گئے۔

((اِنَّ اَوَّلَ دِيْنِكُمْ نُبُوَّةٌ وَرَحْمَةٌ وَتَكُونُ فِيكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ. ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ. ثُمَّ يَكُونُ مُلْكًا عَاضًا فَيَكُونُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ. ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبَرِيَّةً فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ. ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ تَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَيُلْقِي الْاِسْلَامُ بِجِرَانِهِ فِي الْاَرْضِ يَرْضٰى عَنْهَا سَاكِنُ السَّمَاءِ وَسَاكِنُ الْاَرْضِ لَا تَدَعُ السَّمَاءُ مِنْ قَطْرٍ اِلَّا صَبَّتْهُ مِدْرَارًا وَلَا تَدَعُ الْاَرْضُ مِنْ نَبَاتِهَا وَبَرَكَاتِهَا شَيْئًا اِلَّا اَخْرَجَتْهُ))

(بحوالہ ''تجدید واحیائے دین'' از مولانا مودودی مرحوم)

''تمہارے دین کی ابتداء نبوت و رحمت ہے' اور وہ تمہارے مابین رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھا لے گا' پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا' پھر اللہ اس کو بھی اٹھا لے گا۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گی' پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا' پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی' پھر اللہ اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر وہی نبوت کے طرز پر خلافت ہوگی جو لوگوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق رہے گی' اور اسلام زمین پر اپنے پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی اور زمین والے بھی خوش ہوں گے۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش برسائے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔''

علاماتِ قیامت

عَن اَنَسِ بنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) وَضَمَّ السَّبَّابَةَ وَالوُسطٰى.

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ بُعِثْتُ انا والساعة کهاتین. وصحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب قرب الساعة)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں''۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو باہم ملایا۔

عَنِ المُستَورِدِ بنِ شَدَّادٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((بُعِثْتُ فِي نَفَسِ السَّاعَةِ فَسَبَقْتُهَا كَمَا سَبَقَتْ هٰذِهِ هٰذِهِ)) لِاُصبُعَيهِ السَّبَّابَةِ وَالوُسطٰى

(سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کهاتین)

مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں بالکل قیامت کے زمانہ میں بھیجا گیا ہوں، میری قیامت سے اسی قدر سبقت ہے جیسی اس انگلی کی اس پر (یعنی بیچ کی انگلی کی شہادت کی انگلی پر)۔''

عَن عُمَرَ بنِ الخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ: بَينَمَا نَحنُ جُلُوسٌ عِندَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَومٍ، اِذْ طَلَعَ عَلَينَا رَجُلٌ ... قَالَ: فَاَخبِرنِي عَنِ السَّاعَةِ. قَالَ: ((مَا المَسئُولُ عَنهَا بِاَعلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ: فَاَخبِرنِي عَن اَمَارَاتِهَا. قَالَ: ((اَن تَلِدَ الاَمَةُ رَبَّتَهَا، وَاَن تَرَى الحُفَاةَ العُرَاةَ العَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي البُنيَانِ))

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان)

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران ہمارے پاس ایک شخص نمودار ہوا...... وہ کہنے لگا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیں کہ کب ہوگی! آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔'' وہ کہنے لگا: مجھے اس کی علامات بتا دیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور جب تم دیکھو کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن، محتاج، بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَکْثُرَ الْمَالُ وَیَفِیْضَ، حَتّٰی یَخْرُجَ الرَّجُلُ بِزَکَاةِ مَالِهٖ فَلَا یَجِدُ اَحَدًا یَقْبَلُهَا مِنْهُ، وَحَتّٰی تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَاَنْهَارًا))

(صحیح مسلم کتاب الزکاۃ باب الترغیب فی الصدقة قبل ان لا یوجد من یقبلها)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ مال کی اس قدر کثرت اور فراوانی ہو جائے کہ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر نکلے تو کوئی وصول کرنے والا (زکوٰۃ کا حق دار) نہ پائے' اور یہاں تک کہ عرب کی زمین چراگاہوں اور نہروں میں تبدیل ہو جائے۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَحْسِرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ یَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَیْهِ، فَیُقْتَلُ مِنْ کُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ، وَیَقُوْلُ کُلُّ رَجُلٍ مِنْهُمْ لَعَلِّیْ اَکُوْنُ اَنَا الَّذِیْ اَنْجُوْ))

(صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتی یحسر الفرات عن جبل من ذهب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک فرات سے سونے کا پہاڑ نہ نکلے گا۔ لوگ اس کے لیے لڑیں گے تو ہر سینکڑے میں سے ننانوے مارے جائیں گے' اور اُن میں سے ہر شخص (اپنے دل میں) کہے گا: کاش میں بچ جاؤں (اور اس سونے کو حاصل کر لوں!)''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَنْزِلَ فِیْکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا مُقْسِطًا فَیَکْسِرَ الصَّلِیْبَ وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعَ الْجِزْیَةَ وَیَفِیْضَ الْمَالُ حَتّٰی لَا یَقْبَلَهٗ اَحَدٌ))

(صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب کسر الصلیب وقتل الخنزیر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تم میں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ابن مریم انصاف کرنے والے حاکم کے طور پر اتریں' پس وہ صلیب کو توڑ دیں گے' خنزیر کو قتل کر دیں گے' جزیہ موقوف کر دیں گے' اور مال کی فراوانی ہو جائے گی' یہاں تک کہ اس کو کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ

مِن مَغرِبِهَا. فَإذَا رَآهَا النَّاسُ آمَنَ مَن عَلَيهَا. فَذَاكَ حِينَ لَا يَنفَعُ نَفسًا إيمَانُهَا لَم تَكُن آمَنَت مِن قَبلُ))

(صحیح البخاری. کتاب تفسیر القرآن. باب لا ینفع نفسا ایمانها. وصحیح مسلم. کتاب الایمان باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیه الایمان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوگا۔ پس جب لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو اس زمین پر رہنے والے ایمان لے آئیں گے۔ پس یہی وقت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس وقت کسی جان کا ایمان لانا فائدہ مند نہ ہوگا جو پہلے ایمان نہیں لائی ہوگی۔''

عَن أَبِي هُرَيرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخرُجَ نَارٌ مِن أَرضِ الحِجَازِ تُضِيءُ أَعنَاقَ الإِبِلِ بِبُصرٰى))

(صحیح البخاری. کتاب الفتن. باب خروج النار. وصحیح مسلم. کتاب الفتن واشراط الساعة. باب لا تقوم الساعة حتی تخرج نار من ارض الحجاز)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ حجاز سے نکلنے والی آگ بصریٰ (عراق کا ایک شہر) میں اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کردے۔''

عَن أَنَسِ بنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((أَمَّا أَوَّلُ أَشرَاطِ السَّاعَةِ نَارٌ تَحشُرُ النَّاسَ مِنَ المَشرِقِ إِلَى المَغرِبِ))

(صحیح البخاری. کتاب احادیث الانبیاء. باب خلق آدم وذریته)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی آگ ہے جو (مشرق سے اٹھے گی اور) لوگوں کو سمیٹ کر مشرق سے مغرب کو لے آئے گی۔''

عَن أَبِي هُرَيرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((بَادِرُوا بِالأَعمَالِ سِتًّا: طُلُوعَ الشَّمسِ مِن مَغرِبِهَا. أَوِ الدُّخَانَ. أَوِ الدَّجَّالَ. أَوِ الدَّابَّةَ. أَو خَاصَّةَ أَحَدِكُم. أَو أَمرَ العَامَّةِ))

(صحیح مسلم. کتاب الفتن واشراط الساعة. باب فی بقیة من احادیث الدجال)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چھ چیزوں کا ظہور ہونے سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کرو: سورج کا مغرب سے نکلنا، دھواں، دجال، جانور کا نکلنا، موت اور قیامت۔''

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: آتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ وَهُوَ فِي قُبَّةٍ مِنْ أَدَمٍ فَقَالَ: ((اعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ: مَوْتِي، ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، ثُمَّ مُوتَانٌ يَأْخُذُ فِيكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ، ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ الْمَالِ حَتَّى يُعْطَى الرَّجُلُ مِائَةَ دِينَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا، ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقَى بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ إِلَّا دَخَلَتْهُ، ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُونُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ بَنِي الْأَصْفَرِ، فَيَغْدِرُونَ فَيَأْتُونَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِينَ غَايَةً تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اِثْنَا عَشَرَ أَلْفًا))

(صحیح البخاری، کتاب الجزیۃ، باب ما یحذر من الغدر)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ اس وقت چمڑے کے ایک خیمے میں تشریف فرما تھے۔ مجھ سے فرمایا: ''قیامت سے پہلے چھ چیزیں ہوں گی' ان کو گن رکھو: ① میری وفات ② پھر بیت المقدس کی فتح ③ پھر بھیڑ بکریوں کی طرح تم لوگوں میں موت کا پھیلنا ④ پھر مال کا اس حد تک بڑھ جانا کہ کسی شخص کو سو اشرفیاں دی جائیں گی پھر بھی (حقیر سمجھ کر) وہ ناخوش رہے گا ⑤ پھر ایک ایسا فتنہ جو عرب کے ہر گھر میں داخل ہو جائے گا ⑥ پھر اہل روم اور تمہارے درمیان صلح کا ہونا' لیکن وہ تم سے دغا کریں گے اور اسی جھنڈے لے کر تم سے لڑنے آئیں گے' ہر جھنڈے کے نیچے بارہ بارہ ہزار آدمی ہوں گے''

عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ الْغِفَارِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِطَّلَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ، فَقَالَ: ((مَا تَذَاكَرُونَ؟)) قَالُوا: نَذْكُرُ السَّاعَةَ، قَالَ: ((إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ)) فَذَكَرَ الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ، وَالدَّابَّةَ، وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَنُزُولَ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ، وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ، وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ، وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ))

(صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، باب فی الآیات التی تکون قبل الساعۃ۔ وسنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب امارات الساعۃ)

حضرت حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم باہم باتیں کر رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس اچانک آ گئے' اور آپ نے پوچھا: ''کس بات کا تذکرہ ہو رہا ہے؟'' ہم کہنے لگے: قیامت کا۔ آپ نے فرمایا: ''قیامت ہرگز قائم نہ ہو گی جب تک اس سے پہلے تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو''۔ چنانچہ آپ نے دھوئیں' دجال' جانور کے نکلنے' سورج کے مغرب سے طلوع ہونے' عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی دوبارہ آمد' یاجوج وماجوج کے نکلنے اور زمین کے تین جگہ

سے دھنس جانے کا ذکر فرمایا' یعنی مشرق میں' مغرب میں اور جزیرہ نمائے عرب میں' اور ان سب کے بعد یمن سے آگ کے نکلنے کا ذکر فرمایا جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی۔''

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَكُوْنُ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ، وَالشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ، وَتَكُوْنُ الْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ، وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ كَالسَّاعَةِ، وَتَكُوْنُ السَّاعَةُ كَالضَّرَمَةِ بِالنَّارِ))

(سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی تقارب الزمان وقصر الامل)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک زمانہ قریب قریب نہ ہو جائے' یعنی سال مہینے کے مانند' مہینہ جمعہ (ایک ہفتہ) کے مانند' جمعہ (ایک ہفتہ) ایک دن کی طرح اور دن گھنٹے کی طرح ہو جائے گا' جبکہ گھنٹے کی حیثیت محض آگ کی چنگاری کی ہوگی۔''

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى اَحَدٍ يَقُوْلُ: اللّٰهُ اللّٰهُ)) وَفِيْ رِوَايَةٍ: ((حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ: اللّٰهُ اللّٰهُ))

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان آخر الزمان۔ وسنن الترمذی، ابواب الفتن)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی کسی ایک شخص پر بھی جو 'اللہ اللہ' کہتا ہوگا''۔ اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ: ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک زمین میں 'اللہ اللہ' کہا جاتا ہے''۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ)) (صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، باب قرب الساعۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت صرف شریر لوگوں پر آئے گی۔''

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ رِيْحًا مِنَ الْيَمَنِ اَلْيَنَ مِنَ الْحَرِيْرِ فَلَا تَدَعُ اَحَدًا فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ)) وَفِيْ رِوَايَةٍ: ((مِثْقَالَ ذَرَّةٍ)) (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی الریح التی تکون قرب القیامۃ...)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے قریب یمن سے ریشم سے بھی زیادہ نرم ہوا چلائے گا' پس وہ ہر اُس آدمی کو ختم کر دے گی جس کے دل میں دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا''۔ اور ایک دوسری روایت میں ''رتی برابر'' کے الفاظ ہیں۔''

قربِ قیامت کی ہولناک جنگیں

عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: ((يُوشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَحْسِرَ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ. فَاِذَا سَمِعَ بِهِ النَّاسُ سَارُوا اِلَيْهِ. فَيَقُولُ مَنْ عِنْدَهُ: لَئِنْ تَرَكْنَا النَّاسَ يَأْخُذُونَ مِنْهُ لَيُذْهِبَنَّ بِهِ كُلِّهِ. قَالَ: فَيَقْتَتِلُونَ عَلَيْهِ فَيُقْتَلُ مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ))

(صحیح مسلم. کتاب الفتن واشراط الساعة. باب لا تقوم الساعة حتی یحسر الفرات...)

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''قریب ہے کہ فرات میں سونے کا ایک پہاڑ نمودار ہو۔ جب لوگ یہ سنیں گے تو اس کی طرف لپکیں گے۔ پس جو لوگ وہاں موجود ہوں گے وہ کہیں گے کہ اگر ہم لوگوں کو اس میں سے لینے کی اجازت دے دیں تو وہ لازماً سارا پہاڑ لے جائیں گے''۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''پھر لوگ اس پر لڑیں گے تو ہر سو میں سے ننانوے لوگ مارے جائیں گے۔''

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ الْيَهُودَ. فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُونَ حَتّٰى يَخْتَبِئَ الْيَهُودِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ. فَيَقُولُ الْحَجَرُ اَوِ الشَّجَرُ: يَا مُسْلِمُ، يَا عَبْدَ اللهِ هٰذَا يَهُودِيٌّ خَلْفِي. فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ. اِلَّا الْغَرْقَدَ فَاِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُودِ)) (صحیح مسلم. کتاب الفتن واشراط الساعة. باب لا تقوم الساعة حتی یمر الرجل بقبر الرجل فیتمنی...)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے لڑیں گے' پس مسلمان ان کو قتل کریں گے' یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کی آڑ میں چھپے گا تو وہ پتھر یا درخت بولے گا: اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے ایک یہودی ہے' ادھر آؤ اور اس کو قتل کرو' مگر غرقد کا درخت نہ بولے گا' (یہ ایک کانٹے دار درخت ہے جو بیت المقدس کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے) کیونکہ وہ یہود کا درخت ہے''۔

عَنْ ذِي مِخْبَرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: ((سَتُصَالِحُونَ الرُّومَ صُلْحًا اٰمِنًا. فَتَغْزُونَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِكُمْ. فَتُنْصَرُونَ وَتَغْنَمُونَ وَتَسْلَمُونَ. ثُمَّ تَرْجِعُونَ حَتّٰى تَنْزِلُوا بِمَرْجٍ ذِي تُلُولٍ. فَيَرْفَعُ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ النَّصْرَانِيَّةِ الصَّلِيبَ فَيَقُولُ: غَلَبَ الصَّلِيبُ. فَيَغْضَبُ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَدُقُّهُ. فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَغْدِرُ الرُّومُ وَتَجْمَعُ

لِلْمَلْحَمَةِ)) زَادَ فِي رِوَايَةٍ: ((وَيَثُورُ الْمُسْلِمُونَ إِلَى أَسْلِحَتِهِمْ فَيَقْتَتِلُونَ فَيُكْرِمُ اللّٰهُ تِلْكَ الْعِصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ))

(سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب ما یذکر من ملاحم الروم۔ وسنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الملاحم)

حضرت ذی مخبر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''عنقریب تم اہل روم سے امن و آشتی کے ساتھ صلح کرو گے، پھر تم اور وہ مل کر ایک اور دشمن سے لڑو گے۔ اس جنگ میں تمہیں فتح ہو گی، تمہیں مالِ غنیمت نصیب ہو گا اور پھر تم سلامتی سے لوٹ آؤ گے، یہاں تک کہ تم ایک ٹیلے والے میدان میں اُترو گے۔ اس دوران عیسائیوں میں سے ایک آدمی اٹھے گا جو صلیب کو بلند کر کے کہے گا: صلیب جیت گئی! اس پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی کو غصہ آئے گا تو وہ اس صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ اس پر روم والے معاہدہ توڑ دیں گے اور لوگوں کو لڑائی کے لیے جمع کریں گے''۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ''مسلمان پھر جلدی سے اپنے ہتھیاروں کی طرف جائیں گے اور لڑیں گے، تو اللہ تعالیٰ اس جماعت کو شہادت کا اعزاز عطا فرمائے گا۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((يُوشِكُ الْمُسْلِمُونَ أَنْ يُحَاصَرُوا إِلَى الْمَدِينَةِ حَتّٰى يَكُونَ أَبْعَدَ مَسَالِحِهِمْ سَلَاحَ)) ... وعن الزهری سلاح قریب من خیبر ... (سنن ابی داود، کتاب الفتن والملاحم، باب ذکر الفتن ودلائلها)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ میں گھیر لیے جائیں گے یہاں تک کہ ان کی سب سے دُور کی سرحد ''سلاح'' ہو گی۔ زہری سے منقول ہے کہ ''سلاح'' خیبر سے قریب ہے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَقْتَتِلُ عِنْدَ كَنْزِكُمْ ثَلَاثَةٌ كُلُّهُمْ ابْنُ خَلِيفَةٍ، ثُمَّ لَا يَصِيرُ إِلٰى وَاحِدٍ مِنْهُمْ، ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ فَيَقْتُلُونَكُمْ قَتْلًا لَمْ يُقْتَلْهُ قَوْمٌ)). ثُمَّ ذَكَرَ شَيْئًا لَا أَحْفَظُهُ فَقَالَ: ((فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللّٰهِ الْمَهْدِيُّ))

(سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب خروج المهدی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے ایک خزانے کے پاس تین سردار مارے جائیں گے، ان میں سے ہر ایک خلیفہ (حاکم) کا بیٹا ہو گا، اس کے باوجود وہ خزانہ کسی کو نہ ملے گا۔ پھر مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے نمودار ہوں گے، اور وہ تم کو اس انداز سے قتل کریں گے (یعنی عربوں کو جو اُس وقت وہ خزانہ لینا چاہیں گے) جیسا کسی قوم کو قتل نہیں کیا

گیا''۔ پھر آپ ﷺ نے کچھ اور بیان کیا جو مجھ کو یاد نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''(پھر اللہ کا خلیفہ مہدی آئے گا) جب تم اس کو دیکھو تو اس سے بیعت کرو اگرچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل برف پر چل کر' کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِذَا وَقَعَتِ الْمَلَاحِمُ بَعَثَ اللّٰهُ بَعْثًا مِنَ الْمَوَالِی هُمْ اَکْرَمُ الْعَرَبِ فَرَسًا وَاَجْوَدُهُ سِلَاحًا یُؤَیِّدُ اللّٰهُ بِهِمُ الدِّیْنَ))

(سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب الملاحم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب بڑی بڑی لڑائیاں ہوں گی تو اللہ تعالیٰ موالی میں سے (یعنی عرب کے سوا دوسرے مسلمانوں میں سے جن کو عرب نے آزاد کیا ہے' جیسے اہل فارس' ترک وغیرہ) ایک لشکر اٹھائے گا' وہ سارے عرب سے زیادہ اچھی گھڑ سواری کرتے ہوں گے اور ان سے بہتر ہتھیار رکھتے ہوں گے' اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے دین کی مدد کرے گا۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَایَاتٌ سُوْدٌ لَا یَرُدُّهَا شَیْءٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ))

(سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی النھی عن سب الریاح)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خراسان سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے' جنہیں کوئی نہیں روک سکے گا' یہاں تک کہ وہ ایلیاء (بیت المقدس) میں نصب کر دیے جائیں گے۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((یَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ فَیُوَطِّئُوْنَ لِلْمَهْدِیِّ یَعْنِی سُلْطَانَهٗ)) (سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب خروج المهدی)

حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ لوگ مشرق سے نکلیں گے' وہ لوگ گویا مہدی کی سلطنت جما دیں گے۔''

حضرت مہدی کی شخصیت

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا تَذْهَبُ الدُّنْیَا حَتّٰی یَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ یُوَاطِئُ اسْمُهٗ اسْمِیْ)) رواہ الترمذی' وابوداود وفی روایة له: قَالَ: ((لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا اِلَّا یَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ الْیَوْمَ حَتّٰی یَبْعَثَ اللّٰهُ فِیْهِ رَجُلًا مِنِّیْ

---اَوْمِنْ اَھلِ بَیْتِی ---یُوَاطِئُ اسْمُہٗ اسْمِی وَاسْمُ اَبِیہِ اسْمُ اَبِی. یَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا. کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا))

(سنن الترمذی. ابواب الفتن. باب ما جاء فی المھدی. وسنن ابی داود کتاب المھدی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا ختم نہ ہوگی جب تک میرے اہل بیت میں سے ایک شخص عرب کا بادشاہ نہ ہو' اُس کا نام میرے نام جیسا ہوگا''۔ یہ ترمذی اور ابوداوٗد میں ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے: ''اگر دنیا کے خاتمے کا ایک دن باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو طویل کر دے گا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اُس آدمی کو بھیج دے گا جو مجھ سے (یا میرے اہل بیت میں سے) ہوگا' جس کا نام میرے نام جیسا ہوگا اور اُس کے والد کا نام میرے والد ماجد کا نام ہوگا۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا' جیسا کہ اس سے پہلے زمین ظلم و زیادتی سے بھری ہوگی۔''

عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ یَقُولُ: ((اَلْمَھْدِیُّ مِنْ عِتْرَتِی مِنْ وَلَدِ فَاطِمَۃَ)) (سنن ابی داود. کتاب المھدی)

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''مہدی میری نسل سے' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے۔''

عَنْ اَبِی سَعِیدٍ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَلْمَھْدِیُّ مِنِّی. اَجْلَی الْجَبْھَۃِ. اَقْنَی الْاَنْفِ. یَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا. کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا. یَمْلِكُ سَبْعَ سِنِینَ))

(سنن ابی داود. کتاب المھدی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مہدی میری اولاد میں سے ہوں گے' کشادہ پیشانی والے' اونچی ناک والے' جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جیسے وہ ظلم و ستم سے بھری ہوئی تھی' اور وہ سات برس تک بادشاہ رہیں گے۔''

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور فتنۂ دجال

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: ((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَیُوشِکَنَّ اَنْ یَنْزِلَ فِیکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ. حَکَمًا عَدْلًا. فَیَکْسِرَ الصَّلِیبَ. وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیرَ. وَیَضَعَ الْجِزْیَۃَ وَیَفِیضَ الْمَالُ حَتّٰی لَا یَقْبَلَہٗ اَحَدٌ. حَتّٰی تَکُونَ السَّجْدَۃُ الْوَاحِدَۃُ خَیْرًا مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیھَا))

(صحیح البخاری. کتاب احادیث الانبیاء. باب نزول عیسیٰ بن مریم وصحیح مسلم. کتاب

الایمان باب نزول عیسی بن مریم ...)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' وہ زمانہ قریب ہے کہ ابن مریم (عیسیٰ علیہ السلام) تم لوگوں میں حاکم عادل بن کر اُتریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے' خنزیر کو قتل کریں گے' جزیہ موقوف کر دیں گے' اور مال کی فراوانی ہو جائے گی' یہاں تک کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔ اُس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔''

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ))

(صحیح البخاری کتاب احادیث الانبیاء باب نزول عیسی ابن مریم. وصحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسی بن مریم حاکما ...)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم (عیسیٰ علیہ السلام) تم میں اتریں گے' اور تمہارا امام تمہاری قوم میں سے ہوگا!''

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. فَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عليه السلام فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا. فَيَقُوْلُ: لَا. اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ)) (صحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسی بن مریم حاکما ...)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اُمت کا ایک گروہ حق پر قیامت کے دن تک لڑتا رہے گا' وہ غالب رہے گا۔ پھر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اُتریں گے اور اس گروہ کا امام (حضرت عیسیٰ سے) کہے گا: نماز پڑھایئے! وہ فرمائیں گے: نہیں' بے شک تم ایک دوسرے پر حاکم ہو'۔ یہ وہ بزرگی ہے' جو اللہ تعالیٰ اِس اُمت کو عنایت کرے گا۔''

عَنْ مُجَمِّعِ بْنِ جَارِيَةَ الْاَنْصَارِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: ((يَقْتُلُ ابْنُ مَرْيَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ))

(سنن الترمذی ابواب الفتن باب ما جاء فی قتل عیسی ابن مریم الدجال)

حضرت مجمع بن جاریہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن مریم (حضرت عیسیٰ) دجال کو بابِ لُد پر قتل کریں گے۔''

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم الدَّجَّالَ فَقَالَ: ((اِنْ يَخْرُجْ وَاَنَا

فِيكُمْ فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ. وَإِنْ يَخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ. وَاللّٰهُ خَلِيفَتِي عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ. فَمَنْ أَدْرَكَهُ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُورَةِ الْكَهْفِ فَإِنَّهَا جِوَارُكُمْ مِنْ فِتْنَتِهِ)) قُلْنَا: وَمَا لَبْثُهُ فِي الْأَرْضِ؟ قَالَ: ((أَرْبَعُونَ يَوْمًا، يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ أَيَّامِهِ كَأَيَّامِكُمْ)) فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِي كَسَنَةٍ أَتَكْفِينَا فِيهِ صَلَاةُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ؟ قَالَ: ((لَا، اقْدُرُوا لَهُ قَدْرَهُ. ثُمَّ يَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ فَيُدْرِكُهُ عِنْدَ بَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ)) (سنن ابی داود کتاب الملاحم باب خروج الدجال)

''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا تو فرمایا: ''اگر وہ میرے زندہ ہوتے ہوئے نکلا تو میں تمہاری طرف سے اُس سے جھگڑا کروں گا اور اگر وہ اُس وقت نکلا جب میں تمہارے درمیان نہ رہا تو ہر شخص خود ہی اُس سے جھگڑا کرے گا اور میرا خلیفہ اللہ ہے ہر مسلمان کے لیے۔ پس جو کوئی تم میں اُس کو پائے' وہ سورۃ الکہف کی ابتدائی آیات اُس پر پڑھے' کیونکہ یہ آیات اُس کے فتنے سے تمہارے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ ہم نے پوچھا: وہ زمین پر کتنا عرصہ رہے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' چالیس دن۔ اُس کا ایک دن ایک سال کی طرح ہوگا' دوسرا دن ایک مہینے کی طرح' تیسرا دن پورے ہفتے کے برابر اور باقی دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہی ہوں گے''۔ پھر ہم نے پوچھا: اے اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول! وہ جو سال بھر کا ایک ہی دن ہوگا تو اس میں ہمیں ایک ہی دن رات کی نماز کفایت کرے گی؟ آپؐ نے فرمایا:''نہیں! تم اُس روز اُس کی مقدار کا اندازہ کر لینا۔ پھر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دمشق کی مشرقی جانب سے سفید مینار کے پاس اُتریں گے' پس وہ دجال کو بابِ لُدّ کے پاس پائیں گے اور وہاں اس کو قتل کر دیں گے۔''

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ((... كَذٰلِكَ. إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ. فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ. شَرْقِيَّ دِمَشْقَ. بَيْنَ مَهْرُودَتَيْنِ. وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلَى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ. إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ وَإِذَا رَفَعَهُ يَنْحَدِرُ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ وَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفْسِهِ إِلَّا مَاتَ. وَنَفَسُهُ يَنْتَهِي حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ. فَيَنْطَلِقُ حَتّٰى يُدْرِكَهُ عِنْدَ بَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ ...))

(سنن ابن ماجه کتاب الفتن باب فتن الدجال وخروج عیسی بن مریم)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' ... لوگ اس حال میں ہوں گے' اتنے میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو دوبارہ بھیجے گا' تو وہ سفید مینار کے پاس دمشق

کے مشرق میں، دو زرد ہلکے کپڑوں میں اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھ کر اتریں گے۔ جب وہ اپنے سر کو جھکائیں گے تو اس میں سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور جب وہ سر کو اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے اس میں سے موتیوں کی طرح گریں گے، اور جو کافر ان کے سانس کا اثر پائے گا تو وہ مر جائے گا، اور ان کے سانس کا اثر وہاں تک جائے گا جہاں ان کی نگاہ پہنچے گی۔ آخر حضرت عیسیٰ چلیں گے یہاں تک کہ وہ دجال کو بابِ لُد پر پائیں گے تو اُس کو قتل کر دیں گے۔"

عَنْ اَبِي اُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَكَانَ اَكْثَرُ خُطْبَتِهِ حَدِيثًا حَدَّثَنَاهُ عَنِ الدَّجَّالِ، وَحَذَّرَنَاهُ. فَكَانَ مِنْ قَوْلِهِ اَنْ قَالَ: ((اِنَّهُ لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ مُنْذُ ذَرَا اللهُ ذُرِّيَّةَ آدَمَ اَعْظَمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. وَاِنَّ اللهَ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيًّا اِلَّا حَذَّرَ اُمَّتَهُ الدَّجَّالَ. وَاَنَا آخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ. وَهُوَ خَارِجٌ فِيكُمْ لَا مَحَالَةَ ...)) فَقَالَتْ اُمُّ شَرِيكٍ بِنْتُ اَبِي الْعَكَرِ: يَا رَسُولَ اللهِ فَاَيْنَ الْعَرَبُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((هُمْ يَوْمَئِذٍ قَلِيلٌ، وَجُلُّهُمْ بِبَيْتِ الْمَقْدِسِ، وَاِمَامُهُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ. فَبَيْنَمَا اِمَامُهُمْ قَدْ تَقَدَّمَ يُصَلِّي بِهِمُ الصُّبْحَ اِذْ نَزَلَ عَلَيْهِمْ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ الصُّبْحَ. فَرَجَعَ ذٰلِكَ الْاِمَامُ يَنْكُصُ يَمْشِي الْقَهْقَرٰى لِيَتَقَدَّمَ عِيسٰى يُصَلِّي بِالنَّاسِ. فَيَضَعُ عِيسٰى يَدَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ ثُمَّ يَقُولُ لَهُ: تَقَدَّمْ فَصَلِّ فَاِنَّهَا لَكَ اُقِيمَتْ. فَيُصَلِّي بِهِمْ اِمَامُهُمْ. فَاِذَا انْصَرَفَ قَالَ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِفْتَحُوا الْبَابَ فَيُفْتَحُ وَوَرَاءَهُ الدَّجَّالُ مَعَهُ سَبْعُونَ اَلْفَ يَهُودِيٍّ كُلُّهُمْ ذُو سَيْفٍ مُحَلًّى وَسَاجٍ. فَاِذَا نَظَرَ اِلَيْهِ الدَّجَّالُ ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ، وَيَنْطَلِقُ هَارِبًا. وَيَقُولُ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ لِي فِيكَ ضَرْبَةً لَنْ تَسْبِقَنِي بِهَا. فَيُدْرِكُهُ عِنْدَ بَابِ اللُّدِّ الشَّرْقِيِّ فَيَقْتُلُهُ. فَيَهْزِمُ اللهُ الْيَهُودَ. فَلَا يَبْقٰى شَيْءٌ مِمَّا خَلَقَ اللهُ يَتَوَارٰى بِهِ يَهُودِيٌّ اِلَّا اَنْطَقَ اللهُ ذٰلِكَ الشَّيْءَ. لَا حَجَرَ وَلَا شَجَرَ وَلَا حَائِطَ وَلَا دَابَّةَ اِلَّا الْغَرْقَدَةَ فَاِنَّهَا مِنْ شَجَرِهِمْ. لَا تَنْطِقُ اِلَّا قَالَ: يَا عَبْدَ اللهِ الْمُسْلِمَ هٰذَا يَهُودِيٌّ فَتَعَالَ اقْتُلْهُ)) (سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب فتنة الدجال وخروج عيسى بن مريم ...)

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپؐ کا خطبہ زیادہ تر دجال سے متعلق تھا۔ آپؐ نے دجال کا حال ہم سے بیان کیا اور ہم کو اس سے ڈرایا۔ فرمایا: ''زمین میں کوئی فتنہ، جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو پیدا کیا، دجال کے فتنے سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے اپنی اُمت کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ اور میں تمام انبیاء کے آخر میں ہوں اور تم سب اُمتوں سے آخر میں ہو اور دجال

تمھی لوگوں میں ضرور پیدا ہوگا۔ اُم شریک بنت ابی عکر نے عرض کیا: یارسول اللہ! عرب لوگ اُس دن کہاں ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: عرب کے لوگ (مومنین) اُس دن کم ہوں گے۔ ان عرب مومنین میں سے اکثر لوگ (اُس وقت) بیت المقدس میں ہوں گے۔ اُن کا امام ایک نیک شخص ہو گا۔ ایک روز ان کا امام آگے بڑھ کر صبح کی نماز پڑھانا چاہے گا' اتنے میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام صبح کے وقت اتریں گے تو یہ اُن کو دیکھ کر الٹے پاؤں پیچھے ہٹے گا تا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے ہو کر نماز پڑھائیں' لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا ہاتھ اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دیں گے' پھر اس سے کہیں گے: آپ ہی آگے بڑھیں اور نماز پڑھائیں! اس لیے کہ یہ نماز آپ ہی کے لیے قائم ہوئی تھی۔ پس وہ امام لوگوں کو نماز پڑھائے گا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں (مسلمانوں) سے فرمائیں گے: دروازہ (قلعہ یا شہر کا دروازہ جس میں وہ لوگ محصور ہوں گے اور دجال اُن کو گھیرے ہوگا) کھول دو! چنانچہ دروازہ کھول دیا جائے گا۔ وہاں پر دجال ہوگا' ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ' جن میں سے ہر ایک کے پاس زیور سے آراستہ تلوار اور چادر ہوگی۔ جب دجال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو ایسا پگھل جائے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے' اور راہِ فرار اختیار کرے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میری ایک مار تجھ کو کھانا ہے' تو اس سے بچ نہ سکے گا۔ آخر بابِ لدّ کے پاس' جو مشرق کی طرف ہے' اس کو پائیں گے اور اُس کو قتل کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو شکست دے گا۔ یہودی اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کی آڑ میں چھپے گا اس چیز کو اللہ تعالیٰ بولنے کی طاقت دے گا' پتھر ہو یا درخت یا دیوار یا جانور' سوائے ایک درخت کے جس کو غرقد کہتے ہیں۔ وہ یہودیوں کا درخت ہے' وہ نہیں بولے گا۔ باقی ہر شے یہی کہے گی: اے اللہ کے مسلمان بندے! یہ یہودی ہے' تو آ اور اس کو مار ڈال۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ إِلَى الْأَرْضِ، فَيَتَزَوَّجُ ، وَيُوْلَدُ لَهُ، وَيَمْكُثُ خَمْسًا وَأَرْبَعِيْنَ سَنَةً، ثُمَّ يَمُوْتُ، فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِي قَبْرِي، فَأَقُوْمُ أَنَا وَعِيسَى بْنُ مَرْيَمَ فِي قَبْرٍ وَاحِدٍ بَيْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ)).

(رواہ ابن الجوزی فی کتاب الوفاء)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زمین پر اتریں گے' شادی کریں گے' ان کے بچے ہوں گے' پینتالیس سال تک رہیں گے' پھر ان پر موت طاری ہوگی اور انہیں میرے ساتھ میری قبر میں دفن کیا جائے گا۔ پس میں اور عیسیٰ بن مریم دونوں ایک ہی قبر سے ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے درمیان اٹھائے جائیں گے۔''

نہی عن المنکر کی اہمیت

عَنْ اَبِي سَعِيدٍ الْخُدرِيِّ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((مَن رَاى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ. فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ. فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ. وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْإِيمَانِ))

(صحیح مسلم. کتاب الایمان. باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان...)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی، کوئی برا کام دیکھے' پس اسے چاہیے کہ وہ اپنے زورِ بازو سے اسے روک دے۔ پھر اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کو روکے۔ پھر اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل میں اسے برا سمجھے۔ یہ آخری درجہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اَوحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبرَائِيلَ عَلَيهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِينَةَ كَذَا وَ كَذَا بِاَهْلِهَا. فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيهِم عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرفَةَ عَيْنٍ. قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيهِ وَعَلَيهِمْ. فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ)). (رواہ البیہقی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو اُس کے رہنے والوں کے ساتھ الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرائیل بولے: اے میرے ربّ! اس شہر میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے کبھی آنکھ جھپکنے کی دیر بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس بستی کو اُس پر اور دوسرے رہنے والوں پر الٹ دو! کیونکہ اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے بھی میری غیرت کی وجہ سے نہیں تبدیل ہوا''

دیگر متفرق احادیث

عَنْ مُعَاوِيَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ --- وَهُوَ يَخْطُبُ --- سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: ((لَا يَزَالُ مِنْ اُمَّتِي اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُم حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللهِ وَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ)) (صحیح البخاری. کتاب المناقب. باب سوال المشرکین ان یریھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم اٰیۃ..

وصحیح مسلم. کتاب الامارۃ باب قولہ لا تزال طائفۃ من اُمتی...)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی' جو شخص اُسے ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا یا اُس کی مخالفت کرے گا وہ اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔''

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((اِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ

مِائَةِ سَنَةٍ مَن يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا)) (سنن ابی داود، کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائۃ)
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر اِس اُمت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اِس (اُمت) کے لیے دین کو تازہ کرتے رہیں گے۔''

عَن ثَوبَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((يُوشِكُ الأُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ، قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ)) قِيلَ: وَمَا الْوَهْنُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) (سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام)
''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قریب ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دستر خوان کی طرف بلاتے ہیں۔'' اس پر کسی نے کہا: ''کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہو گے' لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی' جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!''

عَن اَبِي هُرَيرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الْمَوْتَ))
(سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی ذکر الموت۔ وسنن النسائی، کتاب الجنائز، باب کثرۃ ذکر الموت۔ وسنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ)
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لذات کو ختم کرنے والی یعنی موت کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا کرو۔''

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَاُ كَمَا يَصْدَاُ الْحَدِيدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی لگنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے''۔ پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! دلوں کا زنگ کس چیز سے دور ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا۔''

((وَاللّٰهِ لَتَمُوتُنَّ كَمَا تَنَامُونَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُونَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالسُّوءِ سُوءً، وَإِنَّهَا لَجَنَّةٌ أَبَدًا أَوْ لَنَارٌ أَبَدًا))

(نهج البلاغة)

''اللہ کی قسم! تم سب پر لازماً موت آئے گی جیسے تم سوتے ہو، پھر تمہیں لازماً دوبارہ اٹھایا جائے گا جیسے تم بیدار ہوتے ہو، پھر تمہارا حساب کتاب ہو گا جو تم عمل کرتے رہے ہو۔ پھر تمہیں لازماً احسان کا بدلہ احسان سے دیا جائے گا، اور برائی کا بدلہ سزا سے دیا جائے گا، اور یہ (بدلہ) یا ہمیشہ کے لیے جنت ہو گی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ ہو گی۔''

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِي مَا أَتٰى عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتٰى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ، وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً)) قَالُوا: وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي))

(سنن الترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الامة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت پر بھی وہ تمام حالات آ کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے، بالکل اسی طرح جیسے (ایک جوڑے کا) ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن میں سے کوئی (بدبخت) اعلانیہ طور پر اپنی ماں کے پاس (بدکاری کی غرض سے) آیا تو میری اُمت میں سے بھی ایسا ہو گا جو یہ کرے گا۔ اور بے شک بنی اسرائیل کے بہتر (۷۲) فرقے ہوئے، جبکہ میری اُمت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے۔ وہ سب کے سب دوزخ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقہ کے''۔ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کون سا فرقہ ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ اُس راستے پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔''

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریمو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریمو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخِ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریمو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریمو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

- دجال کا خروج کب ہوگا؟
- امام مہدی علیہ السلام کا ظہور کب ہوگا؟
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کب ہوگا؟
- ظلم اور جبر کی رات کب کٹے گی؟ فلسطین کب اور کیسے آزاد ہوگا؟
- بیت المقدس کو کب اور کون فتح کرے گا؟ کہاں سے فوجیں جائیں گی؟
- بنی اسرائیل کون ہیں؟ ان کی قوت کے اسباب کیا ہیں؟ یہودی دنیا کو کیسے کنٹرول کر رہے ہیں؟
- ہیکل سلیمانی کیا ہے؟ صیہونی اسے تعمیر کرنے کے لئے اتنے بے تاب کیوں ہیں؟
- گریٹر اسرائیل کا خواب دیکھنے والے کس انجام سے دوچار ہوں گے؟
- دنیا کا نظام اس وقت کیسے چل رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا؟
- طاغوت کی اندھیری رات پر حق کا نور کب اور کیسے غالب آئے گا؟
- ہمارا ماضی کیا ہے، حال کیا ہے اور مستقبل کیا ہوگا؟
- پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا؟
- کیا پاکستان ملتِ اسلامیہ کی قیادت سنبھال سکے گا؟ اگر ہم ناکام رہے تو ہمارا انجام کیا ہوسکتا ہے؟

یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار رحمۃ اللہ علیہ کے علم افروز اور فکر انگیز الفاظ میں
ایک ایسی کتاب جو آپ کے سوچنے اور عمل کرنے کے انداز کو بدل دے گی۔

RS. 995/-

an artwork by ARTWORKS INTL.
Kh.Afzal Kamal - 0320 - 4031556